وڈیرا سائیں

دلّی سے یہاں تک کا سفر مالک رام کے لئے تھکا دینے والا تھا۔

اگر وہ براہِ راست ٹرین کے ذریعے آتا تو شاید وہ بوریت محسوس نہ کرتا، لیکن جیپ کے ذریعے مسلسل تین سو میل کے سفر اور اس درمیان جاگتے رہنے کی پریکٹس نے اسے کم از کم یہ بات ضرور سمجھا دی تھی کہ بعض باتیں جو دورانِ تربیت بظاہر آسان دکھائی دیں عملی زندگی میں وہ مصائب کے پہاڑ کھڑے کر دیا کرتی ہیں۔

جب وہ اکیڈمی میں تھا تو تین تین دن اور رات مسلسل انہیں جگایا اور بھگایا جاتا تھا۔ پہلے پہل تو کچھ دقت محسوس ہوئی تھی۔

لیکن.....!

اب وہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔

اُس کا تعلق بھارتی فوج کے خصوصی کمانڈو یونٹ ''انڈو تبتن'' سے تھا جنہیں عرفِ عام میں بلیک کیٹس کہا جاتا تھا۔

تین ماہ کا ایک خصوصی کورس اُس نے کے جی بی کے ''سپیٹناز'' کے ساتھ کیا تھا اس درمیان انہیں خالی ہاتھوں مسلح دشمن سے نمٹنے، گھیرے میں آ کر بچ نکلنے اور نہتے ہونے کے باوجود دشمن کو بڑی آسانی سے جان سے مار دینے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔

مالک رام کے اندر جو تھوڑی بہت انسانیت رہ گئی تھی وہ اس خصوصی کورس نے ختم کر دی تھی۔

اسی درمیان انہوں نے سائبیریا کے برفیلے جنگلوں میں کئی کئی روز بھوکے پیاسے رہ کر خالی ہاتھوں جانور مار کر اُن کا خون پی کر گزارہ کیا تھا۔

وہ کوئی ایسا دھارمک قسم کا ہندو نہیں تھا۔ اُس کی جس خوبی نے اُسے ''بلیک کیٹ کا کمانڈو'' بنایا تھا وہ اُس کا سندھی والدین کے ہاں جنم تھا۔

مالک رام کے والدین تقسیم ہند سے پہلے پاکستانی سندھ میں رہتے تھے اور تقسیم کے چار پانچ سال بعد دل پر پتھر رکھ کر بھارت آئے تھے۔ مالک رام کا جنم بھارت میں ہوا تھا۔

لیکن.....

اُس کے والدین نے ابھی تک اپنا روحانی اور جسمانی رابطہ پاکستانی سندھ سے نہیں توڑا تھا۔ وہ اب بھی اُسے شکارپور کے نزدیک اپنے آبائی گاؤں گھارو کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

مالک رام کی ماں کے کچھ رشتہ دار ابھی تک پاکستانی سندھ میں آباد تھے اور اُسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے والدین کے ساتھ ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔

کاروباری سلسلے ہی میں پھر وہ لوگ دہلی میں آباد ہو گئے۔

لیکن.....

اپنے والدین کے مزاج کے بالکل برعکس مالک رام کو فوجی زندگی سے لگاؤ پیدا ہو گیا جس کی وجہ وہ انگریزی فلمیں تھیں جو وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔

والدین کی خواہش کے برعکس وہ فوجی اور پھر کمانڈو بن گیا۔ اُس کی خصوصی صلاحیتوں کے پیش نظر جلد ہی اُس کا تبادلہ آرمی کے سپیشل گروپ میں ہو گیا اور پھر وہ سندھ راجستھان سرحد پر ملٹری انٹیلی جنس ایڈوانس یونٹ سے ایسا منسلک ہوا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

مالک رام، ہندو سے زیادہ مسلمان تھا۔

دہلی میں اُس کے ہمسائے اور سکول کے اکثر ساتھی مسلمان تھے اور اُس کے والدین کا تعلق بھی ہندوؤں کے اُس مخصوص طبقے سے تھا جو مسلمان صوفیا سے زیادہ متاثر ہے۔ اس لئے اُسے اسلامی رسومات کا سب علم تھا۔ اُس کے والدین ہر سال باقاعدگی سے اجمیر شریف عرس پر جایا کرتے تھے اور مالک رام نے تو بھارت میں اکثر مسلمان صوفیاء کے مزاروں کے ''درشن'' کئے اور وہاں ''متھا ٹیکا'' تھا۔

انٹیلی جنس میں اس کی دلچسپی فطری تھی۔

شاید وہ پیدائشی (SPY) جاسوس تھا۔

اس کے اکثر ساتھی انٹیلی جنس ڈیوٹی سے جان چھڑانے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن وہ اس کے برعکس بڑی خوشی اور دلجمعی سے فرائض ادا کیا کرتا تھا۔ اُس وقت جب بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اُسے خصوصی بلاوا آیا تو مالک رام نے یہی سمجھا تھا کہ شاید اُسے پھر کسی خصوصی کورس میں شرکت کے لئے بلایا گیا ہے۔

لیکن.....

اس مرتبہ اُسے کسی خاص مقصد سے بلایا گیا تھا۔

جب وہ بریگیڈیئر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اکیلے بیٹھے تھے جو مالک رام کے لئے واقعی حیرانگی کی بات تھی کیونکہ عام حالات میں بریگیڈیئر سودا اکیلے نہیں ہوتے تھے۔ ایس ایس جی کا بریگیڈیئر ہونے کے سبب اکثر وہ کسی مشن کی بریفنگ کے سلسلے میں اُن سے ملا کرتا تھا۔

''ہاؤ ڈو یو ڈو کیپٹن'' بریگیڈیئر سودا نے کھڑے ہو کر بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

کیپٹن مالک رام ایک لمحے کے لئے گڑبڑا کر رہ گیا اُس نے دونوں ایڑیاں بجا کر سیلوٹ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بریگیڈیئر کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

بریگیڈیئر سُود نے پہلی مرتبہ اُس کے لئے چائے اور سنیکس منگوائے تھے۔

اُس کے سامنے میز پر فائل رکھی تھی جس پر موجود معلومات پڑھ پڑھ کر وہ مالک رام کے سامنے دہراتا اور پھر اُس کی تصدیق کرتا رہا۔ مالک رام کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ فوج میں بھرتی ہونے خصوصاً کمیشن ملنے کے بعد ہر آفیسر کے خاندان، ماضی اور حال سے متعلق مکمل تفصیلات آرمی میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

''کیپٹن تم ایک اہم مشن کرنے جا رہے ہو۔''

بالآخر بریگیڈیئر نے اُس کے تجسس کو ختم کر دیا۔

''یس سر!'' مالک رام کے لئے مشن کوئی نیا یا چونکا دینے والا لفظ نہیں تھا۔ ''تمہیں اپنے والدین کے آبائی وطن جانا ہے۔'' بریگیڈیئر سُود نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

مالک رام کی آنکھوں میں دُور دُور تک کسی شک وشبہ یا خوف کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

''رائٹ سر!''

تھوڑی دیر بعد بریگیڈیئر سُود دیوار سے لٹکے نقشے پر پاکستانی سندھ میں واقع مختلف جگہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مالک رام کو اُس کے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

ہر بات کہنے کے بعد وہ مالک رام کے چہرے کے تاثرات سے اپنی بات کا ردعمل تلاش کرتا۔ اُس کی طرف سے ''ہاں!'' کہنے کے بعد اگلی بات کہتا تھا۔

''کوئی سوال؟'' بریگیڈیئر سُود نے آخر میں پوچھا۔

''نو سر! میں بالکل کلیئر ہوں۔'' مالک رام نے ایڑیاں جما کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ ''ٹاپ سیکرٹ'' ہے کیپٹن، صرف میرے اور تمہارے درمیان۔'' بریگیڈیئر سُود نے انتہائی مختصر الفاظ میں اُس مشن کی اہمیت کا احساس دلایا۔

''رائٹ سر!''

''اگلے ہفتے میں کسی بھی دن تمہیں سگنل مل جائے گا..... اپنی جگہ سے ''لانچنگ پیڈ'' تک سب کچھ ''غیر قانونی'' ہوگا۔'' بریگیڈیئر سُود نے آخری ہدایت دی۔

''رائٹ سر!''

''آل دی بیسٹ'' All The Best'' بریگیڈیئر نے دوبارہ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اُسے رخصت کیا۔

''روانگی سے پہلے ہم ایک مرتبہ پھر ملیں گے۔'' کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اُسے بریگیڈیئر سُود کی آواز سنائی دی۔

کیپٹن مالک رام نے ایڑیاں بجائیں۔ اپنی ٹوپی تک ہاتھ لے جا کر سلیوٹ مارا اور باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنی جیپ میں وہ اپنے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔

●

پانچویں روز اُسے بریگیڈیئر سُود نے اچانک ایک ''سرپرائز وزٹ'' دیا تھا۔

سرحد پر واقع اس کمانڈ پوسٹ کے عقب میں اُس روز اچانک ہی ہیلی کاپٹر لینڈ کیا تھا۔ جس سے بریگیڈیئر سُود برآمد ہوا۔ کیپٹن مالک رام اور اُس کے جوان بھاگتے ہوئے بریگیڈیئر سُود کو ''ریسیو'' کرنے پہنچے تھے۔

''ہیلو کیپٹن!'' بریگیڈیئر نے اپنی چھڑی اپنی دائیں ٹانگ پر مارتے ہوئے مسکرا کر اُسے مخاطب کیا۔

''کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ ہم تھوڑی دیر بعد واپس جا رہے ہیں۔''

قریباً پندرہ بیس منٹ یہاں گزارنے اور جوانوں سے باتیں کرنے کے بعد بریگیڈیئر سُود کیپٹن مالک رام کو اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر میں واپس جا رہا تھا۔ اُس مرتبہ اُن کی منزل دہلی تھی۔

بھارتی جی ایچ کیو کی خصوصی ''آپریشنل برانچ'' میں وہ لوگ دو گھنٹے بعد موجود تھے۔

اس کمرے میں ''بلیک کیٹس'' کے چار اور جوان پہلے سے موجود تھے جنہیں اسی طرح مختلف مقامات سے یہاں جمع کیا گیا تھا۔

بریگیڈیئر سُود اب اُن سب کو اکٹھے بریفنگ دے رہا تھا۔

''مالک رام تمہاری کمانڈ کرے گا..... سب نے الگ الگ اپنی حیثیت میں سرحد عبور کرنی ہے۔ بھارتی سرحد کے اندر ہر ممکن مدد تم سب اپنے خصوصی اختیارات کے تحت حاصل کر سکتے ہو..... سرحد عبور کرنے کے لئے بہترین علاقہ یہ ہے۔''

اتنا کہہ کر بریگیڈیئر سُود نے اپنے دائیں ہاتھ لٹکے ہوئے نقشے پر چھڑی ایک جگہ رکھی تو وہ الفاظ الیکٹرک عمل سے جلنے لگے۔ اب اُس کی چھڑی یہاں سے چلتی ہوئی ایک اور جگہ پہنچ کر رُک گئی تھی۔

''تمہیں اگلے 92 گھنٹے تک یہاں اکٹھے ہونا ہے۔'' اُس نے ایک اور جگہ نقشے پر چھڑی جمائی۔

''یہاں ہمارے دوست'' استقبال کے لئے موجود ہوں گے۔ سرحد عبور کرنے کے بعد تمہاری مکمل کمانڈ اور ذمہ داری کیپٹن مالک رام پر ہے۔ اگلی منصوبہ بندی، کام کی تفصیلات سب باتیں سرحد عبور کرنے کے بعد کیپٹن مالک رام تمہیں بریف کریں گے۔ کوئی سوال؟''

اُس نے رُک کر سگریٹ سلگایا۔

پانچوں کمانڈوز پر سناٹا طاری تھا۔

''او۔کے، آل دی بیسٹ۔اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں صبح چھ بجے سے تمہارا ٹارگٹ ٹائم شروع ہو جائے گا۔''

اتنا کہہ کر بریگیڈیئر ایک بغلی دروازے سے باہر چلا گیا۔

اُس کی روانگی کے بعد کیپٹن مالک رام نے اپنے جوانوں کے سامنے ہدایات کو دہرایا۔پانچوں ایک دوسرے سے بخوبی آگاہ تھے۔

بریگیڈیئر سُود نے انتہائی خفیہ پلاننگ کی تھی۔منصوبے کی تفصیلات کا علم صرف کمانڈر کو تھا۔جس کے متعلق بھارتی فوج کو علم تھا کہ کیپٹن مالک رام کے جسم کی بوٹی بوٹی بھی الگ کر دی جائے تو بھی وہ کچھ نہیں بتائے گا۔

الگ الگ سرحد عبور کرنے پر یہ حکمت عملی کارفرما تھی کہ ایک شخص کی گرفتاری سے سب کی گرفتاری کا خطرہ ختم ہو گیا تھا۔

آپریشن کو خفیہ رکھنے کے پیش نظر سوائے مالک رام کے ٹیم کے اور کسی ممبر کو کوئی ''سیف ہاؤس'' نہیں بتایا گیا تھا۔تمام رابطوں اور آپریشن کی تفصیلات کا علم بھی صرف مالک رام کو تھا۔باقیوں نے صرف حکم کی اطاعت کرنی تھی اور جو اُن کی خصوصی تربیت تھی۔

اس سے پہلے بھی یہ لوگ مختلف نوعیت کے خفیہ آپریشن کر چکے تھے اور ان میں سے اکثر اس سے پہلے پاکستان میں بھی جا چکے تھے۔

اُن کے کمانڈر کے لئے البتہ یہ پہلا موقع تھا۔

●

بٹھل کوٹ نام تھا اس سرحدی قصبے کا جہاں سے وہ دہلی سے مسلسل سفر کر کے پہنچا تھا۔!!

یہاں موجود آرمی کے ریسٹ ہاؤس پر اس کے استقبال کے لئے بی ایس ایف کا کمپنی کمانڈر موجود تھا۔

''تم لوگ جاؤ۔'' اُس نے اپنے ساتھیوں کو جو دہلی سے یہاں تک آئے تھے بڑی بے رُخی سے کہا۔

دونوں جوانوں نے فی الوقت ڈرائیور سمیت یہاں سے ہٹ جانا ہی غنیمت جانا تھا۔وہ جانتے تھے کہ جس شخص کے ساتھ انہوں نے دہلی سے یہاں تک ڈیوٹی کی ہے وہ اچھا فوجی تو ہو سکتا ہے۔انسانیت کے نام کی کسی چڑیا سے ہرگز واقف نہیں۔

تینوں نے بمشکل تن کر سلیوٹ کیا اور کان لپیٹ کر باہر آ گئے۔

''سر! آپ کے لئے کھانا تیار ہے۔'' بی ایس ایف کے کمپنی کمانڈر نے کہا۔

''او کے''..... مالک رام کے لہجے کی تلخی برقرار تھی..... ''مجھے اس علاقے کا تفصیلی نقشہ دے دو اور تم جاؤ۔میرے لئے کھانا کچھ دیر بعد بھیجنا۔'' کمپنی کمانڈر نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا اور چپ چاپ میز پر موجود نقشہ اُس کو تھما کر باہر آ گیا۔

کمپنی کمانڈر کی دوبارہ آمد آدھ گھنٹہ بعد ہوئی تھی۔ اس درمیان مالک رام نے سرحد کے راستے حفظ کر لئے تھے۔

''کھانا تیار ہے سر!''

''اوکے۔'' مالک رام نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کھانے کے دوران وہ کمپنی کمانڈر کو گریڈ گریڈ کر یہاں کی سرحدوں کے دونوں اطراف کے حالات دریافت کرتا رہا۔

کھانے کے خاتمے پر وہ اُس کے ساتھ ہی دوسرے کمرے میں اس بڑی میز تک آیا جس کے گرد بیٹھ کر بارڈر سیکورٹی فورس کے مقامی کمانڈر میٹنگ کیا کرتے تھے۔

کمپنی کمانڈر کا فراہم کردہ نقشہ اس نے میز پر بچھا کر اپنے ہاتھ کی انگلی اس جگہ رکھی جہاں وہ لوگ اس وقت موجود تھے۔

''تمہارے خیال میں کون سا راستہ محفوظ ترین ہے۔'' مالک رام نے سوال کیا۔

''سر! ہم نے آپ کے لئے اس راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میرے جوانوں نے اس طرف ''ریکی'' کر کے دیکھا ہے۔ یہ راستہ بہت محفوظ ہے۔'' کمپنی کمانڈر نے نقشے میں ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں.....'' مالک رام نے صرف ایک لفظ پر اکتفا کیا۔

''میرے جوان اس راستے پر ایکٹو ہیں۔'' کمپنی کمانڈر نے دوبارہ کہا۔

''ہوں.....'' دوبارہ وہی جواب ملا۔

شام ڈھلنے تک مالک رام آرام کرتا رہا۔

مقررہ وقت پر جب کمپنی کمانڈر اپنے دو جوانوں اور جیپ کے ساتھ وہاں پہنچا تو اُسے روانگی کے لئے تیار پایا۔

''انہیں یہیں چھوڑ دو۔ میں جیپ خود ڈرائیو کروں گا۔''

کمپنی کمانڈر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''لیکن سر.....!'' اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ حکم ہے۔'' کہتے ہوئے مالک رام نے ڈرائیور سیٹ سنبھال لی۔

''رائٹ سر!''

کمپنی کمانڈر حیران تھا کہ وہ پوسٹ کی طرف جانے کے بجائے کسی اور راستے پر مڑ گیا تھا۔

''سر! یہ راستہ تو.....''

''شٹ اَپ.....'' اُس نے کمپنی کمانڈر کو اس طرح ڈانٹا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔

اُس نے اپنی زندگی میں ایسا اکھڑ اور بدتمیز آفیسر نہیں دیکھا تھا۔ بی ایس ایف کا کمپنی کمانڈر ہونے کے ناطے وہ اس علاقے کا بلاشرکت غیرے بادشاہ تھا لیکن وہ اسے اپنے ہیڈ کوارٹر سے اس سلسلے میں خصوصی احکامات ملے تھے اُس نے کیپٹن صاحب کے حکم کی بلاچون وچراں تعمیل کرنی ہے۔

جس لہجے میں اُسے یہ حکم دیا گیا تھا اس سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ کوئی بہت ہی اہم شخصیت ہے۔

سرحد سے چند فرلانگ دُور ہی اُس نے جیپ کھڑی کر دی.....!!

''یہاں سے پوسٹ کا فاصلہ کتنی دیر کا ہے؟'' اُس نے اچانک ہی کمپنی کمانڈر سے پوچھا۔

''سر!'' قریباً آدھ گھنٹہ کا۔''

''اور پیدل.....'' اگلا سوال ہوا۔

''سر! ایک گھنٹے کا۔'' کمپنی کمانڈر نے کہا۔

''آل رائٹ.....'' اُس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

کمپنی کمانڈر بے بس اور حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے کیپٹن مالک رام نے اگلے ٹائر کی ہوا نکال دی تھی۔

''دس منٹ بعد ٹائر تبدیل کر کے پوسٹ پر چلے جانا۔ اپنے ساتھیوں کو ''الرٹ'' رکھنا۔ انہیں یہی بتانا کہ میں نے سرحد اسی جگہ سے عبور کرنی ہے۔ جو جگہ تم لوگوں نے پلان کر رکھی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر پیدل سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمپنی کمانڈر کا جی چاہتا تھا اپنا سارا پستول اُس پر خالی کر دے۔

لیکن.....

وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

احکامات بہت سخت تھے۔ اُس کے ہاتھ اور زبان بندھی تھی۔ البتہ اُس کے دل سے بددُعا ضرور نکلی کہ کم از کم سرحد کے دوسری طرف ہی کوئی اس کو گولی مار دے۔

کمپنی کمانڈر کے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا کہ وہ جیپ کا ٹائر خود بدلے اور اپنی پوسٹ تک پہنچے کیونکہ اس جیپ میں ریڈیو یا وائرلیس سسٹم بھی نصب نہیں تھا۔ اس عمل میں اُسے کم از کم آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔ اب اُسے اس بات کی سمجھ آنے لگی تھی کہ کیپٹن نے کیوں یہ سب کچھ کیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بحفاظت سرحد عبور کر جانے تک کسی کوکانوں کان بھی خبر ہو اور پوسٹ پر موجود بی ایس ایف کے لوگ یہی سمجھتے رہیں کہ اُس نے یہاں سے ہی سرحد عبور

کرنی ہے۔

اپنی قسمت کو کوستا کمپنی کمانڈر بادلِ نخواستہ جیپ کا ٹائر تبدیل کرنے لگا۔

●

سجوار شاہ نے اچانک ہی اپنی جیپ اس جگہ روک دی تھی۔

وہ یہاں تک قریباً چالیس میل کا سفر طے کر چکا تھا اور آج خلافِ معمول اکیلا ہی اس طرف آیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی عادت سے واقف تھے کہ کبھی کبھی سجوار اکیلا ہی نکل جایا کرتا ہے۔

حفاظتی نقطہ نظر سے یہ بات بڑی خطرناک تھی۔

لیکن.....

خطرات سے کھیلنا جیسے اُس کا مشغلہ تھا۔

ڈیرہ جتوئی سے مراد کوٹ کی طرف جاتے ہوئے اُس نے اچانک ہی جیپ کو کچے راستے پر اُتار دیا تھا۔ بظاہر یہ کچا راستہ تھا لیکن کئی سالوں سے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے اُس نے گزرگاہ کی حیثیت ضرور حاصل کر لی تھی۔

گھنی اور خاصی بلند جھاڑیوں کے بیچوں بیچ اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کیے وہ چلتا جا رہا تھا۔

جس علاقے میں وہ سفر کر رہا تھا اس علاقے میں تو عام حالات میں پولیس کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً اُس راستے پر تو دن کے وقت بھی چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔

سجوار شاہ کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ معمول کے مطابق جیپ چلا رہا تھا۔

قریباً چار پانچ میل وہ اسی طرح چلتا چلا گیا جب ایک جگہ اچانک اُس کے سامنے سرخ رنگ کی ٹارچ روشن ہوئی۔

سجوار شاہ نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آف کر کے انجن بند کر دیا۔

جھاڑیوں سے پانچ مسلح نقاب پوش نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ جیپ کے اندر کی روشنی سجوار شاہ نے جلائی تھی۔ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی احترام سے اُن کی نظریں جھک گئیں۔

''مرشد سائیں.....'' اُن میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔

''کیسے ہو بہاول'' سجوار شاہ نیچے اُتر آیا۔

''ٹھیک ہوں سائیں۔ آپ کی نظر کرم ہے تو سب اچھا ہے سائیں۔''

''میرے ساتھ آؤ.....'' ہجوار شاہ نے کہا اور ایک نقاب پوش کے تعاقب میں چل دیا۔

دونوں تھوڑی دیر بعد بہاول کے اڈے پر موجود تھے۔ بہاول کے اشارے پر اُس کے ساتھی وہاں سے چلے گئے۔

''حکم مرشد سائیں۔'' بہاول نے جو اس کے سامنے زمین پر بیٹھا تھا قریباً ہاتھ باندھتے ہوئے پوچھا۔

''بابا ایک کام کرنا ہے۔ لازم ہو گیا ہے..... جب تک ہم سرکار پر دباؤ نہیں بڑھائیں گے وہ لوگ ہماری بات نہیں مانیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ حکومت کو سودے بازی کے لئے مجبور کر سکوں۔ بابا بہاول! تم تو جانتے ہو کہ اِدھر فوج نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور میں نے سُنا ہے کہ وہ لوگ اس علاقے میں بھی کوئی بڑا آپریشن کرنے جا رہے ہیں۔ وڈیرہ دودو کے ڈیرے پر پرسوں کچھ آفیسر لوگ آئے تھے بات کرنے..... کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں یہ لوگ.....'' اُس نے بہاول کی آنکھوں میں جھانکا جس نے اپنے ''مرشد سائیں'' سے نگاہیں ملتے ہی نظریں جھکا دی تھیں۔

''آپ حکم کرو مرشد سائیں۔ میں جانتا ہوں، میرے مُخبر اس علاقے میں چاروں طرف پھیلے ہیں۔ سائیں! آپ کو تو ہر بات کا علم ہے۔ یہ لوگ بہت سے غلط الزامات بھی میرے کھاتے میں ڈال رہے ہیں..... ہر روز میرے سر کی قیمت بڑھ رہی ہے..... سائیں! تم کیسے بھی کرو مجھے اس جنجال سے نکال لو..... اب میرے بچیاں بیاہنے کی عمر کو آ گئی ہیں مجھے اب کسی کی ماں بہن کو بے آبرو کرتے بہت خوف آتا ہے سائیں۔'' یہ بات کہتے ہوئے بہاول کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

''بابا فکر نہیں کرو۔ وڈیرہ جتوئی معاملات کو بہت بگاڑ رہا ہے تم تو جانتے ہو کہ بہاول کہ وڈیرے جتوئی کے حکم سے ہی اس علاقے کی پولیس کوئی رپورٹ کسی ڈاکو کے خلاف اوپر بھیجتی ہے۔''

ہجوار شاہ نے اپنی دائیں مونچھ مروڑتے ہوئے بہاول کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سائیں! وڈیرے جتوئی کی طرف سے مجھے دو مرتبہ گرفتاری دینے کا مشورہ مل چکا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ سرکار سے سودے بازی کر کے میری سزا میں کمی کروا لے گا..... لیکن میں نے کورا جواب دے دیا ہے۔''

''بہت اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔ اس چکر میں نہ پڑنا تمہیں اپنے پچیرے کا حال تو معلوم ہے نا۔ اُس نے بھی وڈیرہ کے کہنے پر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پھانسی کا انتظار کر رہا ہے۔ نہ بابا ان کے چکر میں نہیں آنا..... ہجوار شاہ نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''جو حکم مرشد۔ بس میرے گھر والی اور بچیوں کا خیال رکھنا۔'' بہاول نے ہاتھ باندھے۔

''تم ان کی فکر نہیں کرو۔ وہ ہماری حویلی میں بڑے آرام سے رہتی ہیں..... اور ہاں۔ بابا بہاول! کل ہمارے کچھ اور دوست بھی یہاں آ رہے ہیں۔ اُن لوگوں کے

ساتھ مل کر ایک پروگرام پر عمل کرنا ہے..... بابا! اس علاقے کا ڈی سی بڑا اکھڑ سا بندہ ہے۔ ذرا اُس کا دماغ ٹھیک کرنا ہوگا۔"

"سائیں! کیا ہمیں ڈی سی پر حملہ کرنا ہے۔"

"نہیں۔ تمہیں پنجاب سے آنے والی ٹرین پر حملہ کرنا ہے۔ بابا بہاول اس سے پہلے جس علاقے میں بھی ٹرین پر حملہ ہوا ہے وہاں سے حکومت نے تمام اعلیٰ اہلکاروں کے تبادلے کر دیئے ہیں..... اس طرح اس ڈی سی کا بھی تبادلہ ہو جائے گا اور ہم اپنے مطلب کا بندہ یہاں لگا لیں گے..... بابا سائیں نے اُدھر بات پکی کر رکھی ہے جیسے ہی یہ بندہ یہاں سے جاتا ہے ہمارا بندہ آ جائے گا۔ جس کے ذریعے بات چیت کر کے میں تمہیں بچوں سمیت دوسرے ملک میں پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔" ہجوار شاہ نے اپنے گھناؤنے منصوبے کی تفصیلات اُسے سمجھائیں۔

"لیکن سائیں اس طرح اچانک فائرنگ سے بے گناہ بھی....."

"بابا بہاول تمہیں آج کل انسانی جانوں کی بہت فکر ہونے لگی ہے۔ بابا چھوڑو اس دھندے کو کہیں ہاریوں والا کام کر لو۔ تم گولی نہ چلانا بس وہاں موجود رہنا۔ یہ کام ہمارے دوسرے ساتھی کر لیں گے..... بابا تم سیاست کو نہیں سمجھتے۔ سیاست میں کسی کی نہیں اپنی جان کی فکر کی جاتی ہے۔ تمہاری بچیاں بیاہنے لائق ہو رہی ہیں اور تم گناہ ثواب کے چکر میں پڑے ہو۔ بابا! کوئی کام کی بات کیا کرو..... ایسی باتوں سے معاملہ خراب ہوتا ہے۔ ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے اس کا فیصلہ ہم نے کرنا ہے بہاول! بابا ہم سرکار دربار میں بیٹھتے ہیں۔ سرکار دربار کے معاملات کی فکر تم نہ کیا کرو..... بس وہ کرو جس کا حکم ملتا ہے....." ہجوار نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے مرشد سائیں۔ آپ جیسا حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا..... بہاول نے اُس کے گھٹنے چھوتے ہوئے کہا۔

"میں اب جاتا ہوں..... کل تک پانچ بندے اِدھر آ جائیں گے۔ انہیں یہاں مہمان رکھنا ہے۔ بہت کام کے بندے ہیں۔ اُن کے پاس ہتھیار بھی بہت اچھے ہیں۔ تم نے صرف اُن کا حکم ماننا ہے۔ میں اَب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہجوار شاہ کھڑا ہو گیا۔

"سائیں! کھانا تو ہمارے ساتھ کھا لیتے۔ آپ کے لئے ہم نے....."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

قریباً دو گھنٹے بعد وہ جس طرح آیا تھا اُسی طرح چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

بہاول کے ساتھی ہجوار شاہ کو جنگلی سلسلے کے باہر پکی سڑک تک اپنی حفاظت میں رُخصت کر کے آئے تھے۔

✹

"سب ٹھیک ہے نا بابا۔" حویلی سے کچھ دور اپنے ڈیرے پر پہنچ کر اُس نے دروازے پر موجود اپنی منشی سے دریافت کیا۔

''بھلے سائیں! بھلے! سب خیر ہے سائیں۔'' منشی نے ہاتھ جوڑے۔

وہ اپنے سائیں کے ساتھ ہی پر تکلف ڈرائنگ روم تک آیا تھا۔ اپنے سائیں کے جوتے اُس نے اپنے ہاتھوں سے اتارے تھے۔

''کوئی پیغام.....؟'' سجوار شاہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''سائیں کچھ نہیں، یہ بہاول کی گھر والی بہت ضد کر رہی ہے ملاقات کے لئے۔''

''بابا! مل لیں گے اُس سے بھی۔ مل لیں گے۔ کل ملا دینا کیا مصیبت ڈال رکھی ہے اُس نے۔ تم سے ایک عورت بھی قابو نہیں ہوتی۔'' سجوار شاہ نے غصے سے کہا۔

''سائیں! آپ کے حکم کا خیال ہے مرشد، ورنہ تو اس کی مجال نہیں کہ دم بھی مار سکے۔'' منشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''خیر! دیکھیں گے صبح اُس کو بھی۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب کوئی فون وغیرہ مجھے نہیں دینا۔ کل صبح بھی میں خود ہی جاگوں گا۔ مجھے جگانا نہیں۔''

''ٹھیک ہے مرشد سائیں جو حکم۔''

''اب تم جاؤ۔''

منشی باہر آ گیا۔ واپسی پر اُس نے دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کیا تھا۔ سجوار شاہ وہیں ایک آرام دہ صوفے پر ڈھیر ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر اُس نے اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی راہ لی۔

سجوار شاہ آج واقعی تھک گیا تھا۔

اُسے صبح ہی پارٹی کی طرف سے سرحد پار کے مہمانوں اور اُن کے پلان کی اطلاع ملی تھی اور آج ہی اُس نے یہ اطلاع جنگل میں بھی پہنچائی تھی اور ''مہمانوں'' کی حفاظت اور رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔

بیڈ روم میں داخل ہونے کے لئے اُس نے دروازہ کھول کر دروازے سے ملحقہ دیوار میں لگا بٹن دبا دیا اور جیسے ہی بلب کی روشنی میں کمرے میں نظر دوڑائی حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اُس کے بستر کے سامنے موجود آرام دہ کرسی پر ایک سندھی نوجوان بڑے آرام اور سکون سے بیٹھا تھا۔

''کون ہو تم؟''

سجوار شاہ نے دوسرے ہی لمحے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

''میں ''دوست'' ہوں۔ ''سجاول'' نام ہے میرا۔'' اُس نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''ہوں ں ں.....'' سجوار شاہ اُسے پہچان گیا۔

یہ کیپٹن مالک رام تھا جسے سجاول کا نام دے کر یہاں بھیجا گیا تھا۔

''لیکن..... یہ کون سا طریقہ ہے ملاقات کا۔'' سجاور شاہ اُسے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ تعارف سے پہلے وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے سائیں! کہ آپ کی شان میں گستاخی ہوگئی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر موجود آپ کے محافظوں کی فوج یا کسی اور کو خبر ہوتی.....'' سجاول نے کہا۔

''لیکن آپ نے تو کہیں اور آنا تھا..... اور وہاں ہمارے آدمی۔''

''ہاں سائیں! واقعی مجھے کہیں اور آنا تھا لیکن میں ''انتہائی احتیاط'' کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری کسی بھی غلطی کی وجہ سے ہمارے دوستوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ بالآخر مجھے آپ ہی سے ملنا تھا۔ اس لئے میں نے طے شدہ منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔

''کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی اگر کچھ ہو بھی جاتا..... بابا! اگر یہ لوگ اتنے سیانے ہوتے، کسی قابل ہوتے تو اب تک بہت کچھ کر لیتے۔ بابا سجاول! ادھر بس نام ہی نام کی سرکار ہے۔ یہاں حکومت ہماری ہے۔ سرحد سے یہاں تک کسی کی مجال نہیں کہ ہمارے حکم کے بغیر پر بھی مار سکے۔ بابا! ہم ہیں یہاں کی حکومت، ہم ہیں.....'' بڑی رعونت سے اُس نے جواب دیا۔

''حق ہے سائیں! بجا فرمایا سائیں!'' سجاول نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ایک درخواست کرنی تھی سائیں کہ میرے ساتھیوں کو یہاں لائے بغیر سیدھا ٹھکانے تک پہنچا دیں..... میں وہیں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ جتنا کم خطرہ مول لیا جائے اتنا ہی ہمارے لئے بہتر ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بابا! جیسا تم کہتے ہو۔ ویسا ہی ہو جائے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔''

اتنا کہہ کر اُس نے کمرے میں موجود گھنٹی کا بٹن دبایا۔

دوسرے ہی لمحے منشی وہاں موجود تھا۔ اپنے سائیں کے خاص کمرے میں ایک مہمان کو دیکھ کر چونک گیا۔ اُسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ یہ شخص کہاں سے نازل ہو گیا۔ اس حویلی میں تو ہوا کو اپنی مرضی سے داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی یہ تو انسان ہے۔

جیتا جاگتا انسان.....!!

''منشی! سجاول ہمارے ''خاص مہمان'' ہیں۔ ان کو ساتھ والے بیڈ روم تک پہنچاؤ۔ کوئی ان سے ملاقات نہیں کرے گا۔'' سجاور شاہ نے اُس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

''جو حکم سائیں۔'' منشی اب نارمل ہو گیا تھا۔

''خاص مہمان'' کا مطلب اس سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے ''پراسرار خاص مہمان'' اکثر اس کے سائیں سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح

درجنوں مسلح محافظوں کو جُل دے کر یہ پہلا مہمان آیا تھا۔

منشی نے مہمان کے لئے اُس خاص بیڈ روم کا بندوبست کیا تھا جہاں دن یا رات کے کسی بھی حصے میں سوائے خصوصی ملازمین کے اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

اُس رات مالک رام کئی دنوں کی بے آرامی اور بے چینی کے بعد پہلی مرتبہ قدرے سکون کی نیند سویا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے متعلق بڑا پُر اعتماد تھا۔

یہ لوگ اُس کے برسوں کے رفیق تھے۔ ان کی مدد سے اُس نے بنگلہ دیش اور بھارت کے دور دراز علاقوں میں بہت سے خفیہ آپریشن کئے تھے اور ان میں وہ بھی تھے جو اس سے پہلے پاکستان میں بھی ایسے خفیہ آپریشن کر چکے تھے۔

مالک رام جانتا تھا جن لوگوں کا وہ ''مہمان'' ہے وہ اُنہی کے پروردہ ہیں۔ ان کی حیثیت غیر ملکی کٹھ پتلیوں سے زیادہ کچھ نہیں اور جب سے بھارت نے اپنے سرحدی علاقوں میں ان غداروں کی سہولت، تربیت اور حفاظت کے لئے کیمپ قائم کئے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں انہیں تربیت اور اسلحہ دیا تھا، اس کے بدلے تو خاص طور پر بجوار شاہ اور اُس کی جماعت کے لوگ بھارتی حکومت کے کسی بھی حکم پر کتے کی طرح دم ہلانے لگتے تھے۔

اس علاقے میں موجود پاکستانی سیکورٹی کی بھی مالک رام کو خاص پرواہ نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کے حکمران اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے خصوصاً اس علاقے میں اُن لوگوں کا دم بھرتے ہیں جو اصل میں غدار لیکن بظاہر پاکستان نواز بہروپئے بنے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ دورانِ تربیت اُس نے اپنے انسٹرکٹر سے پوچھا تھا کہ جب اس ملک کی علیحدگی پسند تنظیموں کے بہت سے لیڈر کھلم کھلا بغاوت کی باتیں اور اپنے نظریات کا پرچار کرتے ہیں تو پاکستانی حکومت انہیں لگام کیوں نہیں دیتی۔

''ابھی تم نوجوان ہو، ان باتوں کو سمجھ نہیں سکو گے۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات لگتی ہے لیکن تم نہیں جانتے ہوسِ اقتدار میں اندھے حکمران کو چاروں طرف صرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارا اتہاس ایسے سینکڑوں واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ یہ مہابھارت کیا تھی؟ ہوسِ اقتدار میں اندھے ہو جانے والے خون کے رشتہ داروں نے دھرم اور انسانیت کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے کوروکشیتر کے میدان میں ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا اور دنیا کے اتہاس کی طویل ترین لڑائی شروع ہو گئی تھی..... ہم تو صدیوں سے سیاسی چلتر بازیوں سے آگاہ ہیں۔ یہ بیچارے تو کل کی پیداوار ہیں۔ جب ہم اقتدار کی دیوی کے چرنوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو یہ کس باغ کی مولی ہیں؟'' اُس کے انسٹرکٹر نے کہا تھا۔

لیکن.....!

مالک رام کو اس جواب نے مطمئن نہیں کیا تھا.....!!

وہ ایک عرصے سے ''را'' کے ''سندھو دیش'' سیل میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اُن لوگوں نے اب تک ہزاروں کی تعداد میں کتابچے چھاپ کر پاکستان میں تقسیم کروائے تھے اور حیرت کی بات ہے کہ پاکستانی اخبارات کے چیخنے چلانے کے باوجود حکومت کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی..... محض اشک شوئی کے لئے معمولی نوعیت کی گرفتاریاں کی جاتیں جو پھر سیاسی سودے بازیوں کی نذر ہو جاتی تھیں۔

***

سنہرا جال

بنے میاں کا اصلی نام کیا تھا؟

اُن کے کسی جاننے والے نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی لوگوں کو آم کھانے سے مطلب ہوتا ہے گٹھلیاں گننے سے نہیں۔

بنے میاں بااثر سیاسی شخصیت تھے گو کہ انہوں نے کبھی الیکشن میں براہِ راست حصہ نہیں لیا تھا اور زیادہ توجہ اپنے بزنس پر ہی دیا کرتے تھے۔

لیکن.....!

واقفانِ حال جانتے تھے کہ بنے میاں کا بزنس بھی ایک ڈھکوسلہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ جو اُن کی پان مارکیٹ میں دُکان تھی اس سے تو اُن کے گھریلو نوکروں کی تنخواہ بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ بظاہر بنے میاں پان کا پتہ امپورٹ کرتے تھے لیکن اس پان بیڑی کے سوداگر کی اصلیت عارف چوہدری سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

عارف چوہدری نے حال ہی میں گریجویشن کی تھی اور اب نوکری کے لئے سڑکوں پر جوتیاں چٹخا رہے تھے کہ ایک روز انہیں پیسے کمانے کی عجیب ترکیب سوجھی۔

عارف چوہدری دیکھ رہے تھے کہ اُن کے گھر آئے روز بھارت سے کوئی نہ کوئی مہمان ٹکا رہتا ہے۔ اُن کے ننھیال اور ددھیال دونوں بھارت میں تھے اور اکثر اُن کے ہاں رشتہ داروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں دو تین خواتین و حضرات ایسے بھی تھے جنہوں نے تین تین چار چار پاسپورٹ بنا رکھے تھے اور نام بدل بدل کر سال میں تین تین چکر پاکستان کے لگا لیا کرتے تھے۔ اپنے ہر چکر میں وہ دس پندرہ ہزار روپے منافع کما لیتے تھے۔ اس میں وہ منافع شامل نہیں تھا جو انہیں پاکستانی

سامان بھارت لے جا کر فروخت کرنے پر حاصل ہوا کرتا تھا۔

اس مرتبہ عارف چوہدری کے کزن ایسے ہی ایک سلسلہ میں آئے تو انہوں نے عارف چوہدری سے کہا۔

''برادر عزیز تم کس چکر میں پڑ گئے..... نوکریاں اگر جوتیاں چٹخانے سے مل جاتیں تو روزانہ سینکڑوں پاکستانی نوجوانوں کو ''بھارت یاترا'' کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری مانو اور وہ کرو جو اس ملک کے ہزاروں بے روزگار کر رہے ہیں اور لاکھوں روزگار والوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

''میں سمجھا نہیں بھائی جان۔'' عارف کچھ کچھ تو سمجھ گئے تھے لیکن وضاحت چاہتے تھے۔

''ارے بھائی صاحب، اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر..... تم کیا سمجھتے ہو کہ چچا جانی اور ماموں سال میں تین مرتبہ تمہاری بلائیں لینے آتے ہیں۔ میاں دھندہ کر رہے ہیں دھندہ..... دس بیس ہزار سے شروع کیا تھا آج لاکھوں میں کھیل رہے ہیں اور دنوں میں حالت بدلتی ہے۔'' اُس کے خالہ زاد حسن نے کہا۔

لیکن حسن بھائی مجھے تو ابا حضور سوائے طعنوں اور گالیوں کے کچھ نہیں دے سکتے اور اماں کے پاس جو زیورات تھے وہ انہوں نے باجی کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔ ابتدائی اخراجات بھی تو نہیں ہیں میرے پاس۔'' عارف نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

''یہ ہم پر چھوڑ دو..... ففٹی ففٹی پر کام کریں گے۔ سرمایہ ہماری اور محنت تمہاری۔ منافع آدھا آدھا۔'' حسن نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''..... عارف کی رال ٹپکنے لگی۔

''ملاؤ ہاتھ اور کرو بسم اللہ۔'' حسن نے اپنی دائیں آنکھ دباتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

عارف کو بنے میاں کے گھر کا راستہ حسن نے دکھایا تھا۔ اُس نے عارف چوہدری کو بتایا تھا کہ بنے میاں کے بھارتی قونصلیٹ میں روابط ہیں۔ اُن کے ذریعے فوراً اور آسانی سے ویزہ مل جائے گا۔ ویزہ تو عارف کو یوں بھی مل سکتا تھا اُن کے بہت قریبی رشتہ دار بھی بھارتی شہری تھے۔

لیکن.....!

بنے میاں کے ذریعے ویزہ لینے میں ایک خاص حکمت عملی جو اُسے حسن نے بتائی تھی یہ تھی کہ بنے میاں اُن کے سامان کے سب سے بڑے اور اچھے گاہک ہوتے۔ کیونکہ حسن کا بیوپار اُن سے پرانا چل رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ عارف جیسے نوگرفتار کے لئے اس سے اچھی پارٹی اور کوئی نہیں۔

''سامان کھولنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی عارف..... دہلی سے سیدھے یہاں آؤ اور سامان بنے میاں کے آدمیوں کو سونپ دو۔ شام کو رقم تمہارے گھر پہنچ جائے گی..... اور ہاں سب سے بڑی بات کہ اس شہر میں کسی کو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی..... عارف اس بیوپار میں تحفظ میسر ہو تو راتوں رات بندہ لکھ پتی بن جاتا ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ پھر تم خود بے روزگار ہوتے ہوئے چند پھیروں کے بعد کئی بے روزگاروں کو اپنے ہاں ملازم رکھ لو۔''

حسن نے عارف چوہدری کو وہ وہ سبز باغ دکھائی کہ بیچارے چپ چاپ پھنستے چلے گئے۔ اُن کے پاس صرف شناختی کارڈ تھا لیکن یہ مسئلہ بھی حسن نے حل کروا دیا۔

وہ عارف کو بنے بھائی کے پاس خود لے گیا تھا۔ لاہور کی جدید آبادی میں اُن کی عالیشان کوٹھی پر عارف کی ملاقات کروائی تھی۔ عارف بنے میاں کے طور اطوار اور رنگ ڈھنگ سے بڑا متاثر ہوا۔ اُس نے یہ کوٹھی دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ بنے میاں کروڑوں کی آسامی ہیں اور ایک دن وہ بھی ضرور کروڑ پتی بن جائے گا۔

بنے بھائی نے حسن کا خالہ زاد ہونے کے ناطے عارف چوہدری کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اُن کا نہ صرف پاسپورٹ بنا بلکہ ویزہ بھی لگ گیا۔

عارف چوہدری نے پہلا چکر حسن کے ساتھ لگایا تھا۔

وہ دونوں پاکستان سے اکٹھے دہلی گئے تھے۔ عارف حیران تھا کہ حسن غیر ملکی ہونے کے باوجود تمام چکر جانتا تھا۔ کیا مجال جو کسی نے اُن کے سامان کو چھو کر بھی دیکھا ہو۔ حسن اُسے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی لے گیا تھا۔ جس بھارت شہری کو کسی نے پاکستان میں ہاتھ نہ لگایا ہو اُسے بھارت میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ اُن کا سامان کسٹم سے بڑی آسانی سے پار ہو گیا اور دونوں اپنے گھر آ گئے۔

حسن گو کہ عارف چوہدری کی خالہ کا بیٹا تھا لیکن اُس نے عارف کو ہمیشہ اپنا دوست سمجھا اور اُن کو وہی موج میلہ کروایا جو کوئی دوست کسی دوست کو کروا سکتا ہے۔ دہلی کی اوپن سوسائٹی کو دیکھ کر عارف پہلے پہل تو شرمایا لیکن جلد ہی اُس کی شرم جھجک اُتر گئی۔ حسن اُسے روزانہ ہی کسی نہ کسی ایسی جگہ لے جاتا جو کسی بھی سیدھے سادھے پاکستانی نوجوان کی کمزوری ہوتی ہے۔

✹

عارف اس درمیان کملیش کمار کی نظروں میں پیدا ہونے والی وہ خصوصی چمک نہ دیکھ سکا جو شکار کو دیکھ کر اکثر گھاگ شکاریوں کی آنکھوں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ کملیش کمار کا تعارف حسن نے اپنے جگری دوست کے حوالے سے کروایا تھا۔ ''یہ سالا نام کا ہی ہندو ہے۔ اپنے ساتھ سب کچھ کھا لیتا ہے۔ سالے کو ''گاؤ ماتا'' کے کباب تو بہت ہی پسند ہیں۔''

حسن نے پہلی ہی ملاقات پر اُس کا تعارف عارف چوہدری سے کرواتے ہوئے کہا۔

شاید عارف کو اس بات کا یقین نہ ہوتا لیکن جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا جو کملیش کے متعلق حسن نے بتایا تھا تو انہیں بھی یقین آنے لگا۔ واقعی کملیش اُس کی توقعات سے بڑھ کر کھلے دل و دماغ کا نوجوان ثابت ہوا۔ وہ اُن کے ساتھ اُن کے گھر میں اکثر آتا جاتا تھا اور ہر وہ چیز بڑے آرام سے کھا لیتا جو ہندوؤں کے نزدیک ''دھرم بھرشٹ'' کر دینے والی ہوتی ہے۔

اب وہ عارف کو اکیلے اپنی کار پر گھمانے لے جایا کرتا اور اس درمیان وہ عارف سے اکثر پاکستان اور بھارت کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ اُس نے جلد ہی عارف کو باور کروا دیا کہ یہ دھرم، ملک، ملت وغیرہ سب بکواس اور پاکھنڈ ہے۔ آدمی اس دنیا میں بڑی مختصر مدت لے کر آیا ہے اور سب سے بڑی انسانیت اور دھرم نوازی یہ ہی ہے کہ جب تک زندہ رہے خوب عیش اور آرام سے زندگی گزارے، ملک جائے جہنم میں۔ انسان نے روز روز تو جنم لینا نہیں۔

عارف آہستہ آہستہ اُس کے پھیلائے میٹھے زہر کو پینے لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ماحول ہوتا جس میں بیٹھ کر وہ باتیں کرتے یا پھر وہ بیئر یا کبھی کبھی شراب کا ایک آدھا پیگ جس کی عادت کملیش نے بڑی ہوشیاری سے عارف چوہدری کو ڈالی تھی۔

جب پہلی مرتبہ ایک ''کھیرے'' دیکھتے ہوئے کملیش نے اُس کے لئے ویٹرس کو آنکھ کا اشارہ کر کے بیئر منگوائی تو عارف کو اس لئے پتہ نہ چلا سکا کہ اُن کی ساری توجہ کھیرے کرنے والی ڈانسر کی ٹانگوں اور جسمانی اُبھار پر مرکوز تھی۔

لیکن.....!

ایک گلاس چڑھانے کے بعد اُنہیں اپنے اندر کچھ تبدیلی کا احساس ضرور ہوا اور کیوں نہ ہوتا۔ عارف نے تو ساری زندگی قوام والا پان نہیں کھایا تھا۔ اب اچانک بیئر کیسے ہضم کرتا۔

''چھوڑو یار! کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔'' کملیش نے اُس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

یہاں سے وہ ایک ہوٹل میں ڈنر کے لئے آ گئے تھے جہاں حسن پہلے سے موجود تھا۔ اُس روز زندگی میں پہلی مرتبہ عارف نے اپنے خالہ زاد بھائی کے منع کرنے پر بھی ایک پیگ وہسکی کا چڑھا لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب عارف کا دماغ آسمان کی بلندیوں پر پہنچا اور انہوں نے خود کو کوئی غیر مرئی مخلوق جاننا شروع کیا تو کملیش اور حسن اُسے دہلی کے بازارِ حسن کے ایک کوٹھے پر لے گئے۔

وہ پہلی ایسی رات تھی جب عارف چوہدری کو اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا۔ عارف صاحب بالکل نہ جان سکے کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

●

وہ دہلی میں سات آٹھ روز رہنے آئے تھے لیکن اُن کا قیام پندرہ روز سے زیادہ ہو رہا تھا اور ابھی مزید پندرہ بیس روز تک کملیش اور حسن نے اُسے یہیں روکنے کا پروگرام بنایا تھا۔

علی الصباح جب عارف کو ہوش آیا تو وہ کسی طوائف کے بیڈ روم میں سو رہا تھا لیکن.....اکیلا نہیں۔!!

ایک پری جمال اُس کے پہلو میں چمٹی تھی اور اُن کے سرہانے دھری تپائی پر شراب کی آدھی خالی بوتل گلاس سمیت موجود تھی۔

ایک مدہوشی سی اُس پر طاری تھی۔ اسے اپنا دماغ بوجھل لگ رہا تھا لیکن سرور و انبساط کی لہریں اُس کے روئیں روئیں سے اُٹھ کر سارے بدن کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

''رات کیسی گزری مولانا!'' اچانک ہی اُس کے کمرے میں کملیش اور حسن داخل ہوئے دونوں کے ساتھ ایک ایک حوا زادی چمٹی تھی بالکل ویسی ہی جیسی اُس کے

پہلو میں موجود تھی۔

''سالی کو ابھی تک نیند آ رہی ہے۔ شاید دولہا بھائی نے ساری رات سونے نہیں دیا۔'' حسن کے پہلو سے چمٹی حرافہ نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

عارف صاحب کو زمین پھٹتی نہیں دکھائی دیتی تھی کہ اُس میں سما جاتے لیکن وہ صرف جھجک اور شرمندگی محسوس کر رہے تھے..... ضمیر کی طرف سے معاملہ بالکل صاف تھا اور کسی بھی طرح کی ملامت کا سامنا اُنہیں نہیں کرنا پڑا جو اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ واقعی پٹڑی سے اُترنے لگے ہیں۔

صبح صبح ہی وہ حسن اور کملیش کے ساتھ خالہ جان کے ہاں پہنچ گئے اور دوپہر تک لمبی تان کے سوتے رہے۔

''اے میاں خیریت تھی آج تو گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔'' خالہ جان نے خلافِ معمول انہیں دیر تک سونے پر کہا۔

''رات بڑی دیر سے آئے تھے اماں! آخری شو دیکھ کر، پھر نیند بھی دیر سے آئی اور میں نے بھی جگانا مناسب نہ جانا۔'' اُس کے بجائے حسن نے جواب دیا۔

نہانے سے عارف کو خاصہ افاقہ ہوا تھا اور اُسے اپنا جسم اب بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

''آج دوپہر کا کھانا میاں کملیش کے یہاں ہے۔ حسن نے اُسے مطلع کیا۔

''میں تو آگرہ جا رہا ہوں کام کے سلسلے میں تمہیں کملیش خود ہی لے جائے گا۔''

''ٹھیک ہے بھائی جان۔'' قربانی کے بکرے عارف چوہدری نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''میاں ذرا سنبھل کے چلنا۔ مزہ ضرور لو مگر تھوڑا تھوڑا۔'' جاتے جاتے حسن نے آنکھ دباتے ہوئے کہے اور عارف صاحب لڑکیوں کی طرح شرما کر رہ گئے۔

کملیش تھوڑی دیر بعد ہی اُسے لینے آ گیا۔

راستے میں جان بوجھ کر وہ رات کے واقعات کے حوالے سے گفتگو کرتا رہا۔ گھر پہنچنے تک اُس نے عارف کی ساری جھجک ختم کر دی تھی اور عارف خود اُس سے ایسی ہی کسی ''تقریب'' کی فرمائش بھی کرنے لگا تھا۔

''ہمارے ساتھ رہو گے تو عیش کروا دیں گے۔ میاں صاحبزادے یہ دلی ہے۔ تمہارا لاہور یا کراچی نہیں۔ یہاں تو دور دور تک کسی مولوی یا پنڈت کا سایہ نظر نہیں آئے گا۔ میاں بڑی فری سوسائٹی ہے۔ خوب موجیں اُڑاؤ۔ تمہیں تو علم ہے کہ پاکستانی نوجوان جو یہاں دہلی میں آتے ہیں، دن رات شراب اور شباب کے نشے میں مدہوش رہتے ہیں۔ میاں صاحبزادے ایک ہفتے میں وہ ایک سال کی روحانی اور جسمانی غذا لے کر اور خوب سیر ہو کر جاتے ہیں۔'' کملیش نے اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔

کملیش کی ماں کسی دوسرے شہر کے کالج کی پرنسپل تھی اور باپ کسی تیسرے شہر میں سرکاری افسر تھا۔ گھر پر وہ اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔

یہ اطلاعات اُسے حسن سے ملی تھیں اور آج وہ پہلی مرتبہ اُس کے گھر جا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دونوں سیدھے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔

''میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔'' کہہ کر کملیش شاید باتھ روم میں گیا تھا۔

اس درمیان عارف بڑے انہماک سے دیوار پر لگی ایک نہایت خوبصورت پینٹنگ دیکھنے لگا۔

اچانک ہی وہ اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز پر چونکا اور جیسے ہی عارف چوہدری نے گردن گھمائی انہیں یوں لگا جیسے وہ پتھر کا ہو کر رہ جائے گا۔

پاکستان کے ایک بڑے اور ماڈرن شہر میں رہنے اور پندرہ بیس روز دہلی کی ''فری سوسائٹی'' میں گزارنے کے بعد گو کہ اس نے بڑے بڑے قتال چہرے دیکھے تھے۔ دہلی کے نائٹ کلبوں میں ناچنے والی فاحشاؤں کے جسمانی نظاروں سے جی بھر کے لطف اندوز ہونے اور بڑے بڑے ہوٹلوں کی مخلوط محافل میں کئی زہرہ گدازوں کی زلفوں کے اسیر ہوتے ہوتے بچا تھا۔

لیکن.....!

حسن اور جنسیت کا اس سے زیادہ خوبصورت امتزاج وہ اس جنم میں دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاتا۔

جین جیکٹ میں ملبوس آدھے ننگے بازوؤں والی سانولے رنگ کی اس ساحرہ نے جس کا جسم لباس کی قید سے آزاد ہونے کے لئے مچلا جاتا تھا جب ماتھے پر گرے انگریزی سٹائل کے بالوں کو جھٹکا دے کر دائیں آنکھ سے ہٹاتے ہوئے ''ہیلو'' کہا تو عارف چوہدری کو یوں لگا جیسے وہ ہزاروں سال پرانے کسی معبد کے پجاری ہیں اور اچانک ہی حسن کی دیوی اُن کی تپسیا سے پرگٹ ہو کر پتھر کے بت سے انسانی روپ میں اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

وہ آنکھیں جھپکے بغیر بادامی رنگ کی اس ساحرہ کو ٹکٹکی باندھے پتھر کے بت کی طرح دیکھتے رہے جس کی سیاہ اور انتہائی چمکدار آنکھوں میں عارف چوہدری کو اپنا آپ ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیسی لگی یہ پینٹنگ؟'' اُس قتالہ نے ایک قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے عارف چوہدری کے دل پر دھم سے قدم رکھا اور پوچھا۔

''وِنڈرفل'' عارف نے تھوک نگل کر بمشکل کہا۔

''میں نے بنائی ہیں۔'' قتالہ نے موتی بکھیرے۔

''ایک دم شاندار۔'' عارف رطب اللسان تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تصویر کی تعریف کرے یا مصورہ کی کہ اچانک ہی کملیش اندر آ گیا۔

''عارف صاحب یہ میری بہن ہے۔'' اُس نے اپنی دانست میں پری جمال کا تعارف کروایا۔

''میناکشی۔'' کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

عارف کے برفیلے اور منجمد جسم نے حرکت کی اور اس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ میناکشی کے ہاتھ میں دے دیا۔

جیسے ہی میناکشی نے اُس کا ہاتھ پکڑا عارف کے خون میں اُبال آ گیا۔ اسے اپنی ہیت بدلتی محسوس ہوئی اور جسم میں خون کے بجائے سرور و انبساط کی لہریں دوڑنے

لگیں۔

مینا کشی نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے براہِ راست اُس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دی تھیں اور عارف اُس ایک لمحے کو حاصل زندگی سمجھ کر اس خوف سے آنکھیں نہیں جھپک رہا تھا کہ کہیں یہ منظر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

''تشریف رکھئے۔'' مینا کشی کی آواز مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کی طرح اُسے بہت دور سے آتی سنائی دی اور اُس کے ہاتھ کی خوبصورت انگلیوں پر نظر جمائے، جن سے مینا کشی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کملیش بھیا آپ کی اتنی تعریف کر چکے ہیں کہ آج میں نے انہیں مجبور کر کے آپ کو یہاں بلا لیا ہے۔ یہ حسن بھائی بھی عجیب آدمی ہیں۔ دہلی بھر کے ہونقوں کی ملاقات ہم سے کرواتے رہتے ہیں لیکن آپ کو نجانے اب تک کہاں چھپا کے رکھا تھا۔'' مینا کشی مسلسل بول رہی تھی۔

اُس کے بادامی ہونٹوں پر گلی براؤن رنگ کی لپ اسٹک کے پس منظر میں جھانکتے سفید موتوں ایسے دانت اور آنکھوں میں سمٹے ایک عالم کے سحر کی تاب لاتا عارف چوہدری کے لئے کارِ دارد تھا۔

''جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ تو کمال کی مصورہ ہیں۔'' بالآخر اُس نے سوچ سوچ کر ایک بات کہہ ہی دی۔

''مینا کشی نے آج تمہارے لئے خاص طور سے چھٹی کی ہے ہم سارا دن تمہارے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔''

کملیش نے کہا اور عارف کو وہ کہاوت یاد آئی کہ ''اندھے کیا چاہے دو آنکھیں۔''

''آپ گپ شپ کیجئے میں چائے لاؤں۔'' کہہ کر مینا کشی چلی گئی۔

عارف کی نظریں مینا کشی کی کمر پر گڑی تھیں۔ اس کا ہر قدم جو زمین پر پڑتا دراصل عارف کے دل پر پڑ رہا تھا۔

کملیش بھنگیوں سے اُس کی بدلتی حالت کا جائزہ لیتا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اُس کے چلائے ہوئے سارے تیر ایک ایک کر کے نشانے پر بیٹھ رہے ہیں۔

اس درمیان اُس نے دوبارہ عارف سے رات کی ملاقات اور واردات کی باتیں شروع کر دیں۔ اب یہ سب کچھ عارف چوہدری کے لئے بیکار تھا۔

کیوپڈ مہاراج نے ایسا تان کر تیر اُن کے دل میں ترازو کیا تھا کہ اب انہیں ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف مینا کشی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مینا کشی کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہی ہو گئی۔

●

جاری ہے...

وہ چائے اور لوازمات سے لدی پھندی ٹرالی کھینچتی سیدھی عارف کے سامنے آ رہی تھی۔ ٹرالی اُس نے عارف چوہدری کے سامنے روک کر اُس کے لئے قدرے جھک کر چائے بنانا شروع کی تو عارف کا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ مینا کشی اپنے جسم سے مکمل بے نیاز دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن.....!

عارف کی آنکھوں نے اس کے گریبان میں جیسے مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ اس نے مینا کشی کا وہ روپ دیکھ لیا تھا جسے دکھانے کے بعد بنگال کی جادوگرنیاں آدمی کو بندر اور گدھا بنا دیا کرتی ہیں۔ اب وہ جب بھی چاہتی اسے اپنے شباب کی ڈگڈگی پر بندر کا ناچ نچا سکتی تھی۔

عارف کے دل کی دھڑکنیں اتنی بے قابو ہو گئی تھیں کہ اسے اپنا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر گرتا دکھائی دینے لگا تھا۔ مینا کشی نے جب کھڑے ہو کر چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھائی تو عارف نے بمشکل ہاتھ کی کپکپاہٹ پر قابو پایا تھا۔

اس کے بعد مینا کشی نے اپنے لئے چائے تیار کی اور عارف کے پہلو میں اس طرح براجمان ہو گئی کہ اسے اب اپنا سانس بھی رُکتا محسوس ہونے لگا۔

''تم اپنے لئے خود بنا لو، اپنی مرضی سے۔ کیونکہ تمہیں میرے ہاتھ کی بنی چائے کبھی پسند نہیں آتی۔'' مینا کشی نے نکلیش سے کہا اور اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ایک پلیٹ جس میں بڑے سلیقے سے کباب سجے تھے عارف کی طرف بڑھا دی۔

''شکریہ!'' عارف صاحب اس مہمان نوازی پر مرے مٹے جا رہے تھے۔

''لیجئے نا!'' مینا کشی نے ایسی ادا سے کہا کہ بے ساختہ عارف کا ہاتھ تھالی کی طرف بڑھ گیا۔

''اب ایسی بھی بے رخی کیا۔ یہ مستقل رہنے والے نہیں مستقل قیام تو تمہارا بہر حال میرے ہی ساتھ رہنا ہے۔'' نکلیش نے پلیٹ میں سے دو کباب ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے مینا کشی سے کہا۔

اچانک ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نکلیش منہ میں کباب رکھے فون تک پہنچا اور فون سننے پر اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہونے لگے۔

''سوری یار!'' اُس نے فون رکھ کر عارف سے کہا..... ''سالا ڈائریکٹر اچانک بمبئی سے یہاں آن مرا ہے اور ہنگامی میٹنگ بلا لی ہے۔ میں تو چلا اب ملاقات شاید رات کے کھانے پر ہو گی۔ مینا کشی تمہیں سنبھالے گی۔ بے فکر رہو اس کی صحبت میں تم بور نہیں ہو گے۔''

کہتے ہوئے اُس نے میز کے کونے پر رکھی اپنی کار کی چابی اٹھائی، لیکن اچانک ہی آگے بڑھ کر مینا کشی نے اُس سے چابی چھین لی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا..... بھئی کیا مذاق ہے..... مجھے بہت جلدی ہے۔'' نکلیش نے کہنا چاہا۔

''اس گھر کے باہر چوبیس گھنٹے آپ کو ٹیکسی مل سکتی ہے۔ میرا نہیں تو مہمان کا خیال کر کے کچھ تو شرم کرو۔ ہم کیا دلی کی سڑکوں پر پیدل گھومیں گے اور وہ بھی اس موسم

میں جب کسی بھی وقت بارش متوقع ہو۔'' میناکشی نے چابی اپنی مخصوص جیکٹ کی جیب میں ڈال لی۔
کملیش نے ایک لمحے کے لئے اُسے گھور کر دیکھا پھر یہ کہہ کر باہر بھاگ گیا۔ ''ٹھیک ہے اب تم مہمان کو درمیان میں لے آئی ہو تو یہ قربانی دینی ہی ہوگی۔''
عارف کے لئے زندگی میں اس سے زیادہ آئیڈیل سچویشن اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر وہ اس وقت خدا سے کچھ اور بھی مانگتا تو اسے مل جاتا۔
تنہائی اور میناکشی کا ساتھ۔
وہ خود کو شہزادہ اندر جاتنے لگا تھا۔

●

''عارف صاحب! ہم تو کسی دھرم کو نہیں مانتے اور یہ کباب میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کئے ہیں لیکن سنا ہے پاکستانی بڑے پکے مسلمان ہوتے ہیں اور.....''
میناکشی نے کچھ کہنا چاہا۔
''اجی چھوڑیے آپ بھی کیسی باتیں لے بیٹھیں۔'' عارف نے پاکستانی مسلمانوں کو بے نقط سناتے ہوئے کہا۔
میناکشی عارف کے اتنے نزدیک بیٹھی تھی کہ اسے اپنے پہلو میں الاؤ دہکتا محسوس ہونے لگا تھا۔ پہلے پہل تو وہ رعبِ حسن سے خاصا دباؤ دکھائی دے رہا تھا۔
لیکن.....!
جب حسن ہی اس پر مہربان ہو رہا تھا تو اُس نے بھی کل پرزے نکالنا شروع کر دیئے۔ میناکشی نے اُسے ہر طرح قریب آنے کا موقع دیا تھا لیکن بہت قریب نہیں آنے دیا تھا۔ فی الوقت وہ اپنے ''شکار'' کی آتش شوق کو اتنا بھڑکا دینا چاہتی تھی کہ پھر وہ اُسے اگر جہنم میں کودنے کا حکم بھی دے تو اُس کے شکار کے لئے ناں کی گنجائش باقی نہ رہے۔
میناکشی نے اُسے اپنی مصوری کے کچھ فن پارے دکھائے تھے اور بتایا تھا کہ اُسے ناچنے اور پاپ میوزک کا بہت شوق ہے۔
اس درمیان عارف کی رال مسلسل ٹپکتی رہی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں میناکشی کو کھا جانا چاہتا تھا، جب اچانک اُس نے دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھانے کی تجویز پیش کر دی۔
''چھوڑیے کھانا، بس میرے ساتھ یونہی باتیں کرتی جایئے۔'' اُس نے اچانک ہی میناکشی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
اس پر میناکشی نے لجا جانے کی جو شاندار اداکاری کی تھی اس پر وہ خود کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ عارف صاحب تو کاٹھ کے اُلو ثابت ہو رہے تھے۔
اُس نے خود ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی عارف نے خود ہی اُس کا ہاتھ چھوڑا تھا۔
''عارف صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں مرد جس خاتون کا ہاتھ پکڑ لیں پھر آسانی سے چھوڑا نہیں کرتے۔'' میناکشی نے اُس کے اتنے نزدیک ہو کر یہ

بات کہی تھی کہ اس کے جسم پر موجود ساری خوشبو عارف چوہدری کی نس نس میں سمانے لگی۔

''جی ہاں! اگر وقت آیا تو میں بھی ثابت کر سکتا ہوں۔'' عارف چوہدری بھی اب خاصا چہکنے لگا تھا۔

''دیکھ لیجئے اتنا بڑا دعویٰ ٹھیک نہیں۔''

''آپ آزما کر تو دیکھیں۔'' عارف صاحب نے اتنا کہہ کر چاہا کہ آگے بڑھ کر مینا کشی کو تھامیں کہ اچانک کملیش کباب میں ہڈی بن کر نازل ہو گیا۔

''بھئی کس کو آزمانے کی باتیں ہو رہی ہیں اور کون آزمانے جا رہا ہے۔ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی عارف چوہدری کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

کچھ نہیں چلئے کہیں باہر کھانا کھانے چلتے ہیں۔'' مینا کشی نے بے تکلفی سے عارف چوہدری کا ہاتھ تھاما اور وہ لرز کر رہ گیا۔

خاصی بے باک اور بہادر محبوبہ ملی تھی انہیں.....!!

''شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہم اکٹھے کھانا کھائیں۔ ہمارے صاحب بہادر کی فلائٹ لیٹ ہو گئی ہے اب وہ شام کی فلائٹ سے آ رہے ہیں۔'' اُس نے دونوں کو مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے۔ شام کو آئیں یا صبح کو ہمیں چلنا چاہئے۔'' مینا کشی نے عارف کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

عارف حیران تھا کہ اپنے بھائی جان کے سامنے وہ کتنی بیباکی سے اُن کا ہاتھ تھام کر کھینچ رہی تھی۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ ان لوگوں کا تعلق مادر پدر آزاد معاشرے سے ہے۔ دھرم کو یہ مانتے نہیں تھے شاید جسمانی تعلقات کو بھی بُرا نہ سمجھتے ہوں۔

کار کملیش چلا رہا تھا۔ مینا کشی اور عارف چوہدری پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور مینا کشی نے پچھلی سیٹ پر موجود تمام پرانے اخبارات، رسائل اور دیگر الم غلم اٹھا کر اگلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

''اتنا قیمتی سامان کم از کم میں اپنے ہاتھوں باہر نہیں پھینکوں گی۔'' اُس نے کملیش سے کہا۔

پچھلی سیٹ پر عارف سے مینا کشی اس طرح لگی بیٹھی تھی جیسے وہ اس کے مہمان نہیں بلکہ ''میاں'' ہیں۔ جب کملیش کوئی موڑ تیزی سے کاٹتا وہ اپنے جسم کا سارا بوجھ عارف پر لاد دیتی جنہیں یقین ہو چلا تھا کہ اُن کے دل کی حرکت اچانک بند ہو جائے گی۔

تینوں ایک ڈسکو نما ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تھے۔

کملیش نے کھانے سے پہلے بیئر منگوائی تھی جو مینا کشی نے بھی عارف کے ساتھ بے تکلفی سے پی۔ کھانا تینوں نے اکٹھے کھایا تھا۔ پھر وہ کچھ دیر دہلی کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور اب مینا کشی نے کملیش کو اُس کے دفتر کے سامنے ڈراپ کر کے اگلی سیٹ پر رکھا ڈھیر دوبارہ پچھلی سیٹ پر پھینک کر عارف کو آگے بٹھا لیا تھا اور کار خود ڈرائیو کر رہی تھی۔

دونوں کناٹ پیلس آ گئے.....!!

دریا کنارے ایک محفوظ اور قدرے گنجان کنج میں ایک مرتبہ پھر دونوں کے درمیان ذومعنی باتوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ آسمان پر صبح سے بادل کی ٹکریاں ایک دوسرے سے کٹ کر بکھری ہوئی تھیں وہ اچانک ہی اکٹھی ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گہرے بادل چھا گئے۔

''میرے خیال سے کہیں اور چلتے ہیں تیز بارش آنے والی ہے۔'' میناکشی نے کہا۔

''جہاں آپ کا جی چاہے لے چلئے ہم تو آپ کی زلفوں سے بندھے ہیں۔ عارف نے بالآخر صاف کہہ دیا۔

''جھوٹ ایک دم جھوٹ۔ میری زلفیں اتنی لمبی نہیں کہ جن سے کسی کو باندھا جا سکے۔'' میناکشی نے اپنے انگریزی سٹائل سے کٹے بالوں کی طرف اُس کی توجہ دلائی اس کے ساتھ ہی نقرئی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔ اُس کی ہنسی ایسی ہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے جب اچانک زور سے بادل گرجا اور میناکشی نے یہی تاثر دیا جیسے وہ اچانک سے گھبرا کر عارف سے لپٹ گئی ہو۔

اس طرح اچانک لپٹ جانے سے آسمان پر کم اور عارف کے اندر زیادہ زور سے بادل گرجا تھا۔

اُس کا رواں رواں سرور و انبساط کی لہروں میں ڈوبنے لگا۔

''سوری۔'' میناکشی نے الگ ہوتے ہوئے نظریں جھکانے کی اداکاری کی۔

''شکریہ!'' عارف نے اس طرح کہا کہ میناکشی بے ساختہ ہنس دی۔

●

شام ڈھلنے کے بعد دونوں ڈسکو میں آ گئے۔

عارف نے لوگوں کو ناچتے تو دیکھا تھا لیکن کبھی خود بھی کسی حسینہ کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچنا پڑے گا یہ تو انہوں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ میناکشی سے بغل گیر قدموں سے قدم ملائے ناچ رہا تھا۔

یہ شیطانی رقص تھا۔

جس کا خاتمہ عارف کی تباہی کی بنیاد رکھ گیا۔

ناچ کے دوران جب انہوں نے میناکشی کے لب لعلیں کی مسکراہٹ چرائی اور اُس نے اس پر ذرا سا بھی احتجاج نہ کیا تو عارف نے اپنی دانست میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لیا تھا۔

لیکن.....!

وہ نہ جان سکا کہ اب وہ ''را'' کی مکمل گرفت میں آ گیا ہے اور موت ہی اب اُسے اس گرفت سے نجات دلا سکے گی۔''

''آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔'' مینا کشی نے اُسے اُس کی خالہ کے گھر کے باہر رات دیر گئے ڈراپ کرتے ہوئے کہا تھا۔

دونوں الگ ہونے سے پہلے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تھے اور مینا کشی نے عارف چوہدری سے دوبارہ جلدی ملاقات کا وعدہ لیا تھا۔

مینا کشی تو چلی گئی۔

لیکن.....!

عارف ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔

کیا مجال جو ایک پل کو اُن کی آنکھ لگی ہو۔ مینا کشی ساری رات اُن کے دل و دماغ پر مسلط رہی۔ انہوں نے جانے عالم تصور میں وحشت کے کون کون سے صحرا پاٹ لئے۔

صبح تھوڑی دیر سونے کے بعد اُن کی آنکھ دوبارہ کھلی تو ناشتے کی میز پر حسن اُن کا منتظر تھا۔

''کیا بات میاں صاحبزادے..... یہ اُڑی اُڑی سی رنگت کیا اکیلے اکیلے شکار کرنے لگے۔'' اُس نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں کچھ نہیں بس یونہی۔'' عارف نے شرماتے ہوئے کہا۔

''کچھ بات تو ایسی ضرور ہے چلو نہ بتاؤ۔ جلد یا بدیر ہمیں پتہ تو چل جائے گا۔'' حسن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

یہ ابتدا تھی.....!!

اگلے روز مینا کشی اُسے لینے آئی۔ اُس نے عارف سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بھی اُن ہی جذبات کی اسیر ہے جن کے عارف ہیں۔ اُس نے عارف سے کہا کہ وہ دھرم کرم کو نہیں مانتے نہ ہی اُس کے والدین کو کسی بات پر اعتراض ہوگا۔ سوائے اس کے کہ وہ پاکستان میں نہیں رہ سکتی۔ یہ بات سنتے ہی عارف میں مجنوں کی روح حلول کر گئی اور انہوں نے اپنی لیلیٰ کے لئے سب کچھ ٹھکرا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

''دیکھ لیجئے! عارف صاحب باتیں کرنا آسان ہے لیکن اُن پر عمل کرنا خاصا مشکل۔'' مینا کشی نے شرمانے کی اداکاری کی۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں آپ کے لئے جان دے سکتا ہوں۔''

ابھی اُس کے الفاظ منہ میں تھے جب مینا کشی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔''

اُس روز کملیش کسی دوسرے شہر کام گیا ہوا تھا اور مینا کشی رات کو ''ڈسکو'' سے سیدھی اُسے اپنے ہاں لے آئی تھی۔

عارف کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اس درمیان ''کمپا کولا'' کی بوتل میں اُنہیں تیز نشے والی شراب پلا دی گئی تھی۔

یہ سارا ''ارینج'' پروگرام تھا۔ اُس رات عارف چوہدری مینا کشی کے گھر رہ گئے اور صبح ہونے پر جب اُنہیں علم ہوا کہ ساری رات وہ اکٹھے لیٹے رہے اور انہوں نے مینا کشی سے جسمانی تعلقات بھی قائم کر لئے ہیں تو وہ کچھ خلش سی محسوس کرنے لگے۔

''مینا کشی بخدا میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا بس جذبات کے ہاتھوں.....اُس نے اپنے پہلو میں موجود مینا کشی سے کہنا چاہا۔

''عارف صاحب! جلد یا بدیر یہ تو ہونا ہی تھا۔ یوں بھی بھارتی ''ناری'' جسے من سے اپنا دیوتا مان لے اُس کے ہر حکم کی اطاعت پجارن کی طرح کرتی ہے۔ بس میری ایک ہی التجا ہے اب آپ مجھے چھوڑ کر نہ جایئے.....اگر آپ کو بادل نخواستہ پاکستان جانا بھی پڑے تو واپس ضرور آیئے گا۔''

عارف نے اُس روز اپنی دانست میں پہلی مرتبہ کسی کو اپنا ہم راز بنایا اور حسن کو اس وارداتِ عشق سے آگاہ کر دیا۔ حسن نے اُس کی خلاف توقع حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اگر مینا کشی نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے تو کملیش کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

''یار یہ بڑے آزاد خیال لوگ ہیں اور تم مینا کشی کو بھی کوئی عام سی لڑکی نہ سمجھ لینا خدا جانے وہ عشق کی اندھی تمہارے جال میں کیسے پھنس گئی۔ بڑے بڑے رؤسا اُس سے دو باتیں کرنے کو ترستے ہیں۔ میاں! وہ غضب کی مصورہ ہے اور جلد ہی بڑی سرکاری افسر بننے والی ہے۔ اُس نے حال ہی میں کوئی بڑا زبردست مقابلے کا امتحان بھی پاس کیا ہے.....بڑے اثر و رسوخ والے لوگ ہیں عارف صاحب!'' اُس نے حسب عادت اپنی دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے ذرا سی چالاکی سے کام لیا تو نہ صرف کروڑ پتی بنو گے بلکہ مینا کشی ایسی خوبصورت لڑکی بھی تمہارے قابو میں آ جائے گی..... چوہدری عیش کرو عیش..... بس ذرا ہمارا خیال رکھنا۔''

عارف نے بالآخر واپس جانا تھا۔

لیکن.....!

روانگی سے تین چار روز پہلے ایک دن اچانک ہی مینا کشی نے اسے بتایا کہ وہ اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہے تو اُس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ اس روز حسن اور کملیش نے اُس سے شام کو بڑی اہم میٹنگ کی جس میں کملیش نے بتایا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں اور اگر عارف چاہیں تو مینا کشی سے خفیہ شادی کر لیں۔

عارف کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا.....دوسرے روز دونوں کسی ''مجسٹریٹ بہادر'' کو پکڑ لائے اور عارف کو بتایا کہ یہ فیملی کورٹ کے جج ہیں لیکن عدالت میں جانا مناسب نہیں تھا سو دونوں نے جج صاحبان کے سامنے میاں بیوی ہونے کا اقرار کر لیا۔ تین چار روز تک عارف کچھ رے اڑاتا رہا۔ ابھی ہنی مون نامکمل ہی

تھا کہ ''ویزہ'' مکمل ہو گیا۔

یہ نئی قباحت آن پڑی تھی۔

اس مرحلے پر وہ ایک لمحے کے لئے اپنی زوجہ محترمہ سے الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔اب کیا کیا جائے؟

''میرا ایک سکیورٹی والا دوست ہے اُس سے بات کرتے ہیں۔'' حسن نے رائے دی۔

''ٹھیک ہے۔''

سالے اور بہنوئی دونوں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سکیورٹی والا بھی آ گیا۔

اُس نے عارف چوہدری کا پاسپورٹ دیکھ کر انکشاف کیا کہ اُن کا ویزہ تو پچھلے ہفتے ختم ہو گیا ہے اور وہ غیر قانونی طور پر یہاں قیام پذیر ہیں۔اب کسی بھی لمحے جاسوسی کے الزام میں دھر لئے جائیں گے۔کیونکہ آج کل بھارتی حکومت ہر پڑھے لکھے پاکستانی پر یہی الزام عائد کر کے اُسے گرفتار کرتی ہے۔

''بھائی یہ تو غضب ہو جائے گا۔کچھ کرو میاں۔'' حسن اور کملیش دونوں نے اُس کی منت سماجت شروع کر دی۔

اس ڈرامے کا کلائمکس سین وہ تھا جب کملیش نے اچانک اپنی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر میز پر رکھ دیا۔

''شرما صاحب مجھے اپنی نہیں اپنی بہن کی فکر ہے۔اگر عارف صاحب یہاں گرفتار ہو گئے تو وہ خودکشی کر لے گی۔بھگوان کے لئے کچھ کیجئے۔''

فضا خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔

''دیکھئے کملیش صاحب آپ چونکہ معزز لوگ ہیں۔میں آپ کی صرف ایک مدد کر سکتا ہوں اور یہ بھی بتا دوں کہ اس میں ناں کی گنجائش نہیں۔سیدھی سی بات ہے آج کل یہ معاملہ عام چل رہا ہے۔عارف صاحب اگر ہمارے لئے تھوڑا بہت کام کرنے پر رضامند ہو جائیں تو ہم ان کے لئے دو تین پاسپورٹوں کا بندوبست کر دیں گے اور انہیں ویزے کی بھی کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔بس سال میں کچھ عرصہ پاکستان میں اور کچھ عرصہ بھارت میں گزار لیا کریں۔جب ان کا کام مکمل ہو گیا تو انہیں بھارتی شہریت بھی مل جائے گی۔بصورتِ دیگر اگر میں انہیں گرفتار نہیں کروں گا تو بھی یہ ضرور پکڑے جائیں گے اور پھر کم از کم پندرہ بیس سال جیل میں سڑتے رہیں گے۔آپ کو علم ہی ہے ہمارے ہاں جیوڈیشری کا کیا حال ہے اور میں آپ کو یہ مشورہ بھی دوں گا کہ ابھی اس شادی کو بھی خفیہ ہی رکھئے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' عارف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ٹھیک ہے شرما صاحب آپ کا بہت شکریہ کہ آپ اس آڑے وقت ہمارے کام آئے۔'' حسن نے شرما کا شکریہ ادا کیا۔

دو دن تک حسن، کملیش اور بینا کشی ٹھونک بجا کر اسے دیکھتے رہے کہ کہیں اُس نے وقتی طور پر تو یہ فیصلہ نہیں کیا۔

لیکن.....!

انہیں یقین ہو گیا کہ یہ عارف چوہدری نے جی جان سے کیا ہے اور وہ مکمل طور پر اُن کے جال میں پھنس چکے ہیں۔

تیسرے روز شرما، عارف کو لے کر چلا گیا حسن اور کملیش اُس کے ساتھ تھے لیکن وہ دونوں انتظار میں بیٹھے رہے۔ شرما، عارف کو اپنے ساتھ لئے اپنے دفتر میں آ گیا جہاں اُس نے عارف چوہدری کی کسی سے ملاقات کروانے کا اہتمام کر رکھا تھا اور انہیں سمجھایا تھا کہ وہ اس شہر کے رہنے والے اور اُن کے ''دوست'' ہیں۔ وہی آئندہ اُس کے معاملات کے انچارج ہوں گے۔

''بھائی میرے! سب یہی کر رہے ہیں۔ یہ ملک، مذہب، سب سالا فراڈ ہے۔ تمہارے ملک میں کیا اور میرے ملک میں کیا یہ سالے سیاستدانوں نے ہم سب کو گدھا بنا رکھا ہے اور اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اُس نے چار پانچ پاکستانی لیڈروں کے نام لے دیئے اور کہا۔ ''یہ سب لوگ کون ہیں؟ تم نہیں جانتے۔ یار جب تم جانتے ہو تو تمہاری حکومت کیسے نہیں جانتی اور اب تم جن صاحب کو ملو گے ان کو دیکھ کر تم بالکل کلیئر ہو جاؤ گے۔''

اتنا کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی اور مستعد گارڈ اندر آ گیا۔

''بھئی وہ خان صاحب آئے ہیں؟''

''سر وہ بڑے صاحب کے کمرے میں گپ شپ کر رہے ہیں۔''

''یار اُن سے کہو کبھی ہم چھوٹے صاحبوں کو بھی منہ لگا لیا کریں۔'' شرما نے ہنستے ہوئے کہا۔

''او کے سر!'' گارڈ واپس چلا گیا۔

''بھئی بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔ ہم تو اپنی کئی کام ان سے کرواتے ہیں۔''

ابھی اُس کی بات نامکمل ہی تھی جب دروازہ کھلا اور جو شخصیت اندر داخل ہوئی اُسے دیکھ کر عارف حیرت کے مارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

●●●

بابا صاحب

یہ پرویز خان تھا.....!

بنے بھائی کا دستِ راست اور عارف چوہدری کے حلقے کا ایم پی اے۔ اس کے شہر کا بچہ بچہ اس کے نام اور شکل وصورت سے آشنا تھا۔ عارف کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ شخص کتنے اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ اس کا تعلق جس تنظیم سے تھا اس کے حکم کے بغیر عارف کے شہر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ ایک سیاسی تنظیم کی ذیلی طلباء تنظیم میں پرویز کو ''دماغ'' کی حیثیت حاصل تھی۔

عارف جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور اب اُنہیں اس کی وجہ بھی سمجھ آنے لگی تھی۔

شرما انہیں دیکھ کر ادب سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''سر! یہ عارف چوہدری ہیں۔ ہمارے ''نئے دوست'' ہیں۔ وہاں آپ کے زیرِ سایہ رہ کر کام کریں گے۔'' اس نے عارف کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

پرویز خان نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بڑی گرمجوشی سے عارف سے مصافحہ کیا۔ شاید عارف اسے اپنے کام کا آدمی لگا تھا۔

اس کے بعد تعارف کا مرحلہ شروع ہوا اور پرویز نے عارف پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے گرید گرید کر اس کے لاشعور میں موجود تمام خدشات باہر نکال لئے تھے۔

''آؤ دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ تم ذرا وہ فلم لانا شرما۔'' پرویز نے شرما سے کہا اور عارف کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ جہاں آرام دہ کرسیوں کے علاوہ ٹی وی اور وی سی آر بھی رکھا تھا۔

''عارف صاحب، ہم لوگ بڑے کاز کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنی کمیونٹی کو دنیا میں ممتاز مقام دلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیالیس سال سے ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے حقوق کچلے جا رہے ہیں۔ جب ہم آواز بلند کرتے ہیں تو اُسے دبانے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کئے جاتے ہیں تم اس فلم سے اندازہ لگا لینا۔''

اس درمیان وہاں ایک خوبصورت خاتون چائے لے آئی۔

اس کے تعاقب میں شرما بھی آ گیا جس کے ہاتھ میں وڈیو فلم پکڑی ہوئی تھی۔ شرما نے وہ فلم وی سی آر میں لگا دی اور خود کام کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔

''عارف صاحب یہ فلم نقلی نہیں بالکل اصلی ہے تم خود اندازہ کر سکتے ہو۔ اسے دیکھو تو شاید تم بہتر اندازہ کر سکو کہ ہم غلط ہیں یا صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔''

پرویز نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔
فلم شروع ہوگئی تھی۔
یہ کسی این جی او کی تیار کردہ فلم رپورٹ تھی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ حکومت بطور خاص ان سے زیادتی کرتی آئی ہے اور اب ان کی نسل کشی پر تلی ہے۔ اس فلم کے ایک منظر میں اس تحریک سے متعلق لوگوں کی آبادی پر حملے کا منظر دکھایا گیا تھا۔ حملہ آوروں کی شناخت تو نہیں ہوئی تھی البتہ کہا گیا تھا کہ یہ سرکاری پشت پناہی کے حامل غنڈے ہیں۔ یہ منظر بڑا اندوہناک تھا جس میں اس تحریک سے متعلق بچوں کے قتل کے مناظر دکھائے گئے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ سارا خونی کھیل اُن کی نسل کشی کے لئے رچایا جا رہا ہے اور اب بھی وہ لوگ غفلت کی نیند سوئے رہے تو پھر شاید قیامت تک اس نیند سے بیدار نہ ہو سکیں۔
اب تو عارف کو بھی اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی اُن کی قوم کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔
''تم یہاں ایک ہفتے کی تربیت مکمل کر لو پھر پاکستان آنا جانا لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ زندگی میں کبھی عالمِ دیوانگی میں بھی تمہارے منہ سے یہ بات نہ نکلے کہ میری اور تمہاری ملاقات اس سے پہلے کہیں ہوئی ہے۔'' پرویز نے کہا۔
عارف کے ارادے میں اگر کوئی کمزوری رہ بھی گئی تھی تو مینا کشی نے ایک ہی رات میں پوری کر دی۔ اُس نے عارف پر جنسیت کا مکمل جادو چلا دیا تھا اور اب وہ شراب، شباب اور دولت کے ایسے سنہرے جال میں پھنس گیا تھا جہاں سے اس کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔
دہلی ہی کے علاقے ''وسنت ویہار'' میں واقع کیمپ میں اُسے تربیت دی گئی۔ عارف اور اُس جیسے کچھ اور نوجوان بھی موجود تھے۔ ان لوگوں کو سختی سے اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا مکمل تعارف کسی کو نہیں کروائیں گے۔ اپنا صحیح نام کسی کو نہیں بتائیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں کریں گے جو اُن کی شناخت میں مدد دے سکے۔

✹

اس کیمپ میں اُن کا انچارج سجاول تھا.....!
کیپٹن مالک رام کو سجاول کا Cover Name دیا گیا تھا جس نے عارف کو ایک ہفتے میں تخریب کاری کے اچھے خاصے داؤ پیچ سکھا دیئے تھے۔
اس ایک ہفتہ کے ہنگامی پروگرام میں اُنہیں جلسہ گاہوں میں ہنگامہ کرنا، توڑ پھوڑ، بلوہ، لوٹ مار، دہشت گردی، آگ لگا کر بھاگنا اور پولیس کے حفاظتی اقدامات کو توڑنے کی تربیت دی گئی تھی۔
مینا کشی اس درمیان اُس پر جسمانی طور پر نچھاور ہو ہو جاتی تھی۔ شراب اس کی عادت بن گئی تھی اور اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔
''را'' کی ہدایت پر اگلے چند روز بعد وہ دل پر پتھر رکھ کر پاکستان آ گیا۔
پاکستان آنے پر اُسے ایک خطیر رقم دی گئی جو سامان برائے فروخت وہ یہاں سے لے جا رہا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔

پاکستان میں اُسے بنے بھائی سے رابطہ کرنے کی ہدایت دی گئی تھی اور یہ بھی باور کروادیا گیا تھا کہ اب وہی اس کا ''باس'' ہے۔جس کا ہر حکم بلاچوں وچراں اُس نے ماننا ہے۔پاکستانی کسٹم پر بنے کے لوگ اس کے منتظر تھے۔اس کا سامان بغیر چیکنگ کے کلیئر کر دیا گیا۔

اگلے چند روز بعد عارف چوہدری بنے بھائی کے ڈیرے پر موجود تھا۔بنے بھائی کے کارندے نے اُس کا سامان اس کی مرضی سے بہتر قیمت پر خریدا اور اُسے بنے بھائی سے ملنے کی ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

عارف کے والد صاحب اگلے بیس سال زندہ رہ کر بھی اتنے پیسے نہ کماتے جتنے اُن کے صاحبزادے نے اس ایک ڈیڑھ مہینے میں کما لئے تھے۔انہوں نے ایک دو مرتبہ دبی زبان سے احتجاج کیا۔

دو جوان بیاہنے لائق بیٹیوں کو دیکھ کر پھر مجرمانہ سی خاموشی اختیار کر لی۔

عارف چوہدری کی امی نے البتہ اُس کی خوب بلائیں لیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُن کے بیٹے کو بھی بہنوں اور بوڑھے باپ کا خیال آیا اور اُس نے کمائی کی طرف دھیان دیا۔عارف چوہدری کے ابا اگلے چند سال بعد ریٹائر ہو جاتے اور ان کا مستقبل مکمل تاریک ہو جاتا۔

●

بنے بھائی سے عارف کی ملاقات اگلے روز اُن کے دولت کدے پر لاہور کی ماڈرن آبادی میں ہوئی تھی۔ انہوں نے عارف چوہدری کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کو بطور خاص اس بات کی نصیحت کی تھی کہ وہ کسی کو کانوں کان اس بات کی ہوا نہ لگنے دے کہ بھارت میں اس نے کیسا وقت گزارا۔

انہوں نے شام کو اپنے گھر پر ہونے والی میٹنگ میں تنظیم کے نوجوان ونگ کو مدعو کر رکھا تھا جن کے سامنے بنے بھائی نے عارف کا تعارف کروایا،انہیں تنظیم کے خصوصی ونگ میں ذمہ داری سونپی تھی۔

اس خصوصی ونگ کا تعلق تنظیم کے اعلیٰ عہدیداروں سے رہتا تھا اور عام ورکرز کو بھی ان کی سرگرمیوں کا کچھ خاص علم نہیں تھا۔

ایک بات پر البتہ وہ سب اتفاق کرتے تھے کہ جب بھی تنظیم پر کوئی مشکل وقت آتا تو اس کا خصوصی سکواڈ متحرک ہو جاتا اور چند گھنٹوں میں نتائج بدل کر رہ جاتے۔

بنے بھائی نے تیسرے ہی روز عارف چوہدری کو کچھ نوجوانوں کے ساتھ شہر کی مشہور جلسہ گاہ کی طرف روانہ کر دیا۔ان لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہاں ہونے والے مخالف سیاسی جماعت کے جلسے کو اُلٹانا اور خاصی گڑبڑ پھیلانا اُن کا مشن ہے۔

اس مقصد کے لئے انہیں خاص قسم کے پٹاخے دیئے گئے تھے۔

عارف نے پہچان لیا کہ یہ پٹاخے کہاں سے آئے ہیں؟دوران تربیت انہوں نے ایسے پٹاخے بنانے اور چلانے کی تربیت حاصل کی تھی۔

''اس پارٹی کی کمان عارف چوہدری کے ہاتھ میں ہوگی۔'' بنے بھائی نے انہیں مطلع کیا۔

یہ عارف چوہدری کا پہلا باقاعدہ جرم تھا جو اس نے اپنے ملک کی سالمیت کے خلاف کیا۔

عارف نے تخریب کار گروپ کو اپنی تربیت کے مطابق منظم کیا اور یہ لوگ دو دو کے گروپ میں جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

یہ جلسہ اس جماعت کا تھا جو مستقبل میں کبھی اس تحریک کے لئے مسائل پیدا کر سکتی تھی اور تحریک کے سربراہوں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ تحریک کے لئے پیدا ہونے والے ''مسائل'' سے بہر صورت نجات حاصل کریں گے۔ عارف نے اپنے ساتھیوں کو ایک خاص تکنیک کے مطابق چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ جیسے ہی مرکزی لیڈر کی تقریر کا آغاز ہوا عارف نے جو بڑی ہوشیاری سے نعرے لگاتا سٹیج کے نزدیک پہنچ گیا تھا اور بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے وہ اس سیاسی جماعت کا، جس کا یہاں جلسہ ہو رہا ہے، بڑا جانثار اور خصوصی ورکر ہے..... سٹیج کے گرد موجود محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ایک پٹاخہ سٹیج کے نیچے لڑھکا دیا۔

سٹیج کے محافظ جن کی ساری توجہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے بلند کرنے پر مرکوز تھی اس حرکت کا نوٹس نہ لے سکے۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہاں ہڑبونگ مچ گئی۔

یہ ایک طرح کا سگنل تھا جو عارف کے ساتھیوں کو ملا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا اور افراتفری میں جب ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر دامن گیر تھی جلسہ گاہ کے مختلف کونوں میں ایسے پٹاخے چلانے شروع کر دیئے۔

ایک قیامت صغریٰ چار سو برپا ہو گئی۔

جلسہ کے حاضرین جن کی تعداد ہزاروں میں تھی بدنظمی اور بے ترتیبی سے جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو کچلنا شروع کر دیا اور درجنوں لوگ تو ایک دوسرے کے نیچے آ کر زخمی ہو گئی۔

عارف نے بھاگتے ہوئے فائرنگ کی آواز بھی سنی تھی۔ یہ فائرنگ ان کی پلاننگ میں شامل نہیں تھی۔ اس بات کا علم تو انہیں بعد میں ہوا کہ کسی نے سٹیج کے قریب سے فائرنگ کر کے سٹیج پر موجود ایک اہم سیاسی شخصیت کو ہلاک کر دیا تھا۔

اس ہلاکت کی خبر جیسے ہی شہر میں پھیلی اک ہنگامہ چار سو برپا ہو گیا۔ جنے بھائی کے لوگوں نے ایک منظم سازش کے تحت شہر میں غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور اگلے روز اخبارات کی چیختی چلاتی سرخیاں بربادی شہر اور بے گناہوں کی ہلاکت کے واقعات سے بھری پڑی تھیں۔

یہ عارف چوہدری کا آغاز تھا۔

اس بات کا علم انہیں بعد میں ہوا کہ اس گروپ میں بہت سے نوجوانوں نے اُن کی طرح بھارتی کیمپوں میں تربیت حاصل کی تھی۔

لیکن.....!

اُن میں سے کسی کو دوسرے کو بتانے کا حکم نہیں تھا۔ اس تنظیم میں رازداری کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور پابندی نہ کرنے کی صورت میں اتنی بھیانک سزا ملتی تھی

جس کا تصور ہی بڑا جان لیوا ہوتا۔

عارف کو اس مرتبہ ایسی ہی ڈیوٹی سونپی گئی تھی۔

اس بہانے اس کا تعارف تنظیم کے اس تفتیشی سنٹر سے بھی ہو گیا تھا جس کی اس سے پہلے اس نے صرف کہانیاں سنی تھیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ بہت کم خوش نصیب یہاں سے زندہ واپس جاتے ہیں۔ یہاں صرف دو قسم کے لوگ آتے تھے۔

مغلوب اور غالب۔

غالب تو وہ تھے جو تنظیم کے سربراہ ''بابا صاحب'' کے منظورِ نظر ہوئے اور مغلوب وہ جن پر تشدد کے پہاڑ توڑنے کے لئے انہیں یہاں لایا جاتا۔

اس تشدد کی نگرانی جسے تفتیش کہا جاتا تھا عموماً تنظیم کے بڑے خود کرتے تھے۔

لیکن.....!

اس طرح کہ نہ تو تشدد کرنے والوں کو علم ہوتا نہ ہی تشدد برداشت کرنے والوں کو..... دونوں کو صرف احکامات کی پابندی کرنی ہوتی تھی۔ تنظیم کے بڑے ملحقہ کمرے میں ایک بڑی ٹی وی سکرین پر یہاں وقوع پذیر خونی ڈرامے کی مکمل کارروائی دیکھتے تھے اور بطورِ خاص اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کہیں تشدد کرنے والے کے دل میں مغلوب کے لئے نرم گوشہ تو موجود نہیں۔

انسانی فطرت کے اس خاص پہلو پر ان لوگوں کی نظر ضرور رہتی تھی کیونکہ عموماً بے رحمی سے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے کہ پتھر دل پگھل پگھل جاتے تھے۔ کیونکہ ''رحم'' نام کا کوئی بھی لفظ تنظیم کی ڈکشنری میں موجود نہیں تھا۔

عارف گزشتہ دو ماہ سے تنظیم کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے پابندی کر رہا تھا اس کی وجہ پہلے پہل تو مینا کشی کا عشق رہی ہو گی لیکن اب یہ اس کی عادت اور ضرورت بن گئی تھی۔ تنظیم میں اہم مقام حاصل کرنے والوں کے لئے دولت، عزت، شہرت اور عیاشی کے دروازے بڑی تیزی سے کھلتے تھے اور وہ بہت جلد سوسائٹی میں وی آئی پی کا مقام حاصل کر لیا کرتے تھے۔

یہ اُس کی خوش قسمتی کی انتہا تھی کہ محض دو ماہ بعد ہی اسے ''بابا صاحب'' سے خصوصی ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا تھا ورنہ تنظیم کے ہزاروں جانثار اُن کی قدم بوسی کی حسرت دل میں لے کر ہی مر جایا کرتے تھے۔ عارف جانتا تھا کہ تنظیم کے ہزاروں نوجوان اپنے ''بابا صاحب'' کے ایک حکم پر گردن ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر سکتے تھے۔

''بابا صاحب'' کو تنظیم میں ایک پُراسرار روحانی پیشوا کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی گو کہ وہ سیاسی لیڈر تھے لیکن ان کے پیروکاروں کا ایمان تھا کہ وہ پُراسرار قوتوں کے مالک ہیں جن کے بل بوتے پر وہ بڑے بڑے حکومتی عہدے داروں کو اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔

بنے بھائی عارف کو "بابا صاحب" سے ملانے کے لئے لائے تھے۔

"صاحبزادے خوش قسمت ہو۔ بابا صاحب سے ایک مرتبہ ملاقات کا مطلب ہے عمر بھر عیاشی۔ محض ایک ملاقات سے تمہیں تنظیم میں وہ مقام حاصل ہو جائے گا جو بڑے پرانے ورکروں کو حاصل نہیں ہوتا حالانکہ انہوں نے تنظیم کے لئے بے شمار جانی اور مالی قربانیاں بھی دی ہیں۔" بنے بھائی نے اُسے راستے میں سمجھایا۔

"مجھے وہاں کرنا کیا ہوگا۔" عارف نے پوچھا۔ اس نے ابھی سے اپنے ذہن پر بابا صاحب کو مسلط کر لیا تھا۔

"کچھ نہیں، بس سلام کر کے عقیدت سے بیٹھ جانا۔ اُن کی باتیں سننا، میاں بڑے نصیب والے ہو۔ اُن کی چند منٹ کی صحبت کے لئے بڑے بڑے حکمران ترستے ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو چیف منسٹر کو بھی ملاقات کے لئے کتنا ایڈوانس وقت لینا پڑتا ہے۔ جانے کتنی درخواستوں کے بعد بابا صاحب اس کے لئے پندرہ بیس منٹ نکالتے ہیں۔ خبردار! کوئی سوال نہیں کرنا۔ بس عقیدت سے اُن کی باتیں سر جھکا کر سنتے رہنا۔ پاس ادب رہے۔ آداب محفل کا تقاضا ہے کہ بابا صاحب کی آنکھوں سے آنکھیں زیادہ دیر تک دوچار نہ ہوں..... سمجھ گئے ناں بس یہ سمجھ لو اور اگر تم نے انہیں متاثر کر لیا تو مینا کشی یہاں تمہارے پاس آ گئی۔"

بنے بھائی نے آخری فقرہ کہہ کر گویا ترپ چال چل دی تھی۔

اس تنظیم کے کرتا دھرتا جہاں شیطان کے چیلے چانٹے تھے وہاں کمال کے ماہر نفسیات بھی ہوتے تھے اور انسانی کمزوری کو ایکسپلائٹ کرنے کے فن پر انہیں کمال حاصل تھا۔ نوجوانوں کی کمزور نبضوں کو ایک ایک کر کے یہ کمبخت اتنی مہارت اور معصومیت سے دباتے تھے کہ وہ ان کے ایک اشارے پر ذبح ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔

بابا صاحب کا مکان اس شہر کے عام سے مکانوں کی طرح تھا۔

لیکن.....!

بظاہر ایسا نظر آتا تھا، حالانکہ حقیقت میں یہ مکان ایسا قلعہ تھا جس تک باقاعدہ فوج بھی معرکہ سر کرنے کے بعد ہی پہنچ سکتی تھی۔ اس محلے میں جہاں بابا صاحب قیام پذیر تھے جتنے بھی مکان تھے ان پر عملاً تنظیم کا قبضہ تھا۔ بادی النظر میں تو یہ لوگ عام شہری تھے لیکن حقیقت میں تربیت یافتہ دہشت گرد۔

ان سیدھے سادھے شہریوں کے گھروں میں دنیا کا جدید ترین اسلحہ موجود رہتا تھا اور کسی ایجنسی کو اس طرف پھڑکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس محلے میں ہوا ان کی اجازت کے بغیر نہیں گزر سکتی تھی۔

بابا صاحب کے مکان سے دو دو تین تین کلومیٹر دور تک اُن کی حفاظتی انٹیلی جنس کا جال بچھا تھا۔ کیا مجال جو اُس طرف آنے والی ٹریفک میں کوئی عام شہری ہو۔ یہاں سے گزرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان انتظامات کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا کہ اصلیت سے بے خبر کوئی بھی شخص کبھی یہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا اور وہ یہی سمجھتا تھا

کہ یہ سارا بابا صاحب کے خلاف پروپیگنڈہ ہے جو ایک معمولی سے مکان میں قیام پذیر تھے۔

آج تک ایسا بہت کم ہوا تھا کہ بابا صاحب خود کسی اعلیٰ افسر عہدے دار سے ملنے کے لئے گئے ہوں۔ جس کسی کو اُن سے ملنا ہوتا وہ خود اُن کی رہائش گاہ پر آ کر اُن سے ملاقات کرتا تھا۔

کسی حکومتی عہدیدار تک اگر بابا صاحب کا حکم پہنچ جاتا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں تو اس کی مجال نہیں تھی کہ ملاقات سے انکار کی جرأت کرتا۔ اپنے تمام کام ادھورے چھوڑ کر وہ بابا صاحب کی قدم بوسی کو بھاگا چلا آتا تھا۔

●

بنے بھائی کے ساتھ کار میں سوار جب عارف چوہدری یہاں پہنچا تو اس نے خاص طور سے اندازہ لگا لیا تھا کہ بابا صاحب کی سکیورٹی کے انتظامات کسی سربراہ مملکت سے کم ہرگز نہیں تھے حالانکہ یہ جال بڑی معصومیت سے بنا گیا تھا۔

لیکن.....!

بھارتی انٹیلی جنس کے کیمپ میں محض ایک ہفتے کی تربیت نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ دونوں مکان کے مین گیٹ سے گزر کر اُس کمرے تک پہنچ گئے جسے ملاقاتیوں کا کمرہ کہا جاتا تھا۔

یہ کمرہ خواتین اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

بنے بھائی کو دیکھتے ہی قریباً سبھی ملاقاتی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بنے بھائی اُن سب کی طرف مصنوعی مسکراہٹ اُچھالتے عارف کا ہاتھ تھامے بغلی کمرے میں جا گھسے جہاں بابا صاحب کی سیکرٹری اور ایک خادم بیٹھے تھے۔

بنے بھائی کی شکل پر نظر پڑتے ہی سیکرٹری کے ہونٹوں پر ترغیب آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے عارف چوہدری کی طرف دیکھ کر ہونٹوں کو ایک خاص انداز سے سکیڑا اور جسم کو جھٹکا دے کر سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔

''کیسا چل رہا ہے.....؟'' بنے بھائی نے خاتون کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''ایک دم شاندار ہے بھائی..... آپ کی رعایا ہیں۔ بس ذرا خیال رکھا کیجئے ہمارا۔''

اُس نے اپنے جسم اور دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی ان سے تو مل لو..... عارف چوہدری ہمارے خاص آدمی ہیں۔ بڑے کام کے بندے ہیں۔ اگر کبھی اکیلے بھی آئیں تو ان کا کام فوراً ہو جانا چاہئے۔''

بنے بھائی کے منہ سے جیسے ہی یہ بات نکلی تو خاتون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''باندی کو رخسانہ کہتے ہیں۔ کبھی کوئی حکم ہو تو ضرور یاد فرمایئے گا..... آپ ایسے نوجوانوں کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔'' رخسانہ نے اس کا ہاتھ کچھ ایسے انداز سے دبایا تھا کہ خواہ مخواہ عارف چوہدری جذباتی ہونے لگا۔

''اچھا اب چھوڑو انہیں اور بابا صاحب کو مطلع کرو۔'' بنے بھائی نے اُسے مخاطب کیا۔

''جیسے آپ کی مرضی بنے بھائی۔''

رخسانہ نے کہتے ہوئے انٹرکام پر بابا صاحب کو بنے بھائی اور عارف کی آمد سے مطلع کیا۔

''بھیج دو۔'' انٹرکام پر جواب ملا۔

''جایئے جناب! بڑے خوش نصیب ہیں آپ۔ نام سنتے ہی بابا صاحب نے بلا لیا۔'' رخسانہ نے اس کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

''شکریہ!'' عارف نے بھی اس کی اُمید کے مطابق ہی جواب دیا تھا۔

دونوں ملحقہ دروازے سے جس کمرے میں داخل ہوئے وہ بالکل معمولی سا کمرہ تھا۔ سامنے ایک کرسی پر بابا صاحب براجمان تھے اور دائیں بائیں کچھ اور پارٹی کے لوگ موجود تھے۔

بنے بھائی کو دیکھ کر بابا صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور انہوں نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بنے بھائی کی تقلید میں عارف نے بھی عقیدت سے اُن سے ہاتھ ملایا اور اُن کے گھٹنوں کو چھو کر بنے بھائی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''آپ لوگ اب چلئے۔'' بابا صاحب نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا۔

تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور فرشی سلام کر کے اُلٹے قدموں کمرے سے باہر چلے گئے۔

''کیسے ہو بنے بھائی، یہ نوجوان وہی ہے۔'' بابا صاحب نے دریافت کیا۔

''جی بابا صاحب! غلام ہے آپ کا..... آپ کا جانثار ہے۔ اس کو آپ کی خصوصی شفقت درکار ہو گی۔'' بنے بھائی نے سر جھکا کر کہا۔

''بھئی تمہاری بڑی تعریف کی ہے بنے بھائی نے..... اور ہم ان کی کوئی بات ٹالا نہیں کرتے۔ بس اسی طرح جی جان سے کام کرتے رہو ساری زندگی عیش کرو گے۔'' بابا صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جو حکم بابا صاحب۔'' عارف نے جواب دیا۔

''اسے آستانے پر لگا دو۔'' بابا صاحب نے بنے بھائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب۔ جو حکم۔'' بنے بھائی بولے۔

''دیکھو عزیزی! اب تم تنظیم کے انتہائی اہم حلقے میں شامل ہونے جا رہے ہو۔ ایک بات کا خیال رکھنا کہ ہماری بقاء کا راز ہماری رازداری میں ہے۔ اس تنظیم میں آنے کے بعد ہم سب کو سختی سے ایک نظم کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ جس نے بھی اس نظم سے نکلنے کی کوشش کی یا اس کے کسی اصول کو توڑا اُسے نیچرلی سخت سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ بسا اوقات جان سے ہاتھ بھی دھونے پڑتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کسی ایک کی غلطی کا مطلب ہے اجتماعی موت۔ ہمیں یہ سودا نیچرلی منظور نہیں ہوگا۔ اگر تم میری جگہ پر ہو تو تم بھی یہ نہیں چاہو گے کہ ایک کارکن کی غلطی سے ہم سب کی جانیں داؤ پر لگ جائیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اس ساتھی کو خودکشی کا موقع دیں۔ اگر وہ خود ایسا نہ کرے تو ہم یہ کارِ خیر انجام دیتے ہیں۔ یوں بھی ہمیں شہیدوں کی ضرورت رہتی ہے۔ جب ہم نے اپنا سب کچھ تنظیم کے لئے قربان کرنے کا عہد کر لیا ہے اور اپنی جان بھی تنظیم کے نام کر دی ہے تو پھر ہم ایک باعزت موت سے انکار کیوں کریں.....؟ مرنا تو ایک دن سب نے ہے لیکن تنظیم کی فلاح کے لئے مارے جانے یا مر جانے والے کو ہم ممتاز مقام دلاتے ہیں..... میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ کسی کارکن کی غلطی کو اس لئے بھی کبھی معاف نہ کرنا کہ اس کا نقصان ہم سب کو ہوگا۔ اس اکیلے کو نہیں..... تم سمجھدار نوجوان ہو میری باتوں کا مطلب جان گئے ہو گے۔''

بابا صاحب نارمل لہجے میں بات کر رہے تھے۔

لیکن.....!

ایک برقی لہر اس دوران عارف چوہدری کے جسم میں سنسناتی رہی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہم نے بہت دکھ اُٹھانے کے بعد اپنے موجودہ نظریات پر اتفاق کیا ہے۔ تم نے دیکھا اس ملک کی سیاست ہمارے اشاروں پر سیاست دانوں سمیت بندر کی طرح رقص کرتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ مرکز سے حکمران ہماری قدم بوسی کے لئے اس کٹیا میں آتے ہیں اور بالکل ایسے ہی بیٹھتے ہیں جیسے تم اور بنے بھائی بیٹھے ہو..... جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے..... اس کی واحد وجہ ہے ہماری بے لچک پالیسی اپنے اور غیروں کے معاملے میں ہم کم از کم اپنے مخالفین کا وجود برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نہ اپنے اندر نہ اپنے باہر۔ جس نے ہمارے نظریات سے انحراف کیا ہم اُسے جہنم رسید کر دیتے ہیں اور تم نے بھی یہی کام کرنا ہے۔ ہائی کمان کے احکامات کی تعمیل کرتے رہو ساری دنیا کی عیاشیاں باندیوں کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہوں گی..... بس اب تم جاؤ۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے بابا صاحب نے ہندو براہمنوں کی طرح ہاتھ کھڑا کر دیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ واپس لوٹ جائیں۔

***

آستانہ

عارف کو اگر بنے بھائی نہ بھی کہتا تو بھی ان کے لئے بابا صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ گہرے رنگ کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی اُن کی آنکھوں سے نجانے کون سی برقی لہریں نکلتی تھیں جو سیدھی مخاطب کے دل و دماغ میں اُترتی اور اسے زیر کرتی چلی جاتی تھیں۔ دونوں پہلے والوں کی طرح اُٹھ کر فرشی سلام کر کے اُسی طرح اُلٹے قدموں پر چلتے اُسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں رخسانہ اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک کو منہ پر گرا کے ان کی واپسی کی منتظر تھی۔

''چائے حاضر ہے۔'' اُس نے بنے بھائی کے بجائے براہِ راست عارف کو مخاطب کیا۔

''پی لو میاں۔ قسمت کے دھنی ہو جو پہلی ہی ملاقات میں رخسانہ کے ہاتھوں کی چائے پی رہے ہو۔ ہمیں دیکھ لو، جانے کب سے ان کے ہاتھوں کی بنی چائے پینے کو ترس رہے ہیں۔ چلو آج تمہارے بہانے ہم بھی سرخرو ہو جائیں۔'' بنے بھائی نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس جانے دیجئے بنے بھائی! یونہی بناتے نہ رہا کیجئے۔ مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا آپ کو اور آپ کی باتوں کو۔ باتیں بنانا تو کوئی بنے بھائی سے سیکھے۔ کیا مجال جو گزشتہ دو ماہ سے کبھی کوئی خیر خبر لی ہو..... بس دو موٹی ساڑھیاں کیا بھیج دیں گلے شکوے شروع ہو گئے..... رخسانہ نے عارف پر قریباً جھکتے ہوئے چائے بنا کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

ایسے ہی اللّے تللّے دکھا کر مینا کشی نے انہیں قابو کیا تھا اور یہی کچھ اب اس کے ساتھ رخسانہ کرنے جا رہی تھی۔

''اری یہی تو بتانے آیا ہوں عارف سے دوستی کر لو ان کا بھی آنا جانا اب لگا رہے گا۔ اِدھر بھی اور اُدھر بھی۔'' بنے بھائی نے آنکھ دبا کر کہا۔

''ٹھیک ہے ہمارا کون سا زور لگتا ہے۔'' کہتے ہوئے رخسانہ نے ایک مرتبہ پھر عارف کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا دیا۔

پندرہ بیس منٹ تک غیر سنجیدہ گفتگو کرنے کے بعد رخسانہ نے اپنی میز کا دراز کھولا اور ایک بند لفافہ عارف کی طرف بڑھا دیا۔

''بابا صاحب کی طرف سے تحفہ ہے۔''

''لے لو۔'' بنے میاں نے سنجیدگی سے کہا۔

عارف نے لفافہ پکڑتے ہوئے ''شکریہ!'' کہا اور سلام کر کے بنے بھائی کے تعاقب میں باہر نکل آیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ اُس پر ہجوم کمرے سے گزرے تھے جہاں اب تک تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں بچی تھی۔

ایک مرتبہ پھر بنے بھائی کو عورتوں مردوں نے چیخ چیخ کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ بنے بھائی ان سے آنکھیں ملائے بغیر دانت نکالتے ہوئے عارف کے ساتھ باہر نکل آئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بنے بھائی کے ٹھکانے کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔

●

''یہ ہے تمہارا نیا پاسپورٹ ویزے سمیت..... تمہاری ڈیوٹی اب بابا صاحب کے حکم سے آستانے پر لگا دی گئی ہے۔ اس کی اہمیت تمہیں معلوم ہے۔ اب تمہارا شمار تنظیم کے خاص لوگوں میں ہونے لگا ہے اور تمہیں ''خاص کام'' کرنے ہوں گے۔ موجودہ کام سے فراغت پر تم بھارت یاترا کے لئے نکل جاؤ۔ بابا صاحب کے حکم سے وہاں ایسا بندوبست ہو جائے گا کہ تم اپنی محبوبہ کو مستقل یہیں لے آؤ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ تنظیم سے متعلق معاملات میں ہم صرف ہاتھوں کا استعمال کرتے ہیں۔ دل اور دماغ کا نہیں..... جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی ہے بہر صورت..... خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

بنے بھائی نے اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر پاسپورٹ اُسے تھماتے ہوئے کہا۔ یہ پاسپورٹ کسی دوسرے نام سے بنایا گیا اور نمبر دو تھا۔

''یہ جبار ہے۔'' بنے بھائی نے اس درمیان خاموشی سے اندر آنے والے نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا..... آج سے تم اسے اپنا مستقل ساتھی سمجھو۔ تم دونوں مل کر آپریشن پلان کیا کرو..... ہمیں صرف اپنی ڈیمانڈ بتاؤ..... جس علاقے کے پولیس سٹیشن کو قابو کرنا ہے اس کا نام بتاؤ اور جس پولیس افسر سے شکایت ہے وہ بتاؤ۔ یہ کام ہم کیا کریں گے باقی کام تمہیں کرنا ہیں۔'' بنے بھائی کی آنکھوں میں ناچتی وحشت اب اُن کے منحوس چہرے پر بھی اُتر آئی تھی۔ اسے پہچان لو۔'' اس نے ایک تصویر عارف کی طرف بڑھائی۔

یہ تیس پینتیس سالہ ایک نوجوان کی تصویر تھی جس نے کسی سرکاری محکمے کی وردی پہن رکھی تھی اور شکل و شباہت سے غیر مقامی لگتا تھا۔

''ٹھیک ہے بنے بھائی۔'' کہتے ہوئے عارف نے تصویر جبار کی طرف بڑھا دی۔ ''اسے آستانے پر پہنچانا ہے۔ اس کا دماغ درست کرنا ہے۔ ہم نے اس سالے سے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنا تبادلہ کروا کر کسی دوسرے شہر میں چلا جائے۔ لیکن اس نے بجائے ہمارا حکم ماننے کے اُلٹا ہمارے ایک ورکر کو اندر کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو گالیاں دیں۔ اگر وہ جیتے جی ہماری بات مان لے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی چھٹی کروا دینا۔''

بنے بھائی نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بنے بھائی۔'' عارف نے ہونقوں کی طرح گردن ہلا دی۔

''یہ ہے دوسری تصویر۔'' بنے بھائی نے تصویر عارف کی طرف بڑھائی۔ جبار کو علم ہے اس کا۔ یہ اس کی بہن ہے۔ سالے نے میٹریکولیٹ کر کے اسے داخلہ بھی دلوا دیا ہے۔ عارف اسے ''مثالی کیس'' بنا دو۔ آئندہ کوئی غیر مقامی ہمارے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہ کر سکے۔''

اپنی بات کے خاتمے پر بڑے بھائی نے بڑا ہولناک قہقہہ بلند کیا تھا۔ اس میں جبار نے بھی اس کا پورا ساتھ دیا اور عارف چوہدری کو بادل نخواستہ اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ سب وحشی ہو گئے تھے۔ انسانوں کی بجائے درندے دکھائے دے رہے تھے۔

عارف کو پہلے آستانے کی سیر کروا دو۔'' بڑے بھائی نے جبار سے کہا۔

''جو حکم جناب۔'' جبار نے سر تسلیم خم کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کے ایڈریس اور ممکنہ ٹھکانے معلوم کر کے آستانے کی طرف جا رہے تھے۔

یہاں سے تفتیشی مرکز کا فاصلہ بمشکل تین چار میل تھا۔ ایک بلڈنگ کے تہہ خانے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ بلڈنگ بطور خاص تعمیر کروائی گئی تھی جس کی اوپر منزل میں تنظیم کے مسلح ونگ کے لوگ موجود رہتے تھے جنہیں ''رضا کار'' کہا جاتا تھا۔ ان ظالموں نے یہاں ابتدائی طبی امداد کی تین چار ویگنیں بھی جمع کر رکھی تھیں اور بظاہر یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ تنظیم کا ابتدائی طبی امداد کا مرکز ہے جہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

یہاں روزانہ درجنوں مریض لائے اور لے جائے جاتے تھے۔ ان میں کتنے بدنصیب تھے اور کتنے خوش نصیب۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

مسیحائی کی آڑ میں یہاں درندگی کا جو ننگا ناچ ہو رہا تھا کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ جبار عارف چوہدری کو سیدھا یہیں لے آیا تھا۔

تنظیم کے ''طبی ونگ'' نے ان کا استقبال کیا اور انہیں آستانے کے سربراہ کی حیثیت سے دورہ کروانے لگے۔ اوپر کی منزلوں میں تو واقعی دس پندرہ مریض زیر علاج تھے اور ایک آپریشن تھیٹر بھی موجود تھا۔ اب وہ عارف کو لے کر تہہ خانے میں جا رہے تھے۔

●

جاری ہے...

تہہ خانے کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو لوہے کی مضبوط سلاخوں والے دروازے سے بند کیا گیا تھا اور تاریک دیا گیا تھا جیسے نیچے ادویات اور ضروری اشیاء کا سٹور ہے۔ یہ تہہ خانہ چار کمروں پر مشتمل تھا۔

ایک کمرے میں تو ادویات اور دوسری ضروری چیزیں رکھی گئی تھیں جبکہ اُس سے ملحقہ تینوں کمرے تفتیشی مرکز کہلاتے تھے۔ ان میں دو کمروں میں زیر تفتیش مجرموں کو رکھا جاتا تھا اور تیسرے کمرے میں اُن پر تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ اس مرکز کا نگران گزشتہ دنوں پولیس مقابلے میں اپنی غلطی سے مارا گیا تھا۔ اس نے ضرورت سے زیادہ شراب چڑھا رکھی تھی اور پولیس کو للکارنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے بعد عارف کو ہنگامی بنیاد پر یہاں کا چارج کچھ دنوں کے لئے دیا گیا تھا جس کے بعد کسی اور نے یہاں ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔

یہاں کا اصول تھا کہ جس کا ''کیس'' ہوتا وہی اپنے کیس کا انچارج ہوتا تھا۔ اب جو کارنامہ عارف انجام دینے جا رہا تھا اُس کی تفتیش وہ اپنی نگرانی میں کراتا جس کے بعد اسے منظر سے ہٹ جانا تھا۔ ''آستانے'' پر تفتیش کے خصوصی آلات رکھے گئے تھے اس لئے تنظیم کی طرف سے عموماً یہاں کسی نہ کسی مجرم کو لا کر تفتیش کرنے کی فرمائش ہوتی رہتی تھی۔ یہاں ایڈوانس بکنگ کروانی پڑتی تھی اور ہفتوں بعد باری آتی تھی۔

اس وقت بھی یہاں ایک بدقسمت زیر تفتیش تھا۔

عارف نے جو پہلا منظر دیکھا وہ اتنا کربناک تھا کہ انہیں اپنا دل مٹھی میں جکڑا محسوس ہوا۔ مغلوب کی ٹانگیں ایک کرسی پر بٹھا کر جکڑی ہوئی تھیں اور اُس کے بازو اس کرسی کے بازوؤں پر بچھا کر اس طرح باندھے گئے تھے کہ اس کی جنبش کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

تنظیم کا ایک ''رضا کار'' جس نے ہلال احمر کے نشان والی وردی پہن رکھی تھی اس کے ہاتھوں میں ہتھوڑی کی مدد سے لوہے کے کیل ٹھونک رہا تھا۔

بے بس اور مقہور قیدی کی چیخوں سے آسمان کا کلیجہ شق ہو سکتا تھا، اگر اس کی آواز تہہ خانے کے ساؤنڈ پروف سسٹم سے باہر نکل سکتی، جس کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

''ویل ڈن۔ ویل ڈن، شاباش۔ مارو سالے کو مارو.....'' جبار یہ منظر دیکھتے ہی جوش جنون سے ناچنے لگا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والے اس بے بس کی حالت دیکھ کر دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ عارف نے پہلے تو چپ سادھے رکھی پھر وہ بھی اس درندگی اور وحشت کے کھیل کا حصہ بن گیا۔

''سر! اس سالے کو آج رہائی مل جائے گی۔ بابا صاحب کا حکم ہے کہ یہاں کچھ گھڑیاں گزارنے والے کسی بھی ملزم یا مجرم کو یہاں سے رخصت کرنے سے پہلے کوئی نشان ضرور لگانا ہے جو اُسے زندگی بھر ''آستانے'' کی یاد دلاتا رہے۔ اس کے ہاتھوں میں کیل گاڑ کر اسے آج رات تک ہم کسی گٹر کے نزدیک پھینکوا دیں گے۔ کل کے لئے بکنگ ہو چکی ہے۔ ہمیں کل ہی اپنا آپریشن مکمل کرنا ہوگا۔'' جبار نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُسے کہا۔

"ٹھیک ہے..... آؤ اب چلیں۔" عارف نے اسی بہانے اس کریہہ ماحول سے نکل جانا مناسب جانا۔

تنظیم کے ہسپتال میں بیٹھ کر عارف نے وہ تمام معلومات جمع کیں جو رضا کاروں نے مختلف ذرائع سے مہیا کی تھیں۔ دو گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد عارف نے آپریشن ترتیب دیا اور تنظیم کے دس نوجوانوں کو جنہیں اس کام کی خصوصی تربیت حاصل تھی اس مشن پر روانہ کر دیا۔

●

شیر گل کا تبادلہ تین ماہ پہلے اس علاقے میں ہوا تھا۔

اس کا تعلق خفیہ ایجنسی سے تھا جہاں وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ شیر گل کے زیادہ رشتہ دار اس شہر میں رہتے تھے اور وہ بھی اکثر یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کی خواہش شروع سے ہی رہی تھی کہ اس شہر میں آباد ہو جائے کیونکہ اس کے گاؤں کے مقابلے میں اس جیسا بڑا اور رنگا رنگ دلچسپیوں کا حامل شہر بہر حال زیادہ توجہ طلب تھا۔ شاید وہ بہت کچھ نظر انداز کر دیتا۔

لیکن.....!

اس کے ننھیال کے زیادہ رشتہ دار یہیں تھے اور دو تین مرتبہ یہاں آنے کے بعد اُس کی کچھ زیادہ ہی خواہش اس شہر میں رہنے کی ہو گئی تھی۔ اس نے ذہنی طور پر شادی کے بعد کراچی ہی کو مسکن بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

شیر گل کے کندھوں پر بوڑھی ماں اور بہن کا بوجھ تھا وہ دونوں کو اپنے ساتھ لاہور لے آیا تھا اور اپنے رشتہ داروں کے نزدیک ہی اُنہیں ایک کرائے کا مکان بھی مل گیا تھا۔ شیر گل نے اپنی انتھائی کوشش سے بہن کا ماسٹیگریشن بھی مقامی کالج میں کروالیا تھا اور اب قدرے مطمئن ہو کر یہاں زندگی بسر کر رہا تھا۔

ہفتے میں دو تین مرتبہ اس کی ملاقات اپنی منگیتر سے بھی ہو جاتی تھی اس سے زیادہ کی خواہش اُس نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔

لیکن.....!

اپنی ماں کی طرف سے وہ پریشان ضرور تھا جس نے صرف اس شہر میں آنے کی مخالفت ابھی تک جاری رکھی تھی بلکہ یہاں آنے کے بعد بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ شاید اُس نے اپنے بیٹے کے اس فیصلہ کو ابھی تک دل سے قبول نہیں کیا تھا اور محض اس کی خوشنودی کے لئے یہاں چلی آئی تھی۔

لاہور میں آنے کے بعد سے اُس نے زبان سے کچھ تو نہیں کہا تھا لیکن شیر گل اور اس کی بہن محسوس کرتے تھے کہ ماں خوش نہیں ہے۔ اُن کے والد تو 1971ء کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ تب دونوں ابھی سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن ماں نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ خصوصاً ماں کے رشتہ داروں نے انہیں باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا اور اب لاہور میں بھی وہی لوگ انہیں سنبھالے ہوئے تھے۔

اس روز بھی شیر گل نے معمول کے مطابق بہن کو موٹر سائیکل پر یونیورسٹی پر ڈراپ کیا اور خود اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا جب راستے میں ایک منظر نے اچانک

اس کو جکڑ لیا۔

اس کے آفس کے نزدیک ایک سفید رنگ کی کار میں سوار نوجوانوں نے اچانک کار کھڑی کی اور سامنے موجود مارکیٹ پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

فائرنگ کرتے ہوئے دونوں نوجوان کار سے باہر نکل آئے اور اس مارکیٹ کے دُکانداروں کو گالیاں دینے لگے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں موجود پولیس کی ایک گشتی گاڑی اُنہیں فائرنگ کرتے دیکھ کر دوسری طرف مُڑ گئی تھی اور عوام میں تو ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو اس طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کار سواروں کی فائرنگ سے دکانوں کے شیشے، شوکیس تباہ ہو رہے تھے اور یہاں موجود گاہک اور دُوکاندار اپنی جانیں بچانے کے لئے کونوں کھدروں میں چھپے پھرتے تھے۔

عین اُن لمحات میں جب شیر گل کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہمکار کو موٹر سائیکل پر اس طرف آتے دیکھا۔ چونکہ ان کا آفس یہاں سے نزدیک ہی تھا اور وہ بھی شاید دفتر ہی جا رہا تھا۔

''صغیر! رُکو..... اُس نے محفوظ راستے سے گزرتے اپنے ساتھی کو آواز دے کر روکا۔

انسپکٹر صغیر نے موٹر سائیکل کو بریک ضرور لگائے لیکن انجن بند نہیں کیا۔

''چلو بیٹھو تم یہاں کیسے؟'' صغیر نے شیر گل کی بات سُننے کی بجائے اُسے اپنے پیچھے بیٹھ کر بھاگنے کی تلقین کی۔

اس نے یہی سمجھا کہ شیر گل شاید پیدل اس طرف آیا ہے اور اُس نے مدد کے لئے اُسے روکا ہے کیونکہ شیر گل کی موٹر سائیکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، ہمارے سامنے لا اینڈ آرڈر کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں اور تم.....'' شیر گل کو اُس کی بات سے اُلجھن ہو رہی تھی۔

''یار تمہیں آفس جا کر سمجھا دوں گا۔ خدا کے لئے زیادہ بحث نہ کرو اور وقت ضائع نہ کرو۔ اس فائرنگ کا رُخ ہماری طرف بھی ہو سکتا ہے۔'' صغیر نے اُسے سمجھانا چاہا۔

سفید کار اُن سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی جب اُنہوں نے ایک نوجوان کو باہر نکلتے دیکھا۔ شیر گل نے اُسے پہچان لیا یہ مقامی کونسلر تھا جو تنظیم کا اعلیٰ عہدیدار بھی تھا۔

''ارے یہ تو کمال الدین ہے۔'' شیر گل نے اُس کی طرف اشارہ کر کے صغیر کو بتایا۔

''یار جو بھی ہے جہنم میں جائے تم آتے ہو یا میں نکلوں۔'' صغیر نے کمال الدین کو پہچان ضرور لیا تھا لیکن خواہ مخواہ بیزاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''صغیر ہمارے پاس ریوالور ہیں اور ہم ان لوگوں کو قابو کر سکتے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے ریوالور نکال لیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں اور آٹومیٹک اسلحے سے لیس..... بے وقوف نہ بنو۔ جان سے جاؤ گے اور کوئی تمہارا مول نہیں پڑے

گا۔'' صغیر نے ابھی تک انجن بند نہیں کیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

شیر گل نے اتنا کہہ کر چاہا کہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سائیکل کا انجن بند کر دے۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔ مجھے کتے کی موت نہیں مرنا۔'' کہتے ہوئے اُس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور موٹر سائیکل اُڑا دی۔

''بُزدل۔ بے غیرت کہیں کا۔''

شیر گل بڑبڑایا اور اپنی دانست میں ریوالور نکال کر مارکیٹ کی طرف بھاگا، کیونکہ اس نے ایک حملہ آور کو ایک دکاندار پر گولی چلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا جو موقع پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

یہ منظر اس کے لئے ناقابل برداشت تھا کہ قانون کے ایک محافظ کی نظروں کے سامنے ایک بے گناہ شہری اس طرح بے موت مارا جائے۔ اس نے صغیر کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ریوالور ہاتھ میں پکڑے وہ ایک محفوظ آڑ لیتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اچانک فضا سائرن کی آواز سے گونج اُٹھی، شاید پولیس کی کوئی پارٹی اس اطمینان کے ساتھ کہ مجرم اپنا کام کر کے جا چکے ہوں گے۔ ''کارروائی'' ڈالنے کے لئے اس طرف آ رہی تھی۔ یہ حملہ آوروں کے لئے وارننگ بھی تھی کہ انہوں نے ''طے شدہ'' سے زیادہ ''وقت'' لے لیا ہے اور اب وہ تیزی سے بھاگنے کی فکر میں تھے۔

دونوں حملہ آور جنہوں نے مارکیٹ پر فائرنگ کی تھی کار کی طرف بھاگے۔ اُن میں ایک بالکل اُس راستے پر آ رہا تھا جدھر سے شیر گل اس پر حملہ آور ہونے جا رہا تھا۔ جیسے ہی شیر گل آڑ سے نکلا دہشت گرد اچانک ہی اُن کے سامنے آ گیا۔

''خبردار۔ رُک جاؤ۔'' شیر گل نے اُسے للکارا۔

دہشت گرد کے لئے یہ بالکل انوکھی بات تھی کہ اس شہر کے کسی مکین کی اتنی ہمت ہے جو اسے للکار سکے۔

''اے تیری تو۔'' اُس نے شیر گل کو گالی دے کر اس کی طرف گن سیدھی کی۔

ایک لمحے کے لئے اگر وہ چوک جاتا تو درجنوں گولیاں شیر گل کے جسم سے پار ہو جاتیں۔ اس نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور حملہ آور کے اس ہاتھ کا نشانہ بنایا جس میں اُس نے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

گن اس کے بازو سے نکل کر دُور جا گری اور وہ چیختا چلاتا اپنے خون آلود ہاتھ کے ساتھ وہیں گر پڑا۔

کار سواروں اور شیر گل کے درمیان سڑک کے درمیان موجود وہ چھوٹی سی دیوار حائل تھی جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ابھی تک انہیں شاید اپنے ساتھی پر

گزرنے والی قیامت کا علم نہیں ہوا تھا۔ جب اچانک گولی چلنے کی آواز نے انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔
انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے کار گھمائی اور کار کی کھڑکیوں سے جھانکتی دو کلاشنکوفوں سے شیر گل پر اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔
ایک ریوالور پر ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جانا خودکشی کے مترادف تھا اور شیر گل خودکشی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں موجود ٹریفک کی آڑ لے کر بھاگنا شروع کر دیا۔
بھاگتے ہوئے انسپکٹر شیر گل پر کمال الدین فائرنگ کر رہا تھا۔ شیر گل نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا اور دوسری طرف نظر آنے پر وہ اس کے ساتھیوں کی شناخت بھی کر سکتا تھا۔
اس کی آنکھوں کے سامنے اُن لوگوں نے مغلظات بکے، اپنے ساتھی کو سفید کار میں ڈالا اور اپنی راہ لی۔ اُن کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے کسی ایکشن سے گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ شیر گل بے بسی کے عالم میں تماشہ دیکھتا رہا اور پھر وہ بھی چپ چاپ اپنی موٹر سائیکل تک پہنچا اور دفتر کی راہ لی۔

●

آفس پہنچ کر وہ سیدھا اپنے اعلیٰ افسر کے کمرے میں گیا اور وہاں پیش آنے والے واقعات من وعن بیان کر دیئے۔ شیر گل نے اپنے افسر اعلیٰ کو بتایا کہ حملہ آوروں کے اس گروپ میں کمان مقامی کونسلر اور لسانی تنظیم کا سرگرم عہدیدار کمال الدین کر رہا تھا اور اس مارکیٹ کو لسانی تنظیم کے لئے چندے کے نام پر مانگنے والا غنڈہ ٹیکس نہ دینے کی سزا ملی ہے کیونکہ اتنی بڑی رقم فراہم کرنا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔
شیر گل نے صغیر کی بزدلی اور فرائض سے غفلت کے خلاف بھی کھل کر بیان دیا تھا اور افسر اعلیٰ نے صغیر کو اس کے سامنے ہی طلب کر لیا تھا۔ افسر اعلیٰ نے شیر گل کے الزامات دہراتے ہوئے صغیر سے جواب طلب کیا تو شیر گل حیرت اور غصے سے اس جواب پر تلملا کر رہ گیا۔
صغیر نے سرے سے کسی ایسے واقعہ کا عینی شاہد ہونے سے انکار کرتے ہوئے یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ صبح آفس آتے ہوئے اُس کی ملاقات شیر گل سے ہوئی تھی۔
شیر گل کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی بوٹیاں نوچ لے۔
''تم اتنے گر سکتے ہو اس بات کا اندازہ میں نے نہیں کیا تھا۔'' اس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
''شیر گل اپنے لہجے پر قابو رکھو اور زبان پر بھی۔ تم مجھ سے سینئر نہیں ہو۔'' صغیر نے اس کو جواباً ڈانٹ کر اس کا غصہ آسمان پر پہنچا دیا۔
''فی الحال آپ دونوں صاحبان باہر تشریف لے جائیں اور افسرانِ بالا کے سامنے گفتگو کے آداب سیکھنے کے بعد ہی میرے کمرے میں آئیں۔'' افسر اعلیٰ نے دونوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔

شیر گل کو سمجھ آ گئی تھی کہ صغیر کیوں جھوٹ بول رہا ہے؟ وہ مقامی تھا اور تنظیم سے دہشت زدہ۔ اُس نے شاید کسی ساتھی کے انجام سے نصیحت حاصل کی ہوگی جبکہ شیر گل ایسے تجربے سے نہیں گزرا تھا۔ یوں بھی ایک مخصوص ماحول میں پیدائش اور پرداخت نے اس میں دلیری ضرورت سے زیادہ ہی پیدا کر دی تھی۔

اُس نے کسی نہ کسی طرح اپنے غصے پر قابو پایا اور موٹر سائیکل لے کر اس مارکیٹ کی طرف چل دیا جہاں یہ وقوعہ ہوا تھا۔ پولیس اور پریس کے لوگ یہاں جوق در جوق موجود تھے اور اپنی اپنی ''کارروائی'' ڈال رہے تھے۔ شیر گل کا جی تو یہی چاہا کہ پولیس انچارج کا ٹینٹوا دبا دے جو سفید کار دیکھتے ہی دُم دبا کر ساتھیوں سمیت بھاگ گیا تھا۔

لیکن.....!

وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔

مارکیٹ کے خوفزدہ دُکانداروں نے شیر گل کو روتے ہوئے بتایا کہ تنظیم والوں کی ناجائز فرمائشوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے وہ لوگ ہر ماہ تنظیم کے لئے چندے کے نام پر خطیر رقم کا تقاضا کرتے ہیں اور گزشتہ دس ماہ سے مارکیٹ کے دکاندار جیسے تیسے اُن کے تقاضے پورے کر رہے ہیں جبکہ اب معاملہ اُن کے بس سے باہر ہو گیا ہے۔

شیر گل کے لئے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ یہ لوگ جس ظلم کا رونا اس کے سامنے رو رہے تھے اُس کا اظہار پولیس کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پولیس کے سامنے مجرموں کی نشاندہی سے مکمل معذوری ظاہر کر دی تھی اور پولیس نے حسب روایت ''نامعلوم حملہ آوروں'' کے خلاف رپٹ درج کر لی تھی۔

●

اس صورتِ حال نے شیر گل کا پارہ آسمان پر چڑھا دیا۔ اس نے اپنی قومی غیرت کے ہاتھوں بے بس ہو کر نزدیکی تھانے میں اپنی طرف سے حملہ آوروں کے خلاف رپٹ درج کروا دی جس میں کمال الدین کو ملزم نامزد کر دیا۔ پولیس والوں نے پہلے تو بہت زور لگایا کہ شیر گل کا دماغ ٹھیک ہو جائے لیکن اس نے بھی جیسے یہ ضد بنا لی تھی اور اپنے اعلیٰ افسران کے سمجھانے کے باوجود اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

اس روز وہ گھر کی طرف جا رہا تھا جب گھر کو مڑنے والے رستے پر دو کاروں نے اچانک اُسے روک کر بریک لگانے پر مجبور کر دیا۔

''کیا بات ہے کیا بدتمیزی ہے؟''

شیر گل یہی سمجھ رہا تھا جیسے یہ آوارہ سے لڑکے ہیں اور اُسے شرارتاً تنگ کر رہے ہیں، لیکن اچانک ہی تین کلاشنکوفیں اُس کی طرف سیدھی ہوئیں۔

''ایک ہفتے کے اندر اندر اس شہر سے نکل جاؤ۔ اس صوبے کے کسی شہر میں اگر تم دکھائی دیئے تو تمہارے ساتھ وہ سلوک ہوگا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تم کتے کی موت مر جاؤ گے اور کوئی تمہارا پُرسانِ حال نہیں ہوگا۔ سمجھے تم.....'' اُن میں سے ایک نے جو اُن کا لیڈر دکھائی دے رہا تھا شیر گل کو دانت پیستے ہوئے کہا۔

شیر گل ایک لمحے کے لئے بھی نہیں گھبرایا تھا۔

اُس نے سوچا وہ کوئی چور ڈاکو نہیں۔ قانون کا رکھوالا ہے اور ان غنڈوں کی یہ مجال کہ اُلٹا اُسے دھمکیاں بھی دینے لگے ہیں لیکن اُس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کئے رکھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُن کو اشتعال دلا کر بے موت مارا جائے کیونکہ اُن سب کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اگر وہ اُن کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا تو وہ اُسے مار ڈالتے۔

وہ خاموشی سے اُن سب کو گھورتا اور اپنا غصہ ضبط کئے کھڑا رہا۔

''سمجھے تم۔'' اُن میں سے ایک نے اُس کا گریبان جھٹکا اور اُسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''ناؤ گیٹ لاسٹ۔'' دوسرے نے اُسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ شیر گل منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔

دونوں کاریں جس طرح آئی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں۔

شیر گل نے اگلے روز نزدیکی تھانے میں ایک اور رپٹ درج کروادی جس میں تنظیم پر الزام لگایا کہ وہ لوگ اُسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ رپورٹ درج کروانے کے اگلے ہی روز اُسے اُس کے محکمے کے افسرِ اعلیٰ نے طلب کرلیا۔

''مذاق بنا کر رکھ دیا ہے تم نے ڈیپارٹمنٹ کا..... ڈوب مرنے کا مقام ہے کیا تم دوسری ایجنسیوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہم بے بس، گدھے اور اُلو کے پٹھے ہیں کہ جس کا جی چاہے ہمیں راستے میں روک کر گالیاں اور دھمکیاں دے کر چلتا بنے۔ شیر گل اپنا نہیں تو ایجنسی کی عزت کا خیال کرو۔ بہت نام ہے ہمارا۔ بہت محنت سے ہمیں یہ مقام ملا ہے۔ آخر تم نے خود کو اتنا بے بس کب سے سمجھ لیا۔ ہمارے پاس کسی شے کی کمی نہیں..... تم.....'' غصے سے انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ کاٹنے شروع کر دیئے۔

''میں نے کوئی غلط نہیں کیا سر! میں نے ڈیپارٹمنٹ کا وقار داؤ پر نہیں لگایا۔ مجھے ایجنسی اور حکومت پر اعتماد ہے۔ میں نے صرف قانونی کارروائی کی ہے اور نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف، جن کا تعلق تنظیم سے تھا، رپورٹ درج کروائی ہے تاکہ اگر وہ لوگ اپنی دھمکی پر عمل کر گزریں تو کم از کم آپ کو ملزم تلاش کرنے میں آسانی رہے۔'' شیر گل نے ٹھنڈے دماغ سے کہا۔

''شیر گل اگر تم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو یہ پیشہ چھوڑ کر کہیں دُکان کھول کر بیٹھ جاؤ۔ ناؤ گیٹ آؤٹ'' افسرِ اعلیٰ کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا تھا۔

شیر گل چپ چاپ باہر آ گیا۔

اُس نے آٹھ روز تک اس واقعے پر اپنے کسی ساتھی سے بات نہیں کی اور اپنے معمول کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس درمیان اُسے کسی نے کچھ نہیں کہا اور شیر گل نے یہی جانا کہ اُن لوگوں نے محض دھمکی دی تھی۔ وہ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اتنی بڑی اور طاقتور خفیہ ایجنسی کے افسر کو اس طرح اغواء کرنا یا مار دینا بچوں کا کھیل نہیں۔

عفت مآب

نجمہ کو اُس نے معمول کے مطابق اُس کے کالج کے سامنے اُتارا اور اپنی راہ لی۔ وہ اپنی بہن کو جاتے ہوئے خود اتار جاتا تھا جبکہ واپسی کا سفر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کرتی تھی جو اس کے محلے میں رہتی تھیں اور وہ اکٹھے ہی بس پر گھر آ جایا کرتی تھیں۔ بس سٹاپ کالج کے نزدیک ہی تھا بس ایک سڑک پار کرنی پڑتی تھی اور وہ اطمینان سے اپنے گھر پہنچ جایا کرتی تھیں۔

آج تنظیم کی دھمکی کو گیارھواں دن ہو رہا تھا گو کہ شیر گل نے اس درمیان کبھی بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اُسے خود پر اعتماد تھا اور وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں نے ان کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ دو تین سے وہ قابو آنے والا نہیں تھا۔

لیکن.....!

آج جب اپنی اکلوتی بہن کو یہاں اتار کر وہ معمول کے مطابق واپس مڑا تو نجانے کیوں اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اُسے یوں لگا جیسے کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے.....اُس کی چھٹی حس نے جیسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کر دیا تھا۔

موٹر سائیکل کے ہینڈل پر جمے اُس کے ہاتھ کی ہتھیلی اُسے پسینے میں بھیگتی محسوس ہو رہی تھی۔

چند لمحے کے لئے وہ رُک گیا.....اُس نے چاہا کہ نجمہ کو آج کالج نہ جانے دے اور آواز دے کر اسے واپس بلا لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی غیرت اور انا کے خلاف ہوتا۔ یوں بھی اب تک نجمہ کالج کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنی بہن کو کالج سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا وہ رُک کر اُسے تب تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ دروازے سے اندر نہیں چلی گئی۔

''یا الٰہی رحم کرنا۔'' اس کے دل سے دُعا نکلی۔

اُس نے سوچا کہ واپسی پر اُسے خود لے جائے گا اُسے اندازہ تھا کہ نجمہ کو ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان چھٹی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا لیکن آفس پہنچنے کے بعد بھی اُسے ایک لمحے کے لئے قرار نہیں آ رہا تھا۔ اُس کا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا تھا۔ ایک بے نام سی گھبراہٹ یا سیئت اور کچھ ہو جانے کے خوف نے اُس کو بے کل کیے رکھا۔

بارہ بجے کے نزدیک اُسے اچانک ایک ایمرجنسی حکم موصول ہو گیا۔ اُن لوگوں نے یہاں سے پندرہ بیس میل دُور ایک خفیہ اڈے پر چھاپہ مار کر ایک خطرناک دہشت گرد کو گرفتار کرنا تھا۔

حکم کی تعمیل سے انکار کا مطلب سرکاری قوانین کے مطابق بغاوت تھا جس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی ہوتی، یوں بھی آج کل اُس کے اپنے افسرِ اعلیٰ سے تنظیم کے حوالے سے کوئی خوشگوار تعلقات نہیں چل رہے تھے۔ وہ بھی خود کو بزدل یا کام چور ظاہر کر کے اپنی ''اے سی آر'' (خفیہ محکماتی رپورٹ) خراب کروانا نہیں چاہتا تھا۔

نجمہ کو سپردِ خدا کر کے وہ مہم پر روانہ ہو گیا۔

●

نجمہ حسبِ معمول چھٹی پر اپنی سہیلی کے ساتھ کالج سے باہر آ رہی تھی۔ کالج کی دیواریں تنظیم کے طلبا ونگ کے نعروں اور جھنڈوں سے اَٹی پڑی تھیں اور طالبات کی زیادہ تعداد نے تنظیم کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اپنے سینوں پر سجا رکھے تھے۔ کچھ لیڈر قسم کی طالبات نے تو تنظیم کے جھنڈے والے لباس بھی پہن رکھے تھے۔

لیکن.....!

نجمہ اور اس کی سہیلی عارفہ ان سب باتوں سے بے نیاز مطمئن اپنے گھر کو جا رہی تھیں۔ انہیں اُن کے والدین نے یہی بتایا تھا کہ کالج میں انہیں صرف تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کیا گیا ہے۔ اگر ''غیر نصابی اور صحت مند سرگرمیوں'' کا مطلب سیاست میں حصہ لینا اور توڑ پھوڑ کرنا ہی تھا تو وہ اپنی اولاد کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

نجمہ اور عارفہ معمول کے مطابق سر جھکائے چپ چاپ بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھیں جب اچانک ایک جیپ اُن کے نزدیک آ کر رکی اور اُس میں سے لسانی تنظیم کے تین مسلح غنڈے کود کر باہر آ گئے۔ اُن میں سے ایک نے کلاشنکوف اور باقی دونوں نے پستول پکڑ رکھے تھے۔

ایک پستول بردار غنڈے نے نجمہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ عارفہ نے پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان لیا تھا۔ یہ تنظیم کے طلبا ونگ کا سرکردہ لیڈر ذاکر تھا جس کے متعلق یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ اُسے ''بابا صاحب'' کی خصوصی شفقت حاصل ہے۔

ذاکر تنظیم کا بگڑا ہوا غنڈہ تھا۔ ''بابا صاحب'' کا خاص آدمی ہونے کے سبب اس شہر میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری افسر کی جرأت نہیں تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

عارفہ اس قدر دہشت زدہ تھی کہ خوف کے مارے اُس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

''بھاگ جا سالی! خبردار جو اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ ورنہ.....'' ایک غنڈے نے اس کی چٹیا پکڑ کر اُس کے سر کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ نجمہ کو اپنی گردن تڑختی محسوس ہوئی۔

''بھاگ جا.....'' اُس غنڈے نے اُسے زور کا جھٹکا دے کر آگے کی سمت دھکیلا۔ عارفہ منہ کے بل زمین پر گری۔

خوف اور سر میں ہونے والے شدید درد کی وجہ سے اپنا وجود بے جان محسوس ہوتا تھا لیکن زندہ رہنے کی خواہش نے اُسے جیسے تیسے اٹھنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی کتابیں وہیں چھوڑ کر دیوانہ وار چیختی چلاتی جس طرف منہ تھا اسی طرف بھاگنے لگی۔

نجمہ یوں تو عام سی لڑکی لیکن شیر گل خان کی بہن تھی۔ اُس نے ایک ہی لمحے میں صورتحال کی نزاکت کا احساس کر لیا تھا۔

اگر یہ لوگ اُسے اغواء کرنے آئے تھے تو اغواء کرنے کے بعد باعزت رہائی اُسے کبھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس بات کا علم ہے کہ نجمہ کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں کہ اُسے اغواء کرنے کے بعد تاوان میں کوئی خطیر رقم ہاتھ آ جائے۔

پھر اس کے اغواء کا مقصد کیا تھا؟

اگلے ہی لمحے اُسے اس سوال کا جواب مل گیا کہ یہ کوئی انتقام ہو سکتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی جس ایجنسی میں کام کرتا ہے اُس کے ہاتھوں تنظیم کو کتنی زک اٹھانی پڑتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اُس کے بھائی کے کسی ''جرم'' کی سزا اُسے دینا چاہتے تھے۔

اغواء کے بعد اُس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟

●

اس تصور نے اُس کے رگ و پے میں آگ بھر دی۔ وہ آبرو باختہ ہو کر زندہ رہنے کے بجائے آبرومندانہ طریقے سے مرجانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہی اُس کی خاندانی روایت تھی۔ اگر وہ ان بھیڑیوں کے ہاتھوں میں اپنی عزت لٹا کر زندہ بھی رہ جاتی تو بھی اُسے زندہ درگور ہونا تھا۔ پھر کیوں نہ وہ اپنی روایت نبھائے۔

اس کے لئے بندوق پستول کوئی ایسی انہونی شے نہیں تھی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن انہی کھلونوں سے کھیلتے گزرا تھا۔

دوسرے ہی لمحے نجمہ نے اپنے بازو کو زور سے جھٹکا دیا۔

غنڈے کے لئے اُس کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ اُن کا واسطہ آج تک عارفہ جیسی بے بس اور بے کس لڑکیوں سے رہا تھا۔ جن کی آدھی جان انہیں دیکھ کر ہی نکل جایا کرتی تھی اور وہ اس خوف سے بھی ہتھیار ڈال دیا کرتی تھیں کہ کہیں اس ''گستاخی'' اور ''حکم عدولی'' کی سزا اُن کے والدین کو نہ بھگتنی پڑے۔

نجمہ نے چاہا کہ بھاگ جائے لیکن اچانک ہی ڈاکر نے اُس کے پیٹ میں زوردار لات ماری اور نجمہ تلملا کر بالکل اُس غنڈے پر گری جو اپنے ساتھی کی مدد کے لئے اس کی طرف لپکا تھا۔

نجمہ کے اچانک ٹکرانے سے پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا نجمہ کے بالکل نزدیک۔

زمین پر گری نجمہ نے ہاتھ بڑھا کر پستول پکڑا اور قہر کی دیوی کی طرح اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ تنظیم کے غنڈے سنبھلیں۔ اُس نے پستول سیدھا کیا اور دیوانہ وار اُس کی لبلبی دباتی چلی گئی۔ بپھری ہوئی شیرنی کے ہاتھ میں پستول کے شعلوں نے سب سے پہلے اُس غنڈے کو چاٹا جو ڈاکر بھائی کا خصوصی باڈی گارڈ

اور ہر برے کام میں دست راست تھا۔

اُسے زمین پر گرتے دیکھ کر ذاکر نے اپنی گن سیدھی کی اور عالم وحشت میں کلاشنکوف کا پورا برسٹ عفت مآب مسلم زادی کے مقدس بدن میں اُتار دیا۔ ساری گولیاں سامنے کی سمت سے اُس کو لگی تھیں۔

کیا مجال جو زمین پر گرتے ہوئے بھی اس کا دوپٹہ اُس کے سر سے پھسلا ہو۔ نجمہ کو ایک سانس کی بھی مہلت نہیں ملی تھی جب جنت کے سارے دروازے اُس پر کھل گئے۔ خون اس کے جسم سے فوارے کی طرح اُچھلا اور پتھریلی زمین پر بہنے لگا۔ اُس کے زمین بوس ہوتے ہی ساحلی شہر کی تیز ہوا نے اپنا رُخ ذرا بدلا۔ وہ چادر جو اُس کے دوپٹے کو لپیٹے ہوئے تھی اور پھسل کر نیچے گر پڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے اس طرح اُڑ کر اس کے بدن پر گری کہ اُس کا سارا ستر ڈھانپ لیا۔

شاید قدرت نے جنت کی اس حور کا چہرہ مکروہ اور منافق لوگوں کو نہ دکھانے کا سامان کر دیا تھا۔ سفید چادر اس کے بدن سے اُبلتے خون میں ڈوب کر اب اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔

بے ہوش ہوتی عارفہ نے آخری منظر یہی دیکھا کہ ذاکر نے کلاشنکوف کا پورا برسٹ نجمہ کے سینے میں اتارا ہے اور وہ اپنے اوسان کھو بیٹھی۔ سڑک کنارے لگے لوہے کے جنگلے کو تھام کر اُس نے سنبھلنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کی گرفت جنگلے پر ٹوٹ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سینکڑوں شہریوں نے غیرت کا یہ جرأت مندانہ کھیل بڑی بے غیرتی سے دیکھا اور خوفزدہ بھیڑوں کی طرح کونوں کھدروں میں چھپ کر اپنی دانست میں خود کو محفوظ کرنے لگے۔

شاید کسی عقلمند نے اپنے حواس قابو رکھے تھے اور فون پر اس خونی ڈرامے کی اطلاع ہنگامی پولیس کو دے دی تھی جو شاید پہلے سے ''سیٹ ٹائمنگ'' کے مطابق وہاں پہنچ رہی تھی۔

ذاکر نے اس احساس کے بعد کہ اُس کا شکار زندہ اُن کے ہاتھ نہیں لگا۔ احساس توہین سے تلملا کر دیوانہ وار ہوا میں فائرنگ شروع کر دی۔ وہ اور اُس کے غنڈے ساتھی زور زور سے گالیاں دے کر ہجوم کی سمت ہوا میں گولیاں چلا رہے تھے۔ اُن کے مردہ ساتھی کی خون میں لت پت لاش کسی ٹرک کے ٹائروں تلے کچلے جانے والے کتے کی طرح اُن کے قدموں میں پڑی تھی۔

ذاکر بھائی نے عفت مآب شہیدہ کی لاش کو ٹھوکر مار کر اپنا غصہ نکالا اور گالیاں بکتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کار میں سوار ہو کر ہوا ہو گیا۔

اس اطمینان کے بعد کہ دہشت گرد یہاں سے دفع ہو گئے ہیں ایمرجنسی پولیس کے بہادر جوان اپنی برق رفتار اور جدید آلات حرب وضرب سے سجی سجائی جیپوں کے ہوٹر بجاتے وہاں پہنچ گئے۔

انہوں نے دونوں لاشوں کے گرد بڑی تنظیم اور ترتیب سے گھیرا ڈالا اور مجمع کو بھگانے کے لئے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس بات کا علم ہونے پر کہ وہاں ایک بیہوش ''وکٹم Victam'' بھی موجود ہے۔ ایمرجنسی سکواڈ کے کمانڈر نے اپنی جیپ کے وائرلیس سے ایمبولینس طلب کی اور غنڈوں کے بعد پولیس کی فائرنگ

سے خوفزدہ شہریوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے مکانات کی کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھا کہ تنظیم کے طبی ونگ کے رضا کاروں کی دو ایمبولینس وہاں پہنچیں جن میں سے ایک میں دونوں لاشیں اور دوسری میں بے ہوش عارفہ کو ڈال کر وہ لوگ زور زور سے ہوٹر بجاتے ہسپتال کی طرف چل دیئے۔

●

شیر گل کو آج نجانے کیوں اپنی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔

اُن لوگوں نے بڑا کامیاب آپریشن کیا تھا اور شام ڈھلے اپنے مشن سے واپس لوٹے تھے۔ اس درمیان اُسے رہ رہ کر اپنی بہن کا خیال آتا رہا۔ اس کی چھٹی حس اُسے بار بار کسی آمدہ خطرے کا احساس دلا کر بے چین کرتی رہی اور شیر گل اسے اپنی بزدلی سمجھتا رہا۔

اس نے بالآخر خود کو یہ سمجھا کر قدرے مطمئن کر دیا کہ اس کی بہن کو نسلی طور پر اپنی عزت کی حفاظت کا طریقہ آتا ہے اور اس کام کے لئے وہ کسی کی مدد کی محتاج نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا وقت آ ہی گیا تو وہ اپنی حفاظت کر لے گی۔

بڑے دنوں بعد آج اس کا افسرِ اعلیٰ خوش ہوا تھا۔ واقعی اُن لوگوں نے بڑی کامیابی سے تاوان کے لئے ایک سرکاری افسر کے بیٹے کو اغواء کرنے والے گروہ کو گرفتار کیا تھا اور بطور خاص یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ اغواء ہونے والے بچے کو ملزم نقصان نہ پہنچا سکیں۔

''ویل ڈن۔'' افسرِ اعلیٰ نے اس کو شاباش دی۔

''شکریہ سر!'' اُس نے اظہارِ تشکر سے کہا۔

رپورٹ لکھتے ہوئے شام گہری ہو چلی تھی۔ جب وہ رپورٹ مکمل کر کے نکلا تو رات ہو گئی تھی۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ قدرے مطمئن تھا کہ آج جان پر کھیل کر اُس نے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے بیٹے کو اغواء کاروں کے چنگل سے نجات دلائی ہے۔ اپنے دفتر سے بمشکل تین چار فرلانگ کے فاصلے پر اُس کی موٹر سائیکل اچانک ایک جیپ سے ٹکرائی۔ اگر وہ اچانک بریک نہ لگاتا تو بہت نقصان ہو جاتا۔ غصے سے تلملا کر اُس نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور چاہا کہ اس جیپ والے کا دماغ درست کر دے جس نے تمام ٹریفک قوانین بالائے طاق رکھ کر اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

لیکن.....!

جیسے ہی وہ موٹر سائیکل کھڑی کر کے سیدھا ہوا۔ جیپ سواروں نے اچانک اس کی طرف بندوقیں سیدھی کر کے اُسے ہاتھ اُٹھانے کا حکم دیا۔ اس سے پہلے کہ شیر گل کو صورتحال سمجھ آئے کسی تربیت یافتہ دہشت گرد نے اُس کی پشت سے اس کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگائی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح داہنی طرف اُلٹ گیا۔

زمین پر گرنے سے پہلے اُسے چار مضبوط ہاتھوں نے تھام لیا۔

عین اُن لمحات میں تنظیم کے طبی ونگ کی ایک ایمبولینس وہاں آئی اور چار مضبوط ہاتھوں نے شیر گل کو اٹھا کر اس میں پھینک دیا۔ ایمبولینس میں موجود مسلح رضا کاروں نے دوسرے ہی لمحے اسے سٹریچر پر ڈال کر اس طرح جکڑ دیا کہ اب وہ اپنی مرضی سے اپنے جسم کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

سائرن بجاتی ایمبولینس تنظیم کے ہسپتال کی طرف تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی اور دوسری جیپ میں موجود غنڈے دوسری سڑک پر گھوم گئے۔

تھوڑی دیر بعد شیر گل ''آستانے'' میں پہنچ گیا۔

جس ایمبولینس میں اُسے یہاں لایا گیا تھا۔ اتفاق سے اُسی ایمبولینس میں دوپہر اس کی بہن کی لاش لائی گئی تھی اور جس عمارت کے تہہ خانے میں اُسے لا کر پھینکا گیا تھا۔ اس عمارت کی اوپری منزل سے اُس کی بہن کی لاش تھوڑی دیر پہلے اس کے لواحقین کو بوجھل دلوں کے ساتھ تنظیم کے طبی ونگ کے رضا کاروں نے سونپی تھی۔

شیر گل کو ہوش آیا تو اُس نے خود کو مضبوط سلاخوں والی حوالات میں بند پایا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر ڈال کر ایک مضبوط سلاخ سے باندھی گئی تھی۔ دونوں سروں پر مضبوط تالے لگے تھے۔

اپنی گردن اُسے اکڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور گردن گھمانے میں وہ خاصی دقت محسوس کر رہا تھا۔

ہمت کر کے وہ اُٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب شاید صبح ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے اپنی طرف آتی قدموں کی چاپ سنائی دی پھر اس نے سلاخوں کے باہر عارف چوہدری کو کھڑے دیکھا جس کے عقب میں تین اور ہٹے کٹے غنڈے موجود تھے۔ اُن میں سے ایک نے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

●●●

ٹارچر سنٹر

''کیوں بیٹا؟ اب معلوم پڑا آٹے دال کا بھاؤ..... سالا بڑا اکڑتا تھا۔ ابے تجھے کہا تھا ایک ہفتے میں بھاگ جا اس شہر سے اور تو ابھی تک یہیں پھر رہا ہے۔ اب بھگت بیٹا..... بھگت اب۔ دیکھتا ہوں کون سالا تجھے بچانے آتا ہے۔''

یہ کمال الدین تھا۔

تنظیم کا سرکردہ ممبر اور مقامی کونسلر جس کے خلاف شیر گل نے ایف آئی آر درج کروائی تھی۔ اور اسے مارکیٹ میں فائرنگ کا ذمہ دار گردانا تھا۔ اور جس کو پولیس نے آج تک پوچھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتا آج شیر گل اس کی تنظیم کا قیدی تھا اور کمال الدین اس کی بے بسی کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔

یہ عبرت کی جا تھی۔

ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہونے کے ناطے اُس کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی زمین پھٹے اور وہ اس کے اندر سما جائے۔

لیکن.....!

اس کے سوچنے سے زمین نہیں پھٹ سکتی تھی۔ آسمان نہیں گر سکتا تھا نہ ہی اتنی آسانی سے اس کی جان چھوٹ سکتی تھی۔ اُس نے تنظیم کو اپنی حیثیت میں للکار کر ایسا گناہ کر دیا تھا جس کا کفارہ آسانی سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے اُسے بہر حال ایک طویل اور اذیت ناک عمل سے گزرنا تھا۔

''دیکھو میاں! ہم ایک مرتبہ وارننگ ضرور دیا کرتے ہیں۔ یہ ہمارا اصول ہے لیکن ہمارے حکم پر عمل نہ کرنے والے کو ہم معاف نہیں کیا کرتے، یہ بھی ہمارا اصول ہے جس پر ہم سختی سے کاربند ہیں۔ ہمارے لئے تم جیسے کیڑے مکوڑوں کو جان سے مار دینا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ چیونٹی کو پاؤں سے مسل دینا، لیکن ہم تمہیں زندہ درگور کر دیں گے تاکہ تم اپنے ساتھیوں کے لئے مثال بن جاؤ اور اشتہار بن کر اس شہر میں گھومتے پھرو کہ جس نے تنظیم سے ٹکرانے کی کوشش کی وہ اپنے انجام کو پہنچا'' اس مرتبہ عارف اس سے مخاطب تھا۔

عارف نے یہاں آنے سے پہلے اچھی خاصی چڑھا رکھی تھی یوں بھی اب اس کا شمار تنظیم کے بڑے غنڈوں میں ہونے لگا تھا اور وہ اب اپنے ''بڑے'' ہونے کا ثبوت دینے ہی یہاں آیا تھا۔

''بکواس بند کرو..... ذلیل انسان تم نہیں جانتے میں کون ہوں..... تم سے جو بھی بن پڑے کر گزرو..... یاد رکھنا اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو اپنی زندگی کی سب

سے بڑی غلطی کرو گے۔''

''لاؤ سالے کو ابھی اس کا مزاج ٹھنڈا کرتا ہوں.....'' عارف نے حکم دیا۔

دروازہ کھلا اور تنظیم کے رضا کار اُسے گن پوائنٹ پر جانوروں کی طرح گھسیٹتے اس کمرے کی طرف لے آئے جہاں وہ اپنے ''مجرموں'' کو سزا دیا کرتے تھے۔ شیر گل کو ایک لوہے کی کرسی پر اس طرح جکڑ دیا گیا کہ اُس کے بازو کرسی کے بازو سے بندھے تھے اور ٹانگوں کو زنجیر سے باندھا گیا تھا۔

''شیر گل۔ تمہارے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے استعفیٰ پر دستخط کر دو جو ٹائپ شدہ ہمارے پاس موجود ہے اور چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔'' عارف نے ایک کونے میں دھری میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

''شٹ اَپ..... تم یہ حسرت دل میں ہی لے کر مر جاؤ گے کہ اپنی مرضی سے کوئی بات مجھ سے منوا سکتے تھے۔'' شیر گل دھاڑا۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔''

عارف کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اس کی پشت پر موجود رضا کاروں نے جلتے ہوئے سگریٹ اس کے دونوں کندھوں پر رکھ دیئے۔

شیر گل کے کندھوں پر رکھے انگارے اُس کے سارے بدن میں دہکنے لگے تھے لیکن کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

''عموماً یہ اختتام ہوتا ہے انسپکٹر! لیکن ہم آغاز اس سے کرتے ہیں۔ اس سے تم اندازہ کر لو کہ ہم کہاں تک جا سکتے ہیں..... میں تمہارے بدن کی ہڈیوں کا گودا نکال لوں گا..... تمہارے جسم میں ورمے سے اتنے سوراخ کروں گا کہ تمہاری شناخت ممکن نہ رہے۔

عارف پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔

وہ عالم وحشت میں درندوں جیسی حرکات کر رہا تھا۔ دونوں رضا کاروں کے جلتے سگریٹ مسلسل شیر گل کے کندھوں سے چپکنے کی وجہ سے بجھ گئے تھے اور اب وہ ہیٹر پر پہلے سے رکھی پتلی پتلی لوہے کی سلاخیں گرم کر رہے تھے۔

اچانک ہی عارف نے ایک کونے پر دھری میز پر ترتیب سے رکھے سامان اذیت میں سے لوہے کی ایک موٹی سلاخ کا انتخاب کیا اور شیر گل کے جسم کو جلترنگ کی پیالیوں کی طرح بجانے لگا۔

ماہر موسیقار کی طرح جو چھوٹی سی چھڑی سے پیالیاں بجا کر جلترنگ سے آواز پیدا کرتا ہے۔ اُس نے بڑی تیزی سے شیر گل کی ہڈیاں بجانا شروع کر دیں۔ وہ شیر گل کے ٹخنوں سے کندھوں تک تمام ہڈیوں پر تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔

شیر گل کو اپنا بدن تڑختا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ جس پر تینوں درندے دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگتے تھے۔ اُن کے قہقہے اور شیر گل کی چیخیں اکٹھے بلند ہوتی تھیں اور سننے والوں کے کلیجے پھٹ جانے کا سماں پیدا کرتی تھیں۔

''جلاؤ..... جلاؤ اسے..... جلادو سالے کو۔'' عارف نے اچانک ہاتھ روک کر دونوں رضا کاروں کو حکم دیا جو اپنے ہاتھوں میں لوہے کی سلاخیں، جن کو پکڑنے کے لئے لکڑی کے دستے لگائے گئے تھے..... پکڑے اپنی باری کے منتظر کھڑے تھے۔

انہوں نے درندوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے باری باری دونوں سلاخیں اُس کے کندھوں پر بالکل اس جگہ رکھ دیں جہاں پہلے سگریٹ کے جلنے سے نشانات موجود تھے۔

زندہ انسان کا گوشت جلنے لگا۔ شیر گل کے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی کربناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں لیکن ان چیخوں پر اُن وحشیوں کے قہقہے غالب تھے۔

اچانک ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔

وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

''پانی ڈالو..... پانی ڈالو.....'' عارف چوہدری نے اپنے رضا کاروں کو حکم دیا جو ندیدے بچوں کی طرح کلکاریاں مارتے ہوئے اُس کا بدن جلا رہے تھے۔

دونوں نے سلاخیں دوبارہ اپنی جگہ پر فٹ کر دیں اور پانی کا گلاس بھر لائے۔ اُن میں سے ایک نے زور زور سے پانی کے چھینٹے شیر گل کے منہ پر مارے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھولیں پھر بند کر لیں۔

''ابے ڈاکٹر کو بلاؤ بے۔'' عارف نے کمرے کے باہر موجود گارڈ کو حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں موجود تھا۔

یہ تنظیم کے طبی ونگ کا ڈاکٹر تھا۔ جس نے پھرتی سے شیر گل کا بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن اور جسم کی عمومی حالت کا جائزہ لیا۔

''تھوڑا آرام چاہئے مریض کو..... ابھی بھی مرے گا نہیں، لیکن تھوڑا آرام کرنے دو تو بڑا مزہ دے گا۔''

ڈاکٹر نے جو خون پینے والا ڈریکولا دکھائی دے رہا تھا مسکراتے ہوئے عارف سے کہا۔

''پھینک دو سالے کو اور کل تک مرنے نہ دینا۔''

عارف نے رضا کاروں کو حکم دیا اور خود باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بنے بھائی کی طرف جا رہا تھا جہاں انہیں آج ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ اب وہ کل صبح تک فارغ تھا کیونکہ اس کا ''مریض'' کم از کم 24 گھنٹے آرام چاہتا تھا۔

●

شیر گل کو ہوش آیا تو وہ زنجیر کی بندشوں سے آزاد تھا۔ ہوش آنے پر اُسے جسمانی اذیت کے جس عمل سے گزرنا پڑا اُس کے بعد اُس کے دل سے دوبارہ بیہوشی کی دعائیں نکلنے لگی تھیں۔

لیکن.....!

یہ دُعا قبول نہ ہوئی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بمشکل اُس نے کوٹھڑی کے کونے میں دھرے مٹی کے گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلا اور ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگا۔

یہاں عام حالت میں شاید ایک ہی پہریدار موجود رہتا تھا، جو بے نیازی سے ٹہلتا اُس کے نزدیک آیا اور اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر کسی کو اطلاع دینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی ڈاکٹر دو مسلح رضا کاروں سمیت اُس کے سرہانے موجود تھا۔ ڈاکٹر نے وہاں موجود پہرے دار کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور اس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔

شیر گل کے لئے اپنے جسم کو جنبش دینا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود دو بندوقوں کی نالیاں اُس کی طرف تنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے دوبارہ اس کا جسمانی معائنہ کیا اور چپ چاپ باہر آ گیا۔ باہر آ کر اُس نے پہرے دار کو کچھ ہدایات دی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اس کے لئے کھانا لے آئے۔ جبکہ ڈاکٹر کے ساتھ آنے والے رضا کاروں نے ایک ٹرے میں کچھ دوائیاں بھی اٹھا رکھی تھیں۔

''دیکھو میاں میں ڈاکٹر ہوں اور میرا فرض ہے کہ تمہیں قابل تفتیش بنائے رکھوں۔ اگر تم یہ گولیاں کھا لو تو قدرے افاقہ ہو جائے گا۔ اور ہاں چونکہ تم نے مار کھانے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تم کھانا بھی کھاتے رہو۔''

یہ کہہ کر اُس نے جنونیوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔

شیر گل نے اُس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے علم تھا وہ انتہا پسند جنونیوں کی قید میں ہے اور یہاں سے سلامتی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو غیر حاضر نہ ہونے دے۔

ڈاکٹر نے اُس کے جلے ہوئے جسم پر کوئی سفوف چھینکا تو اُسے قدرے سکون محسوس ہوا۔ جس کے بعد اُسے کھانا کھانے کا حکم ملا۔ خلاف توقع کھانا اچھا تھا جو اُس نے ہمت کر کے زہر مار کر لیا۔ وہ بہر حال اپنی جسمانی توانائیاں برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

کھانا ختم کرنے پر اُسے گولی کھانے کا حکم ملا اور گولی نگلنے کے چند منٹ بعد ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ غالباً یہ کوئی نشہ آور نیند لانے والی گولی تھی اور یہاں موجود قصائی اپنے شکار کی تڑپ کا مزہ دیکھنے کے بعد اُسے کچھ دیر کے لئے آرام کروا رہے تھے تاکہ دوبارہ اُس کا جسم ان کی جنونی حرکات کا متحمل ہو سکے۔

اس مرتبہ اُس کی آنکھ کھلی تو شیر گل نے اندازہ کیا کہ شاید شام ڈھل چکی ہے۔ یہاں وقت ماپنے کا کوئی آلہ موجود نہیں تھا۔ ایک تہہ خانے میں بند بے بس قیدی کے

لئے دن اور رات کی تمیز ممکن ہی نہیں تھی۔

شیر گل کا سارا بدن سُلگ رہا تھا۔

لوہے کی گرم سلاخوں اور جلتے ہوئے سگریٹوں کی آگ اس کی نس نس میں دوڑ رہی تھی۔

ابھی تک اُس نے ہمت کر کے اپنی پشت پر ہاتھ پھیر کر زخم کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا۔ بس ایک ہی دھن اس کے دماغ پر سوار تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ یہاں سے نکل جائے۔ اس بات کا تو اُسے علم تھا کہ یہ لوگ اُسے جان سے نہیں ماریں گے۔ اگر ان کا یہی ارادہ ہوتا تو بڑی آسانی سے اغواء کے وقت ہی اُسے عملی جامہ پہنا لیتے۔

یہ لوگ اُسے سسکا سسکا کر، تڑپا تڑپا کر اپنی برتری اور شیر گل کی بے بسی کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ شیر گل جب یہاں سے جائے تو اپنے ساتھیوں کے لئے نمونہ عبرت بن جائے اور آئندہ پولیس کی طرح ایجنسی کے بھی کسی ملازم کو اُن کے کسی بھی حکم کی سرتابی کی جرأت نہ ہو۔

شیر گل نے ان مذبح خانوں کی یاترا کرنے والوں کی کہانی سن رکھی تھی۔ اُن لوگوں کے جسموں میں چھید کرنے کے بعد، اُن کی کھال جلانے کے بعد انہیں کسی گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا تھا۔

یہ جنونی جو زبان اور زمین کے حوالے سے خود کو منظم کر رہے تھے انسانیت کی سطح سے گر کر درندگی کی سطح پر اُتر آئے تھے۔

●

اُس نے اس بات کا اندازہ تو لگا لیا تھا کہ یہاں صرف ایک ہی پہریدار ہوتا ہے۔ شاید اس جگہ آنے والوں کی طرف سے فرار کی کوشش کا خیال ہی ''آستانہ'' والوں کے دل میں نہیں آیا تھا۔

اس وقت تہہ خانے کے سارے بلب روشن تھے۔ اسی ایک بات سے شیر گل نے اندازہ لگایا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ کیونکہ جب اُسے تفتیش کے لئے لے جایا گیا تو اِکا دُکا بلب ہی روشن تھے۔

اُسے جو بھی کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔ ابھی اس کا جسم بہر حال اس قابل تھا کہ یہاں سے آزادی تک کا فاصلہ طے کر سکے۔ اگر ایک مرتبہ اور وہ وحشیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا تو پھر شاید وہ طویل عرصے تک اپنی مرضی سے اپنے جسم کو جنبش دینے کے لائق بھی نہ رہتا۔

اس کے جسم سے اُٹھنے والا کرب اُسے پاگل کئے دے رہا تھا۔ درد کی شدت اُس کے اندر انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔

کچھ سوچ کر اُس نے اچانک ہی اپنے لوہے کے دروازے کی سلاخوں کو جھنجھوڑ دیا۔ فوراً تہہ خانے کی سیڑھیوں کے نزدیک موجود ''مسلح رضا کار'' اس کے سر پر پہنچ

گیا۔

اس نے شیر گل کو گالیاں دیتے ہوئے دوبارہ ایسی حرکت کرنے پر گولی مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

''مجھے چائے لا کر دو..... میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔''

شیر گل تو کسی اور سلوک کی توقع کر رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا کہ پہرے دار واقعی چائے کا ایک گلاس تھامے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی چال سے شیر گل نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت وہ شراب کے نشے میں بدمست ہے۔ جس وقت شیر گل نے دروازے کی سلاخوں کو ہلایا تھا۔ شاید وہ اس وقت شغل نوشی میں مشغول تھا۔

یہ شیر گل کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا پہرے دار اس کے حصے میں آ گیا تھا جو تنظیم کا بگڑا ہوا شہزادہ تھا۔

آج چونکہ یہاں اکیلا قیدی شیر گل ہی تھا جس کے ''کیس آفیسر عارف چوہدری'' نے کل آنا تھا اور اس قید خانے کا اصول یہی تھا کہ یہاں موجود پہرے دار ہی کیس آفیسر کی موجودگی میں یہاں کا انچارج ہوا کرتا تھا۔

بدمست اور وحشی پہرے دار نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہ شراب کی بوتل کے ساتھ رات بسر کرنے کے لئے شباب بھی یہیں لے آیا تھا۔ اس جیسے ''لاڈلے رضا کار'' کی خدمت کے لئے تنظیم کی خواتین ونگ میں کئی رضا کارائیں موجود تھیں۔

پہریداروں کے آرام کے لئے بنی سیڑھیوں کے ساتھ ہی موجود چھوٹی سی کوٹھڑی میں وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ شغل مے نوشی میں موجود تھا۔ جب شیر گل نے ہنگامہ کھڑا کیا۔ ان حالات میں اُس کے لئے قیدی کی اُس گستاخی کو نظر انداز کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ فی الوقت وہ یہی چاہتا تھا کہ شیر گل خاموش رہے تا کہ وہ اپنا گھناؤنا کھیل اچھی طرح سے کھیل سکے اور اپنی محبوبہ کو رخصت کرنے کے بعد ہی اس سے نمٹنا چاہتا تھا۔ چائے اُس نے قیدی کے لئے خود تیار کی تھی۔

●

جب پہرے دار چائے کا گلاس لے کر وہاں پہنچا تو شیر گل نے بیقراری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلاخوں سے دونوں ہاتھ باہر نکال دیئے تا کہ چائے کا گلاس تھام سکے۔ بدمست ''رضا کار'' نے سلاخوں سے باہر لٹکے اُس کے ہاتھوں کو دیکھا تو غصے سے انہیں ٹھوکر مارنے کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ اس نے چاہا کہ اپنے بوٹ سے شیر گل کے ہاتھوں پر ٹھوکر مارے۔ جیسے ہی اس کا پاؤں حملے کے ارادے سے اٹھا اُس کے ہاتھوں میں بجلیاں بھر گئیں۔

اذیت اور انتقام کی شدت سے دیوانگی کے عالم میں اُس نے رضا کار کے پاؤں کو جھٹکا مارا اور وہ دھڑام سے کمر کے بل زمین پر گر گیا۔ اب اس کے دونوں پاؤں شیر گل کے دونوں ہاتھوں میں تھے۔

سلاخوں والے دروازے اور کمرے کے فرش کے درمیان وہ خلا جو ان وحشیوں نے اندر موجود قیدیوں تک کھانا پہنچانے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ شیر گل کے کام آیا۔

وہ رضا کار کو اس وقت تک گھسیٹتا رہا جب تک اس کی ٹانگیں اس خلاء میں پھنس نہیں گئیں۔

اب اس کے دھڑ تک شیر گل کی رسائی ممکن ہو گئی تھی۔

دوسرے ہی لمحے اس نے پہرے دار کو دبوچ لیا کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نکالنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ شیر گل سلاخوں کے پیچھے اس کی ٹانگوں پر بیٹھا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے پہرے دار کی گردن اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا رکھا تھا اور اپنا دباؤ مسلسل اس کی گردن پر بڑھا رہا تھا۔ پہرے دار کے لئے جسم کو جنبش دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ شراب کے نشے میں وہ پہلے ہی اپنے قابو میں نہیں تھا۔

اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

بمشکل دو منٹ کی جدوجہد نے اُسے ادھ مواء کر دیا تھا۔ پھر اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ شیر گل کو اس بات سے کچھ علاقہ نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہے یا بے ہوش ہوا ہے۔ اُس نے بے حس و حرکت پہرے دار کی پتلون کی جیب سے چابیوں کا گچھا برآمد کیا اور اب وہ اپنے ہاتھ کی دسترس میں موجود دروازے کے تالے پر مختلف چابیاں آزما رہا تھا۔

اُس کی مراد جلد ہی بر آئی اور تالا کھل گیا۔

شیر گل کی حالت اُس زخمی چیتے جیسی تھی جس پر خونخوار کتوں کی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔ اُس نے ایک لمحے کے لئے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے نیم مردہ پہرے دار کو اندر گھسیٹ لیا۔

بجلی کی سی پھرتی سے اُس نے پہرے دار کو کپڑوں سے بے نیاز کر دیا اور اس کے کپڑے پہن لئے۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے کوٹھڑی کے سامنے رکھی اس کی کلاشنکوف اٹھالی اور پوری قوت سے بندوق کا بٹ نیم مردہ پہرے دار کے سر میں رسید کیا۔

اپنی دانست میں اُس نے اب پہریدار کو مار ڈالا تھا۔

جاری ہے...

کلاشنکوف ہاتھوں میں پکڑے چوکس اور زخم خوردہ ٹائیگر کی طرح وہ پنجوں پر بھاگتا ہوا سیڑھیوں کے کونے پر بنے پہریدار کے کمرے تک پہنچا۔ اچانک اس نے تنظیم کی ایک برہنہ رضا کارہ کو برآمد ہوتے دیکھا۔ جو شاید کسی پیش آمدہ خطرے کا احساس ہونے پر گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔

شیر گل کو اس صورتحال نے ایک لمحے کے لئے تو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ خوفزدہ رضا کارہ کے حلق سے چیخ برآمد ہو شیر گل نے بجلی کی سی پھرتی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

خبردار اگر آواز نکالی تو۔'' اُس نے رضا کارہ کے کان میں سرگوشی کی۔

اس کے ساتھ ہی اُسے قریباً گھسیٹتا ہوا اُس کی کوٹھڑی تک لے گیا جہاں اس کا محبوب موجود تھا۔ اچانک صدمے اور منہ پر شیر گل کے ہاتھ کے دباؤ سے نازک اندام رضا کارہ جلد ہی اپنے حواس کھو بیٹھی۔

شیر گل نے اُس بھی اس کوٹھڑی میں پھینکا اور کوٹھڑی کو تالہ لگا کر چابیاں اپنی جیب میں ڈال کر راہ لی۔

●

تہہ خانے کی سیڑھیوں کے اوپر سرے پر لوہے کا ایک اور جنگلا موجود تھا۔ شیر گل کے پاس موجود چابیوں میں سے ایک نے یہ تالا بھی کھول دیا۔ اب وہ ایک نیم روشن راہداری میں چل رہا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا اب وہ کاٹھ کباڑ کے اُس ڈھیر تک پہنچ گیا تھا جسے عبور کرنے کے بعد اُس نے باہر نکلنا تھا۔

باہر سے آنے والی تازہ ہوا کے جھونکے نے اُسے احساس دلا دیا تھا کہ منزل نزدیک ہے۔ وہ مزید چوکس ہو گیا۔

اب وہ اس راستے پر چل رہا تھا جو گراؤنڈ فلور کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سارا سفر اس نے اندازے سے طے کیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس طلسم ہوشربا سے کس طرح نکل پائے گا۔

ایک دروازے سے جیسے ہی وہ باہر نکلا سامنے اُسے لفٹ نظر آ گئی۔ شیر گل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے لفٹ رک گئی۔

اس نے کلاشنکوف کو فائرنگ کی پوزیشن میں کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور نکل آیا۔

یہ ایک طویل برآمدہ تھا جس کے ایک کونے میں ''استقبالیہ'' تھا اور دیواروں کے ساتھ ساتھ مریضوں کے لواحقین بیٹھے تھے۔ بندوق کو بازو سے قدرے چھپا کر وہ تیزی سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیا۔

ابھی تک کسی نے اُس پر شک نہیں کیا تھا۔

برآمدے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اُس نے ایک ایمبولینس رکتے دیکھی جس سے طبی ونگ کا رضا کار چابی کا چھلا گھماتا باہر نکلا۔ جیسے ہی اس کی نظر اپنی طرف

آتے شیر گل پر پڑی اُسے کچھ شک گزرا اور اچانک ہی اُس نے شیر گل کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ شیر گل نے اُس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے رائفل سیدھی کر لی تھی لیکن رضا کار کو شاید زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا یا پھر اُسے شیر گل کی طرف سے مزاحمت کی اُمید ہی نہیں تھی۔ اُس نے شیر گل کی وارننگ کو خاطر میں لائے بغیر پستول نکال اور چاہا کہ شیر گل پر گولی چلائے جب اچانک شیر گل کے ہاتھ میں پکڑی کلاشنکوف نے شعلہ اُگلا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

شیر گل اُڑتے پرندے کو نشانہ لگا کر گرا سکتا تھا۔ اس نے ایک ہی گولی رضا کار کے سینے میں اتار دی اور اُسے سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔

''بھاگو شیر گل..... بھاگو.....'' اُس کی چھٹی حس نے چلاتے ہوئے کہا۔

شیر گل نے پھرتی سے گرنے والے کے ہاتھ میں موجود ایمبولینس کی چابی سنبھالی اور زقند بھر کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ ایمبولینس کو باہر جانے والے راستے پر بھگا رہا تھا۔

ایمبولینس موڑتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ استقبالیہ سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے ڈرائیور کی مدد کو آ رہے تھے۔

شیر گل نے ایمبولینس کو پہلا موڑ اتنی تیزی سے گھمایا تھا کہ وہ اُلٹتے اُلٹتے بچ گئی۔ راستے میں کھڑی دو موٹر سائیکلوں کو اُس نے ٹکر مار کر پرے پھینک دیا تھا اور اب برق رفتاری سے باہر جانے والی سڑک پر ایمبولینس بھگا رہا تھا۔

یہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔

ایجنسی کے ہر عہدے دار کو سب سے پہلے تنظیم کے اس ہیڈ کوارٹر میں بھیس بدل کر ''ریکی'' کرنے بھیجا جاتا تھا۔ رات ہونے کے سبب ٹریفک کا زیادہ دباؤ نہیں تھا۔ یوں بھی ایمبولینس کے سائرن سن کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ اب اُسے اپنے تعاقب کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور تین چار سڑکوں پر ایمبولینس کو گھما دیا۔ اس درمیان پولیس کی گشتی پارٹی پر بھی اس کی نظر پڑی تھی۔

لیکن.....!

انسپکٹر شیر گل خان اب کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

ایک قدرے ویران سڑک پر اُس نے ایمبولینس روکی۔ اس کے ڈیش بورڈ پر رکھی سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا اٹھالی۔ بجلی کی سی پھرتی سے اس نے ایمبولینس کا بونٹ کھولا۔ پٹرول سپلائی کرنے والا پائپ جھٹکا دے کر توڑ ڈالا اور اس اطمینان کے بعد کہ اب مطلوبہ مقدار میں پٹرول بہہ چکا ہے۔ کچھ فاصلے سے ماچس کھولی اور اس سے کچھ تیلیاں باہر نکال کر ڈبیا میں پھنسائیں۔ پھر ایک تیلی سلگا کر ماچس کو آگ دکھائی اور آگ کا گولہ انجن پر پھینک کر دیوانہ وار ایک طرف بھاگ اٹھا۔

اُس کے تعاقب میں تنظیم کے طبی ونگ کی ایمبولینس سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسی ہی ایک آگ اس کے دل و دماغ میں بھی لگی تھی۔ اگر اس کو موقع ملتا تو وہ ''آستانے'' کو اسی طرح جلا کر راکھ کر دیتا۔

پریس کانفرنس

اس محلے میں بنے بھائی کی آمد ہی اتنی بڑی خبر تھی کہ اردگرد کے محلوں سے بھی لوگ یہاں جمع ہونے لگے تھے۔ بنے بھائی سیدھے عارفہ کے گھر پہنچے تھے۔ تنظیم کے سینکڑوں کارکن مکان کے باہر موجود تھے۔ بنے بھائی کے ذاتی محافظوں نے پریس والوں کو جو بنے بھائی کی آمد کی خبر سن کر یہاں جمع ہو گئے تھے۔ مکان کے باہر ہی روک رکھا تھا۔ وہ پریس والوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

عارفہ کے والد کے لئے بیٹی کا حادثہ اب حادثہ جانکاہ بننے لگا تھا۔

جب وہ اپنی بیٹی کے بے ہوش ہونے کی خبر سن کر تنظیم کے طبی مرکز پر پہنچے تو اُن کی ملاقات وہاں ایم پی اے پرویز خان سے ہوئی جس نے میر صاحب سے پہلی بات یہی کہی کہ وہ اپنی بچی کی دل جوئی اور عیادت کریں لیکن ابھی کسی کے سامنے وہ بات نہ دہرائیں جو اُن کی بچی اُنہیں بتائے گی۔

پولیس کو کیا بیان دینا ہے؟

اس کا فیصلہ وہ لوگ خود کر لیں گے۔

''لیکن خان صاحب پولیس والے تو ابھی بیان لینے آ جائیں گے۔'' میر صاحب نے، گرم و سرد چشیدہ تھے اور ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا، پرویز خان کے تیور سے ہی اندازہ لگا لیا کہ اُن کے لئے سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ اُن سے زیادہ تنظیم کو کون جانتا ہوگا کہ وہ خود بھی ایک زمانے میں اس میں شمولیت کی غلطی کر چکے تھے۔

''ٹھیک ہے جناب جو آپ کا حکم۔'' میر صاحب نے دست بدست عرض کی۔

جب وہ عارفہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو اُن کی بیٹی کے ہوش و حواس بحال تھے۔

والد کو دیکھتے ہی عارفہ اُن سے لپٹ گئی اور سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل الگ سے خون رو رہا تھا۔ انہوں نے بچی کو نارمل کیا۔ تسلی دی اور ساتھ ہی نصیحت کے لہجے میں اس سے درخواست کی کہ وہ پولیس کو ابھی کوئی بیان نہ دے۔

''پولیس کے لئے بیان تنظیم کے لوگوں نے تیار کیا ہے تم صرف اس پر دستخط کر دینا۔''

میر صاحب نے کہا۔

''لیکن ابا میاں انہی لوگوں نے تو نجمہ کو قتل کیا ہے اور ان ہی کے کہنے پر.....''

''بیٹی اس وقت تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم پر مزید بوجھ ڈالا جا سکے۔ صرف ایک بات ذہن نشین کر لو تمہارا صرف ایک بھائی ہے جو میرے بعد تم تینوں بہنوں کا واحد سہارا ہے۔ اگر تم یہ نہیں چاہتی کہ اس کا انجام بھی تمہاری سہیلی نجمہ جیسا ہو تو اپنی زبان بند کر لو اور جس طرح یہ لوگ کہتے ہیں اس پر عمل کرو۔''

انہوں نے اپنی بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

عارفہ کو اندازہ تھا کہ ابا میاں کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔

وہ دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ اُسے ابھی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ اس شہر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ زندگی گزارنا تھی..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میر صاحب کی ریٹائرمنٹ کی عمر آ رہی تھی۔ تین بہنیں بیاہنے والی تھیں اور جوان بھائی کی بلی دے کر بھی وہ ظالموں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔

اس نے بادلِ نخواستہ اپنے ضمیر کی ملامت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے باپ کا حکم مان لیا۔

اس کا دل خون رو رہا تھا۔

نجمہ اُس کی بہت عزیز سہیلی تھی۔ وہ متعدد مرتبہ نجمہ کے گھر گئی تھی۔ دور دراز کے پہاڑوں سے آنے والی نجمہ، اس کی ماں اور شرمیلے بھائی کے حسنِ سلوک نے اُسے بہت متاثر کیا تھا۔ تنظیم کے پروپیگنڈہ کے برعکس نجمہ کے گھر والے اُن سے بدرجہا بہتر انسان تھے۔ وہ شرافت، نیکی اور انسانی احترام کا بہترین نمونہ تھے۔ سیاست انہیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

اس نے شیر گل، نجمہ یا اس کی ماں کے منہ سے کبھی ایک لفظ بھی سیاست کے موضوع پر نہیں سنا تھا۔

نجمہ کی ماں نے کبھی اس میں اور اپنی بیٹی میں فرق نہیں جانا تھا۔ اپنے آبائی صوبے کی نا جانے کتنی سوغاتیں نجمہ کی ماں نے عارفہ کو سونپی تھیں۔

اُس نے ایک مرتبہ عارفہ سے منت کے لہجے میں کہا تھا کہ ان کی بیٹی کو زمانے کے اُتار چڑھاؤ کا کچھ اندازہ نہیں۔ اُسے اس بات کا علم نہیں کہ درسگاہوں میں تعلیم کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے اس لئے وہ نجمہ کی رہنمائی کرتی رہا کرے۔ نجمہ کو تو اس شہر کی سڑکوں کا بھی اندازہ نہیں کہ کون سا راستہ کدھر کو لے جاتا ہے۔

اور..... اُس نے کتنے اعتماد سے کہا تھا کہ خالہ جی آپ بے فکر رہیں میرے جیتے جی کوئی نجمہ کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔

بے چاری نجمہ کی بوڑھی ماں..... جس نے اس بات پر فوراً یقین کر لیا تھا۔

''''واہ عارفہ بی''..... اُس نے خود پر طنز کیا..... خوب وعدہ نبھایا ہے تم نے..... اور اب اپنی مُردہ سہیلی کا خون بھی بیچنے جا رہی ہو..... اس کے قاتلوں سے سمجھوتہ کر رہی ہو۔ محض اس لئے کہ تمہاری بہنوں اور بھائیوں کی جانیں اور عزتیں محفوظ رہیں۔

کیا نجمہ کسی کی بیٹی نہیں؟

کسی کی بہن نہیں تھی؟

اُف میرے خدایا..... میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

وہ سسک پڑی۔

جانے کب تک آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کا تکیہ بھگوتے رہے۔

●

تنظیم کی طرف سے بلائی گئی اس پریس کانفرنس میں مقامی ایم پی اے پرویز خان، کونسلر کمال الدین، اپنے بھائی اور تنظیم کے کچھ اور سرکردہ لیڈر تھے۔ انہوں نے اخبار نویسوں میں عارفہ کے والد کے کانپتے ہاتھوں سے عارفہ کے بیان کی کاپیاں تقسیم کروادیں۔

اس بیان میں کہا گیا تھا کہ ''مخالف تنظیم'' کے غنڈوں نے لڑکیوں کے کالج سے کچھ فاصلے پر تنظیم کے طلباء ونگ کے ایک ممبر پر حملہ کیا وہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگا تو اس پر فائرنگ شروع کردی گئی جس سے وہ موقع پر مارا گیا۔ مرنے والی طالبہ نجمہ کے حملہ آور ''ہم زبان'' تھے اور اُسے اغواء کرنے آئے تھے۔ شاید نجمہ نے اُن لوگوں کا کوئی حکم ماننے سے انکار کیا ہوگا اور ان کی ''تنظیم'' کے طلباء ونگ کا نوجوان نجمہ کو اس کے ''ہم زبان حملہ آوروں'' سے بچاتا ہوا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس کے ساتھ ہی پرویز خان نے جو کہ تنظیم کا عہدے دار بھی تھا۔ اخبار نویسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تنظیم غنڈہ گردی، دہشت گردی یا مار پیٹ کے بجائے امن اور صلح پر یقین رکھتی ہے اور وہ لوگ کمیونٹی کی خدمت کا جذبہ لے کر میدان میں اُترے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مخالفوں کی گولیوں کا جواب وہ مسکراہٹوں ہی سے دیتے رہیں گے۔ اگر پولیس نے ''مخالف تنظیم'' کے حملہ آوروں کو گرفتار نہیں کیا تو سارا شہر سراپا احتجاج بن جائے گا۔

ایک اخبار نویس نے اُٹھ کر پوچھنا چاہا کہ کیا وہ عارفہ سے ملاقات کرسکتے ہیں۔ ابھی اس کا سوال نامکمل ہی تھا جب اُس کے ایک پٹی بند بھائی نے اُسے بازو کھینچ کر نیچے بٹھادیا۔

''پاگل ہوگئے ہو کیا..... نئے آئے ہو صحافت میں..... خاموش رہو۔''

اور وہ بے چارہ خاموش بیٹھ گیا.....!!

''کوئی سوال؟'' بنے بھائی نے اخبار نویسوں سے پوچھا جن پر سکوت طاری تھی۔

''نہیں بنے بھائی۔'' ایک سرکردہ اخبار نویس نے جواب دیا۔

''اوکے۔ خدا حافظ۔'' بنے بھائی نے پریس کانفرنس کا مٹنا نمٹاتے ہوئے کہا۔

''خبر ٹھیک ٹھاک لگنی چاہئے بھائیو۔ ذاکر نے اخبار نویسوں کی طرف معنی خیز مسکراہٹ اُچھالی۔

''ضرور لگے گی ذاکر بھائی۔ کیوں نہیں لگے گی..... اُسی سینئر اخبار نویس نے بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

جس اخبار نویس نے سوال پوچھنے کی جرأت کی تھی اور اس کے ساتھی نے اُسے بٹھا دیا تھا وہ بڑا غصے میں دکھائی دے رہا تھا..... بے چارہ ریاض بھٹی نیا نیا رپورٹر بھرتی ہوا تھا۔ دفتر پہنچ کر وہ سیدھا ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں گیا جنہوں نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی فرمایا۔

بھٹی صاحب میں اس وقت بہت مصروف ہوں آپ برائے مہربانی تشریف لے جائیں۔ آپ کو اکاؤنٹس والے ہی سب کچھ بتا دیں گے۔'' ایڈیٹر صاحب نے گھنٹی کا بٹن دبا کر چپراسی کو اندر بلایا۔

''دوسرے مہمان کو لے آؤ۔'' انہوں نے ریاض بھٹی کی موجودگی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے حکم دیا۔

بے چارہ ریاض بھٹی اکاؤنٹس برانچ کی طرف چل دیا۔ اس وقت تک اُسے یہی اُمید تھی کہ شاید اُس کی تنخواہ کا معاملہ جم گیا ہو کیونکہ گزشتہ تین ماہ سے وہ ووچر پر ہی تنخواہ لے رہا تھا یا پھر.....

اس سے آگے کچھ سوچتے ہوئے اُسے خوف محسوس ہوتا تھا۔

اکاؤنٹنٹ اک نگاہ بے نیازی اس پر ڈالی اور ووچر بنا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹائپ شدہ حکم اُسے تھما دیا گیا۔ جس کے مطابق اس کی کارکردگی سے انتظامیہ مطمئن نہیں تھی اس لئے اس کی چھٹی کروائی جا رہی ہے اور طے شدہ معاہدے کے مطابق اُسے ایک تنخواہ زائد ادا کی جا رہی تھی۔

ریاض بھٹی کو فوراً سمجھ آ گئی۔

اس کے نوجوان خون نے پھر اُبالا کھایا۔

''اپنے ایڈیٹر سے کہو اگر پیسے ہی کمانے ہیں تو اس سے بہتر کئی کاروبار موجود ہیں۔ کوئی اور دھندہ شروع کر دے۔ جس میں اُس کی آمدن بھی زیادہ ہو گی اور بڑے مگرمچھ اس سے خوش بھی زیادہ رہیں گے۔''

اس نے ووچر پر سائن کر کے پیسے اپنی جیب میں ڈالے اور بوڑھے اکاؤنٹنٹ کو ہکا بکا چھوڑ کر اپنی راہ لی۔

ریاض بھٹی جانتا تھا کہ اُسے کسی جُرم کی سزا ملی ہے۔ جس اخبار میں وہ کام کرتا تھا اس پر اب تک دو مرتبہ لسانی تنظیم کا حملہ ہو چکا تھا اور رپورٹنگ سیکشن میں اُن کے لئے کسی ایسے آدمی کا وجود تو بالکل ناقابل برداشت تھا جس کے دماغ میں ان سے متعلق معمولی سا کیڑا بھی کلبلا سکے۔

روانگی سے پہلے اُس نے اپنے ڈیسک پر موجود ساتھیوں کو یہ ضرور کہا تھا کہ اگر کوئی اُلو کا پٹھا ریت میں اپنا سر چھپا کر یہ سمجھ لے کہ وہ طوفان کے خطرے سے بچ گیا ہے تو اُس سے بڑھا گدھا روئے زمین پر نہیں ہو سکتا۔

●

بابا صاحب کو اُن کے سلیپنگ رُوم میں انسپکٹر شیر گل کے فرار کی خبر سنائی گئی تھی۔ خبر سنانے والے کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کو فون کا سہارا میسر تھا۔ اگر کوئی براہ راست

یہ اُن تک پہنچا تا تو بابا صاحب اُس کو فوراً جان سے مار دیتے۔

یہ مجرمانہ غفلت تھی۔

ناقابل معافی جُرم۔

جس کسی سے بھی یہ جُرم سرزد ہوا تھا اُس کی کم از کم سزا اذیت ناک موت تھی۔ بابا صاحب نہیں چاہتے تھے کہ مستقبل میں دوبارہ اس مجرمانہ غفلت کا اعادہ ہو.....

''آستانے'' پر درجنوں سرکاری ملازموں کو دماغ ٹھیک کرنے کے لئے لایا گیا تھا اور اپنی سزا بھگت کر وہ یہاں سے واپس بھی گئے تھے۔

لیکن.....!

نہ کسی کو آنے کے راستے کا علم تھا نہ کسی کو جانے کے راستے کی خبر تھی۔ انسپکٹر شیر گل نہ صرف زندہ نکل گیا تھا بلکہ اُس نے ''آستانہ'' بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بھی جان لیا تھا کہ اس کا محل وقوع کیا ہے؟

بابا صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''کس کی غفلت سے ہوا یہ سب کچھ۔'' انہوں نے فون پر دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

فون کرنے والے نے جواب میں ڈرتے ڈرتے انہیں ساری کہانی سنا دی۔

بابا صاحب نے فوراً اپنے بھائی سے فون ملانے کا حکم دیا اور بے چینی سے خواب گاہ کے چکر کاٹنے لگے۔

اگلے ہی لمحے اُن کے خواب گاہ والے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس فون کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر ہونے والی گفتگو کو کوئی ایجنسی ٹیپ نہیں کر سکتی تھی۔

انہوں نے بڑے بھائی کو فون پر کچھ ہدایات دیں اور استراحت کے لئے چلے گئے۔ اُن کا حکم تھا کہ اب صبح سے پہلے انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

بڑے بھائی تھوڑی دیر بعد ''آستانے'' پر موجود تھے۔ اُن کی ملاقات تہہ خانے میں شیر گل والی کوٹھڑی میں بند دونوں ''رضا کاروں'' سے کروائی گئی۔ جن کے جسموں پر ایک ایک چادر موجود تھی۔

بڑے بھائی کے حکم پر دونوں کو طبی ونگ کے رضا کاروں والے کپڑے پہنائے گئے اور تالا توڑ کر باہر نکالا گیا۔

بڑے بھائی نے موت اور سزا کے خوف سے لرزاں دونوں کو تسلی دی اور اپنے ساتھ چائے پلائی۔

دونوں طبی ونگ کے رضا کاروں کے لئے یہ سلوک بڑا ہی غیر متوقع تھا۔ وہ تو خود کو کسی بڑی سزا کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ دونوں کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

چائے نوشی کے بمشکل ایک منٹ بعد انہیں اپنے سر بھاری معلوم ہوئے اور پھر دونوں بے ہوش ہو گئے۔

''ایک کو ڈرائیونگ سیٹ پر پھینک دو اور دوسری کو نرسنگ سیٹ پر پھینک دینا۔ دونوں کا ''کریا کرم'' اُسی ایمبولینس پر کر دو جو بھاگتے ہوئے انسپکٹر جلا گیا ہے۔''
بنے بھائی نے اپنے درندوں کو حکم دیا۔
چند منٹ کے لئے اندر ہی دونوں رضا کاروں کو جلی ہوئی ایمبولینس پر پھینک کر ان کے جسموں پر ایک خاص قسم کے سفوف کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد شراب کے نشے میں بدمست تنظیم کے غنڈوں نے ''رام نام ست ہے'' کا جاپ کرتے ہوئے اُن کے زندہ جسموں پر پٹرول کا چھڑکاؤ کیا اور اُنہیں آگ لگا دی۔
ابھی تک پولیس یا فائر بریگیڈ کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ جب تنظیم کے کارکنوں نے یہ کارنامہ انجام دے لیا تو پولیس اور فائر بریگیڈ کو بھی اس طرف روانگی کا حکم مل گیا۔

●

اگلے روز کے اخبارات ''بابا صاحب'' کے اس بیان کی سرخیوں سے مزین تھے کہ وہ دہشت گردوں کی کسی بھی کارروائی سے مرعوب نہیں ہوں گے۔ اس بیان میں بابا صاحب نے کہا تھا کہ کچھ ملک دشمن تخریب کاران کی تنظیم کی دشمن ایجنسیوں کی پشت پناہی سے اُن کے خلاف دہشت گردی کی مہم چلا رہے ہیں اور ان لوگوں نے ہی تنظیم کے طبی ونگ کی ایک ایمبولینس کو جو ایک بیمار عورت کو لئے جا رہی تھی روک کر آگ لگا دی۔
ایمبولینس میں موجود ڈاکٹر بمشکل اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکا جبکہ ایک نرس اور ڈرائیور ایمبولینس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گئے۔ ''زخمی ڈاکٹر'' ابھی بیان دینے کے قابل نہیں ہوا تھا۔
بابا صاحب نے ارباب حکومت کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس قسم کے واقعات سے حالات خراب ہوں گے اور اُن کے قابو میں نہیں رہیں گے جن سے کوئی بھی غیر ملکی طاقت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ انہوں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ وہ سرکاری ایجنسیوں میں موجود اُن کے دشمنوں کو لگام دیں ورنہ تنظیم کے کارکن خود انہیں لگام دے لیں گے۔
انہوں نے کہا تھا کہ گزشتہ دنوں میں پیش آنے والے دونوں واقعات سے کارکنوں میں سخت اشتعال پایا جاتا ہے کیونکہ حکومت نے ابھی تک ان کی مخالف تنظیم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور مجرم کھلے عام دندناتے پھرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔
بابا صاحب نے دونوں شہید کارکنوں کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں موجود تنظیم کے مسلح کارکنوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور حکومت کو وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔ یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔
انہوں نے اپنی طاقت کا ثبوت دے بھی دیا اور اگلے ہی دن شہر میں تین جگہ ''مخالف تنظیم'' اور اس کی حلیف سیاسی جماعتوں پر ''پُراسرار کار سواروں'' نے فائرنگ کی جس میں دس شہری زخمی ہوئے اور چھ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ٹریننگ کیمپ

''یہ ہے تمہارا نیا پاسپورٹ اور رقم۔'' بنے بھائی نے عارف چوہدری کے سامنے ایک لفافہ پھینکا۔تم کل کی فلائٹ سے انڈیا جا رہے ہو۔ کچھ دن وہاں رہ کر موج میلہ کرو۔تمہاری گھر والی جانے کب سے بانہیں پھیلائے تمہاری منتظر ہے۔

''شکریہ بنے بھائی۔''

عارف نے لفافہ اٹھالیا۔

وہ آج شام ایک ہنگامی حکم پر یہاں پہنچا تھا۔ چونکہ انسپکٹر شیر گل کے فرار میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا اس لئے کسی نے اسے کچھ نہیں کہا تھا ورنہ ''زندہ بچ رہنے والے ڈاکٹر'' کی جگہ عارف کو ''شہید ہونے جانے والا ڈاکٹر'' بننا پڑتا اور جلی ہوئی ایمبولینس سے دو کی بجائے تین لاشیں برآمد ہوتیں۔ فی الوقت انہیں شیر گل یا اس کی ایجنسی کی طرف سے کوئی ایسا سگنل موصول نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی نوٹس لیتے۔

لیکن.....!

یہ کسی وقت بھی ممکن تھا۔

تنظیم کا اصول تھا کہ جو کارکن کسی کامیاب آپریشن میں حصہ لیتے انہیں کچھ مدت کے لئے منظر سے غائب کر دیا جاتا تھا۔ خصوصاً وہ کارکن جسے بھارتی انٹیلی جنس نے اپنے کیمپوں میں تربیت دی ہوتی۔ وہ یوں بھی تنظیم کا قیمتی اثاثہ تھے۔ اس لئے ان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

عارف چوہدری کے گھر والوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔

صاحبزادے نے دنوں میں گھر کی حالت بدل کر رکھ دی تھی۔ حالت بدلی تو حالات بھی بدلے اور کبھی نان جویں کو محتاج رہنے والے عارف کے والدین کے اطوار بھی بدل گئے۔ انہوں نے بھی امیروں والی عادتیں اپنانا شروع کر دیں۔

بھارتی مہمانوں کا آنا جانا عام لگا رہتا تھا۔

انہیں آم کھانے سے مطلب تھا اس لئے گٹھلیاں گننے کا تردد کبھی نہ کرتے۔ عارف چوہدری کے ابا کچھ کچھ سمجھنے لگے تھے کہ ان کے صاحبزادے نے بھی وہی کام شروع کر دیا ہے جو اُن کے دوسرے رشتہ دار کر رہے تھے اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں تھی تجارت تھی۔

دے دلا کر سب کر رہے تھے۔

باقی کاروباروں میں کون سی ایسی ایمانداری اور اصول پسندی کارفرما تھی۔ اگر دیکھا جاتا تو زندگی کے اس حمام میں سارا شہر ہی ننگا تھا۔ پھر وہ کیوں پریشان ہوتے۔

عارف نے دبلی روانگی سے پہلے نوٹوں کی ایک گڈی اماں جان کو تھمائی تو ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ انہوں نے بے ساختہ بیٹے کی بلائیں لی اور اس کے بازو پر امام ضامن باندھ کر اُس کے ساتھ ایئرپورٹ کی طرف چل دیئے۔

ایئرپورٹ کی عمارت سے جہاز کی سیٹ تک کا فاصلہ عارف نے ایسے طے کیا تھا جیسے وی آئی پی کیا کرتے ہیں۔ کیا مجال جو کسی نے اُس کا سامان چیک کیا ہو۔

اُن کے ہاتھ میں وہ بریف کیس پکڑا تھا جس میں کچھ پیغامات اور اہم دستاویزات موجود تھیں جو مِم رخصت بنے بھائی نے بطور خاص انہیں دی تھیں اور بتایا تھا کہ وہ کسے تھمانی ہیں۔

کیا مجال جو کسی نے اس بریف کیس میں جھانکنے کا تکلف بھی کیا ہو۔

دبلی کے ہوائی اڈے پر اس کا استقبال کرنے کے لئے ''دوست'' اور میناکشی موجود تھے۔ انہوں نے عارف چوہدری کا استقبال ہیرو کی طرح کیا۔ میناکشی تو اس سے بار بار چمٹ چمٹ جاتی تھی اور اُس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

جانے کب سے اُس نے عارف کے سامنے آنسو بہانے کے لئے اپنے دل میں ذخیرہ کر رکھے تھے۔

عارف چوہدری میناکشی پر مٹے مٹے جاتے تھے۔

بات بات پر اس کی بلائیں لیتے۔

جب میناکشی نے انہیں یہ خبر سنائی کہ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق اس کے بچے کے جنم سے اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا اور اس کی مرضی کے خلاف اس کے گھر والوں نے اس کا حمل ضائع کروا دیا تو وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

یہ الگ بات کہ عارف نے اُس کا دل رکھنے کو کچھ اداکاری کے جوہر خود بھی دکھا دیئے تھے اور اس پر بظاہر دلی رنج وغم کی تصویر بننے کی کوشش کی تھی۔ جب کہ دل ہی دل میں انہوں نے اس پر خدا کا لاکھ مرتبہ شکر یہ ادا کیا تھا۔ شاید اس مرحلے پر عارف چوہدری میناکشی کے بطن سے اپنی ''سنتان'' پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

یوں بھی اب ان کے نزدیک عورت کا مصرف یہ نہیں رہ گیا تھا اور وہ میناکشی سے اپنی محبت صرف اس کے جسم تک محدود رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ عارف چوہدری کے گلے میں ''را'' نے بڑی ہوشیاری سے میناکشی کی شادی کا طوق ڈال دیا تھا۔

بریف کیس میناکشی کے ساتھیوں نے سنبھال لیا تھا اور وہ لوگ کل صبح ملنے کا وعدہ کر کے دونوں کو میناکشی کے فلیٹ پر چھوڑ گئے تھے۔

میناکشی یہاں اکیلی تھی۔

اُس نے عارف کو بتایا کہ اس کے بھائی کی پوسٹنگ بمبئی میں ہوگئی ہے اور اب وہ یہاں اکیلی رہتی ہے۔

عارف نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔

اس درمیان عارف اُسے مسلسل یقین دلاتا رہا تھا کہ وہ بھی اس کے فراق میں تڑپتا رہا ہے۔ ساری رات دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں گزار دی۔ دونوں اپنی محرومی کا بدلہ ایک دوسرے سے خوب خوب چکا رہے تھے۔

صبح میناکشی اور عارف دیر تک گہری نیند سوئے رہے۔

عارف چوہدری کی آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی فلیٹ کی کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھی اور اطلاعی گھنٹی بڑے شریفانہ انداز میں بج رہی تھی۔

میناکشی بھی اس درمیان آنکھیں ملتی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے عارف کو اپنی بیداری کا ''ثبوت'' دینے کے بعد سلیپر پہنے اور اپنا گاؤن سنبھالتی دروازے کی طرف چل دی۔ اس درمیان عارف چوہدری باتھ روم میں پہنچ چکے تھے جہاں میناکشی نے انہیں ''دوستوں'' کی آمد سے مطلع کیا۔

●

پندرہ بیس منٹ بعد وہ ''دوستوں'' کے درمیان موجود تھا۔

''میرا نام بھاٹیہ ہے.....''

ایک ڈھلتی عمر کے گہری آنکھوں والے گنجے شخص نے سندھی لہجے میں اُردو بولتے ہوئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''عارف.....'' عارف بھاٹیہ کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

دونوں کے درمیان معمول کی گفتگو ہوئی۔ اس درمیان بھاٹیہ کے ساتھ آنے والے دونوں نوجوان خاموشی سے بیٹھے عارف کا جائزہ لیتے رہے۔ انہوں نے ابھی تک کسی قسم کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔

بھاٹیہ کی گہری اور پُر اسرار آنکھیں اس قربانی کے بکرے کا وزن کر رہی تھیں اور دل ہی دل میں وہ شاید اس کی کوئی قیمت بھی لگا چکا تھا۔

''عارف صاحب انقلاب تو آپ لوگوں نے خود ہی لانا ہے۔ ہم تو آپ کے دوست ہیں اور پس پردہ رہ کر ہی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں بین الاقوامی دنیا میں ہمارا امیج ایک غیر جانبدار اور سیکولر ملک کا ہے۔ ہم کسی ہمسایہ ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ آپ پر یہ بات واضح کر دوں کہ آپ کی مدد کرنے کے لئے ہمیں حکومت کی طرف سے کوئی آشیر واد حاصل نہیں۔ یہ تو ہم کچھ لوگ جو 47ء کے بعد ہجرت کر کے اِدھر آ گئے تھے، اپنے طور پر اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد آزاد ملک قائم کریں اور ہم سب دوبارہ مل جل کر اچھے

ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کریں..... میرا کہنے سے مطلب یہ ہے کہ ہم ساری دنیا اور اپنی حکومت کو ناراض کر کے آپ کے ساتھ دوستی نبھا رہے ہیں اور جواب میں اسی سلوک کی توقع رکھتے ہیں..... میں آپ کو یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ چند روز بعد ٹریننگ کیمپ میں جا رہے ہیں۔ جہاں آپ کی ملاقات اپنے دوسرے انقلابی دوستوں سے بھی ہوگی اور ہم آپ کو چند ہفتوں میں اس قابل کر دیں گے کہ آپ پاکستان آرمی کے ساتھ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح آہنی ہاتھوں سے نمٹ سکیں، لیکن اس مرحلے میں آپ پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی یک طرفہ نہیں ہونی چاہئے۔''

بھائیہ نے ایک لمحے کے لئے رُک کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے ہوئے کن انکھیوں سے عارف کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

وہ اس کھیل کا بہت پرانا کھلاڑی تھا۔

اس کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں پاکستانی نوجوان گمراہ ہو کر خطرناک تربیت اور ہتھیاروں سے لیس، اپنے وطن فروش لیڈروں کے اشاروں پر بندروں کی طرح ناچتے ہوئے اپنی دھرتی ماں کی آبرو سے کھیل رہے تھے۔

بھائیہ پاکستانی صوبہ سندھ کے امور پر مامور سمجھا جاتا تھا اور تین اہم ترین تربیتی کیمپ براہِ راست اس کی نگرانی میں چل رہے تھے۔

''آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔'' اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔ عارف صاحب! جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنی ہمت سے بڑھ کر آپ کے ساتھ حق دوستی نبھا رہے ہیں لیکن ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ آپ کی کمانڈ کے لئے بھی یہ بات ناقابل برداشت ہوگی کہ ایک مرتبہ ہمارے ہاتھوں سے گزرنے اور اپنے چند ساتھیوں سے آشنائی کے بعد اگر آپ نے کبھی غداری کا تصور بھی کیا..... میرا مطلب ہے اگر کہیں دُور دُور تک آپ کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہاں سے تربیت حاصل کر کے واپس جانے کے بعد آپ پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ مل جائیں گے یا اپنے کسی ساتھی کا انکشاف گرفتاری کی صورت میں کر دیں گے تو آپ کو یہ باور کروا دوں کہ آپ کے سارے خاندان کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ آپ کے شہر میں کبھی کبھی جو پُراسرار لاشیں ملتی ہیں۔ اُن کی حقیقت سے آپ سے زیادہ اور کون آگاہ ہوگا کیونکہ اب آپ کا شمار لسانی تنظیم کے ذمہ دار کارکنوں میں ہونے لگا ہے..... آپ کو ناصرہ نامی لڑکی کا کیس تو یاد ہوگا جس کے بھائی کی غداری کی سزا اُسے ملی تھی اور بنے بھائی کے حکم پر اس کے ساتھ کئی دنوں تک اجتماعی آبروریزی کے بعد اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ عارف چوہدری آپ بھی دو بہنوں کے بھائی ہیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے۔''

جب بھائیہ عارف کو بظاہر ناصحانہ انداز میں سمجھا رہا تھا عارف کو اپنے جسم میں خون کی جگہ خوف سرسراتا محسوس ہوتا تھا۔

اس درمیان مینا کشی چائے اور لوازمات کی ٹرالی گھسیٹتی اندر آ گئی۔

بھائیہ نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا اب وہ لوگ معمول کی ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے۔

بھائیہ کا لب ولہجہ بدل گیا تھا اور اس کے دونوں ساتھی بھی اب شامل گفتگو تھے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں مختلف سوالات کر کے عارف چوہدری سے بہت سی کام کی باتیں معلوم کر لی تھیں اور اس کی اکثر باتوں کو نوٹ بھی کرتے جاتے تھے۔

آٹھ دس روز تک عارف نے جی بھر کے گلچھرے اُڑائے جس کے بعد انہیں دہلی کے نواحی علاقے میں واقعہ ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا۔

اُن کی نو بیاہتا مینا کشی کو ہفتے کے آخری دو دن اپنے شوہر نامدار کے ساتھ گزارنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی۔

●

بجوار شاہ کے لئے کیپٹن مالک رام کو سمجھانا ناممکن ہو چکا تھا۔

یہ شخص ہر کام اپنی مرضی اور منصوبے کے مطابق کرنے پر بضد تھا۔ بجوار شاہ اگر اُسے مشرق کی سمت لے جانا چاہتا تو چند قدم اُس کے ساتھ چل کر اچانک وہ اپنی سمت تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے چاروں ساتھی بھی ایک ایک کر کے بجوار شاہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

لیکن.....!

کیپٹن مالک رام نے اُسے سختی سے اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ اُس کے ساتھیوں کو اس قیام گاہ یا پناہ گاہ سے ہرگز آگاہ نہ کرے۔ اس کی ہدایت پر بجوار شاہ کو اس کے چاروں ساتھیوں کو چار الگ الگ ٹھکانوں پر رکھنا پڑا تھا اور بوقت ضرورت ہی وہ اُنہیں اپنے پاس بلاتا تھا۔

جس ماحول میں پل کر بجوار شاہ جوان ہوا تھا وہاں ایسی صورتحال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات کرنے والوں کو وہ زمین میں زندہ گاڑ دیتا تھا۔ اس کے بعد کیپٹن مالک رام کی طرف سے ہر بات میں اپنی مرضی ٹھونسنا گو کہ ناقابل برداشت تھا۔

لیکن.....!

''وڈا سائیں'' نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ آنے والے مہمان کی ہدایت کے مطابق کام کرے اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دے گا۔

''بچہ! یہ ہمارے موالی ہیں۔ قدم قدم پر ہمارا سہارا بنتے ہیں۔ جس بندے پر بُرا وقت آنے لگے اُسے ہم ان کے پاس ہی تو بھیجتے ہیں پناہ لینے کے لئے اور بچہ! یہ جو سارا ٹھاٹھ باٹھ ہے ناں..... یہ بھی انہی کے دم قدم سے ہے..... بابا! تم تو جانتے ہو کہ حکومت اور اس کے چمچے کس طرح ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ ہم اکیلے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے..... بچہ! سوچ پاس ڈاکو پیدا کر کے ہم ایک مضبوط اور منظم فوج سے ٹکر نہیں لے سکتے..... اس کے لئے ہمیں کوئی مضبوط آسرا چاہئے تم جانتے ہو کہ ہاریوں کا موڈ کیسا چل رہا ہے۔ اگر انہوں نے ہمارے سروں سے ہاتھ اُٹھا لیا تو کوئی بھی ہاری کا بیٹا یہاں کا ایم پی اے یا ایم این اے بن کر ہماری گردنیں دبوچ لے گا..... بابا! ہم اتنا مہنگا اور جدید ترین اسلحہ کہاں سے خریدیں گے۔ یہ جو سمگلنگ کا دھندہ ہے ناں۔ اس سے تو بمشکل ڈیرے کا خرچ چلتا ہے۔

بابا بجوار شاہ! وڈیرے بنے ہو تو کچھ سیاست کے داؤ پیچ بھی سیکھ لو۔"

وڈا سائیں نے اُسے کہا تھا۔

بجوار شاہ کو وڈا سائیں سے اس لئے عقیدت نہیں تھی کہ وہ ان کے لئے آزاد ملک بنانے جا رہا تھا۔

اس کے لئے اب بھی کوئی قدغن نہیں تھی۔ وہ جب چاہتا، جو چاہتا، اپنی وڈیرہ شاہی کے بل بوتے پر کر گزرتا۔ سارے گوٹھ میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے حکم کے سامنے دم مار سکے۔

یہاں کی انتظامیہ حکومت کی نمک خوار ضرور تھی لیکن اس کی وفاداریاں بجوار شاہ سے تھیں۔ بجوار شاہ اگر چاہتا تو کوئی آفیسر یہاں رہ سکتا تھا ورنہ کسی کی مجال نہیں تھی کہ یہاں چند دن بھی سرکاری آسرے پر بسر کر سکے۔

جس کی بہو بیٹی کو وہ چاہتا، اغواء کر سکتا تھا۔

اُسے وڈا سائیں سے اگر کوئی مطلب تھا تو صرف اتنا کہ اس کے ذریعے بجوار شاہ کا مال سرحد کے آر پار با آسانی آ جا سکتا تھا۔ اس کے پالتو غنڈے اور ڈاکو اس کے حکم پر کوئی بھی کارنامہ انجام دینے کے بعد بھارت میں پناہ حاصل کر سکتے تھے اور حالات نارمل ہونے پر پھر واپس آ کر اس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلانے لگتے تھے۔

بجوار شاہ کی زمینیں جانے کب کی بانجھ ہو گئی تھیں۔

جو زرخیز زمین تھی وہ اس کے بزرگوں کی عیاشیوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اب اس کا سارا دھندہ اغواء برائے تاوان، ڈکیتیاں اور سمگلنگ کے بل بوتے پر چل رہا تھا۔ اس نے کراچی اور حیدر آباد میں عالیشان کوٹھیاں بنوا رکھی تھیں اور گاؤں میں اس کا ڈیرہ یورپ کے کسی بھی محل سے کم شاندار اور کم سہولیات کا حامل نہیں تھا۔

اس ڈیرے پر "شکار" کھیلنے کی آڑ میں بڑے بڑے سرکاری اور درباری عمال اکثر راتوں کو گھناؤنے کھیل کھیلا کرتے تھے۔

اس علاقے میں آنے والے ہر سرکاری افسر کے سامنے مالی اور جسمانی رشوتوں کے اتنے بڑے انبار بجوار شاہ لگا دیا کرتا تھا کہ پھر وہ ساون کا اندھا بن جاتا تھا۔

ہوس میں ڈوبے، مجرمانہ ذہنیت کے حامل یہ افسران جو حادثاتی یا سفارشی طور پر عنان حکومت سنبھالتے تھے ذرا موقع ملنے پر اپنی اصلیت دکھا دیتے۔ انہوں نے تو سرکاری نوکریاں ہی اپنی محرومیوں کا بدلہ چکانے کے لئے حاصل کی تھیں۔

سرحد پار سے "را" کی تربیت یافتہ فاحشائیں "وڈا سائیں" کے حکم پر فوراً ان کے پہلو کو گرمانے کے لئے بجوار شاہ کے ڈیرے پر پہنچا دی جاتی تھیں جہاں یہ ضمیر فروش ہوس میں اندھے ہو کر اپنی حیوانی حس کی تسکین میں اتنے محو ہو جاتے کہ انہیں اپنے مرتبے کا خیال آتا نہ ہی اس عہد کا پاس کرتے جو انہوں نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے حکومت اور خدا کے سامنے کیا تھا۔

''را'' کی تربیت یافتہ فاحشائیں ان کی سرکاری جیپوں میں آزادی سے گھومتیں اور اپنے جسم کے ان پجاریوں کے ذہنوں میں محفوظ سرکاری راز افشاء کروانے کے بعد اگلی ملاقات کا وعدہ کر کے اپنا راستہ ناپتیں۔

یہ سارا گورکھ دھندہ بجوار شاہ نے وڈا سائیں کے حکم پر پھیلایا تھا۔

لیکن.....!

اس کے بدلے وہ اپنے تجوریوں کا منہ جس تیزی سے بھر رہا تھا اُس کے بعد یہ سودا اس کے لئے بہت سستا ہو گیا تھا۔

●

آج ہم بہاول سے ملاقات کریں گے تاکہ کل اپنا کام کرنے کے بعد واپس چلے جائیں۔''

اپنے ساتھیوں کی آمد کے تین روز بعد جب انہیں مطلوبہ اسلحہ مل گیا تو کیپٹن مالک رام نے بجوار شاہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... شام کو چلیں گے۔'' بجوار شاہ نے جواب دیا۔

''ہم اس کے ڈیرے پر نہیں جائیں گے۔ اُسے گوٹھ ماچھی والے اڈے پر بلا لو۔''

مالک رام نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ایک لمحے کے لئے بجوار شاہ کا خون ضرور کھولا۔

لیکن.....!

دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔

''بابا! یہ میرا علاقہ ہے۔ چڑیا میرے حکم کے بغیر پر نہیں مار سکتی۔ تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اس کے ڈیرے پر جانے سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹے گی۔'' اس نے بڑے دھیمے لہجے میں مالک رام سے کہا۔

''سائیں! آپ کا بہت دھنواد! ہمیں آپ پر پورا پورا بھروسہ ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے آپ پر کوئی آنچ آئے..... میرے خیال میں آپ کو میری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔'' مالک رام نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے بابا۔ ٹھیک ہے۔'' بجوار شاہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

چند منٹ بعد بجوار شاہ کا خاص آدمی بہاول ڈاکو کے لئے ایک اہم پیغام لے کر جا رہا تھا جس میں اسے شام کے بعد گوٹھ ماچھی والے خفیہ اڈے پر پہنچنے کی تلقین کی گئی تھی۔

سہ پہر کو اچانک ہی مالک رام کے کہنے پر سجاول شاہ کو روانگی کا پروگرام بنانا پڑا۔

مالک رام ہی کی خواہش پر اس کے دو ساتھیوں کو دو مختلف راستوں سے دو الگ الگ گروپوں کی شکل میں یہاں سے لے جایا گیا تھا۔

شام ڈھلے سب شیطان ایک جگہ جمع ہو چکے تھے۔

اس وقت بہاول کے سامنے کیپٹن مالک رام سجاول کے روپ میں موجود تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص بھارتی فوج کا کیپٹن ہے۔

سجاول، ایک کاغذ پر پنسل کی مدد سے ایک نزدیکی جگہ سے گزرتی ریلوے لائن کا نقشہ بنا کر بہاول کو سمجھا رہا تھا کہ یہاں سے پنجاب سے آنے والی ایکسپریس نے کل شام کو گزرنا ہے۔

اُس نے ریلوے لائن کے گرد نشانات لگا کر بہاول کو سمجھایا تھا کہ کس کس جگہ وہ لوگ چھپیں گے۔ کہاں کہاں سے فائرنگ ہوگی۔ اگر مزاحمت ہوئی تو اس کا مقابلہ کس طرح اور کس حکمت عملی سے کیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام مکمل ہونے کے بعد فرار کے لئے کس نے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔

''سائیں بہت خطرناک کام ہے..... کہیں میرے ساتھی انکار ہی نہ کر دیں۔ بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے۔''

بہاول کچھ گھبرا رہا تھا۔

''تمہیں ڈاکو کس نے بنایا ہے؟ تمہیں تو کوئی اٹھائی گیر ہونا چاہئے تھا۔'' سجاول نے اس کا تمسخر اڑایا تو بہاول کو طیش آ گیا۔

''اپنی زبان بند کرو۔ اگر سائیں کا حکم نہ ہوتا تو ابھی تمہارے زبان کاٹ کر رکھ دیتا۔'' اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

''بابا بہاول..... بابا چپ کرو..... تم حالات کو نہیں سمجھتے۔ ڈی سی بڑا اکھڑ بندہ ہے۔ بہت لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔ تمہارے دونوں گرفتار بھائیوں کو پھانسی لگوا دے گا۔ اس کا تبادلہ کروانے کے لئے یہ کام ضروری ہے..... تم یہ سنبھالو اور بندے سجاول سائیں کے حکم کے مطابق کل وہاں چھپا دینا۔ سجاول اور اس کے ساتھ وہاں موجود ہوں گے۔''

سجاول شاہ نے معاملہ خود سنبھال لیا اور کرنسی نوٹوں سے بھرا ایک چھوٹا سا بیگ بہاول کی طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک ہے سائیں جو حکم۔'' بہاول نے بددلی سے نوٹوں کا بیگ تھام لیا۔

O

لاہور سے کراچی جانے والی ایکسپریس معمول کے مطابق لیٹ تھی۔

جب ڈرائیور اس علاقے میں پہنچا تو آسمان پر تارے جگمگانے لگے تھے جبکہ انہیں شام سے پہلے کراچی ہونا چاہئے تھا۔

لائن آگے کلیئر تھی۔

ڈرائیور نے رفتار معمول سے کچھ بڑھادی تھی اور اب وہ انجن میں مستعد کھڑا باہر فضاؤں میں گھور رہا تھا۔

اچانک ہی اُسے بریک کی طرف بادلِ نخواستہ ہاتھ بڑھانا پڑا کیونکہ کچھ آگے والا سگنل ڈاؤن نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ آگے کچھ رکاوٹ ہے۔

گاڑی ایک مرتبہ پھر رُک گئی۔

جس جگہ وہ لوگ رُکے تھے یہاں دُور دُور تک سوائے جھاڑیوں اور درختوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

سواریوں نے ایک مرتبہ پھر غصے سے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ قریباً تمام ڈبوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ مسافر گردنیں باہر نکالے صورتِ حال کو سمجھنے میں کوشاں تھے کچھ لوگ گاڑی سے نیچے بھی اُتر آئے تھے جب اچانک ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ریل کی پٹڑی کے دونوں اطراف سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔

اچانک صورتحال نے مسافروں کو دہشت زدہ کر دیا۔ خوف سے چیختے چلاتے کچھ لوگ ڈبوں سے باہر چھلانگیں لگانے لگے اور کچھ ڈبوں کی سیٹوں کے نیچے دبک گئے۔

پندرہ منٹ تک مسلسل فائرنگ ہوتی رہی۔

اس کے بعد زبردست دھماکے ہوئے۔ حملہ آور راکٹ لانچر سے گولے پھینکنے لگے۔ چار گولے یکے بعد دیگرے انجن میں لگے۔ ڈرائیور اور اُس کا مددگار انجن کے ساتھ ہی بھک سے اُڑ گئے۔

اس کے ساتھ ہی فائرنگ رُک گئی۔

اب وہاں آسمان کا کلیجہ شق کرتی زخمیوں کی چیخ و پکار تھی یا پھر دم توڑتے مسافروں کی بے بسی۔

انجن کی آگ دوسرے ڈبے تک منتقل ہو چکی تھی جہاں سے جھلستے مسافر دیوانہ وار باہر چھلانگیں لگا رہے تھے۔

چاروں طرف کہرام برپا تھا۔

حملہ آور جس طرح یہاں پہنچے تھے اُسی طرح خون کی ہولی کھیل کر واپس لوٹ گئے۔

●●●

روایت

شیر گل کی اچانک گمشدگی نجمہ کے قتل اور تنظیم نے گو کہ ''ایجنسی'' کے لوگوں کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا لیکن اُنہیں ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر شیر گل کہاں غائب ہو گیا۔

تنظیم میں موجود ایجنسی کے ایک ''سورس'' نے یہ اطلاع تو پہنچا دی تھی کہ وہ لوگ شیر گل کو اغواء کر کے اسے سبق سکھانے کے لئے یہاں لائے تھے لیکن یہ بھی تصدیق کر دی تھی کہ وہ جان بچا کر نکل گیا ہے۔

''آستانے'' کے باہر کیا واقعات پیش آئے۔

اس سوال کا حتمی جواب ابھی ان لوگوں کو نہیں مل رہا تھا ایک خیال یہ بھی تھا کہ فرار ہوتے ہوئے شیر گل کہیں تنظیم کے رضا کاروں کے ہاتھوں نہ مارا گیا ہو؟

لیکن.....!

ابھی تک اس مفروضے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ جب تک وہ لوگ اس کی لاش اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔

اس درمیان شہر کے مختلف کونوں کھدروں سے ملنے والی پُر اسرار لاشوں پر ایجنسی نے کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور معمول کے مطابق جب بھی کوئی بے شناخت لاش جس پر جگہ جگہ تشدد کے نشانات موجود ہوتے تھے ملتی، ایجنسی کے لوگ بطور خاص اس ہسپتال میں اس خیال سے اس کی شناخت کے لئے جاتے کہ شاید یہ انسپکٹر شیر گل کی لاش ہی نہ ہو۔

آج پندرہ دن ہونے کو آ رہے تھے لیکن اس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اُس کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ اگر زندہ ہوتا تو اپنی بہن کے جنازے پر ضرور آتا۔

شیر گل کی والدہ کی طرف سے اعلیٰ حکام کا دروازہ کھٹکھٹانے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ ''ایجنسی'' کی طرف سے مایوسی کا اظہار کر رہی تھی۔ اُس کا اصرار بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ زندہ یا مردہ اُس کے بیٹے کی اطلاع اُن لوگوں کو ضرور ملنی چاہئے۔ ایک سرکاری ملازم کا اس طرح یکا یک غائب ہو جانا چُپ چاپ نظر انداز کر دینے والی بات بھی نہیں تھی۔

اس روز جب ایجنسی کے افسران کی ایک ٹیم اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں شیر گل کی برادری کے لوگ اس مسئلے کو پریس کے ذریعے زیادہ ہوا نہ دینے لگیں، اُنہیں سمجھانے اور اُس کی بہن کا پُرسہ کرنے کے لئے اس کے گھر پر پہنچی تو شیر گل کا چچا خان زمان اپنے رشتہ داروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

ایجنسی کے افسرِ اعلیٰ نے نجمہ کی شہادت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے جب ان لوگوں سے کہا کہ وہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے تو اچانک ہی خان زمان کے غیر متوقع جواب نے اُسے بوکھلا دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں جناب..... یہ بوجھ ہماری گردن پر ہے۔ ہم اسے اتارنا جانتے ہیں۔ آپ برائے مہربانی جس طرح بھی ممکن ہے شیر گل کی زندگی یا موت کی تصدیق کریں تا کہ ہم ذہنی طور پر ایک راہ لگ سکیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر ہمیں کس قدر پریشانی لاحق ہوگی۔'' ریٹائرڈ صوبیدار خان زمان نے کہا۔

افسر اعلیٰ صاحب چند ثانیے تک تو اس کی طرف حیرانگی سے دیکھتے رہے پھر اچانک ہی سنبھل گئے۔

''ہماری کوشش جاری ہے۔ آپ خود ریٹائرڈ فوجی ہیں، صورتِ حال کو بہتر سمجھتے ہوں گے..... یہ تو ممکن نہیں کہ اپنے ایک افسر کی اس طرح اچانک گمشدگی پر ہم ہاتھ پیر باندھ کر بیٹھ جائیں گے۔ یہ سرکاری معاملہ ہے خان صاحب! ہم سے زیادہ اس کی سنگینی سے اور کون باخبر ہوگا..... آخر وہ ہمارا ہونہار آفیسر ہے۔ اگر اس طرح سرکاری افسران اغواء ہونے لگیں تو.....''

اپنی بات اس نے ادھوری چھوڑ دی تھی اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے؟ اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے اُسے مناسب الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

''بہر حال آپ کا شکریہ!'' صوبیدار خان زمان نے مصافحے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اپنے دفتر پہنچ کر افسر اعلیٰ نے ایک انسپکٹر کو بطورِ خاص ہدایت کی تھی کہ وہ صوبیدار خان زمان پر خصوصی نظر رکھے۔

''مجھے اس بوڑھے فوجی کے ارادے ٹھیک نظر نہیں آتے۔ اُس نے اپنے ماتحت کو رازداری سے سمجھایا۔

●

شیر گل کا جسم تو زخموں سے چور چور تھا ہی..... لیکن نجمہ کی موت کی خبر نے اُسے اندر سے بھی توڑ کر رکھ دیا۔

اُسے اپنا چھ فٹ کا وجود ریت کی طرح بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی بہن کی شہادت کی خبر اُسے اخبارات کے ذریعے ملی تھی۔ رہ رہ کر یہ پچھتاوا اُس کی جان کو آ گیا تھا کہ آخری لمحات پر اُس نے اپنے دل کی بات کیوں نہ مان لی۔

کوئی طاقت اُسے بار بار احساس دلا رہی تھی کہ اُس کی بہن کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے اور وہ اس کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

وہ جسمانی طور پر اپنی بہن کے جنازے میں شمولیت کے قابل ہی نہیں رہا تھا جس رات وہ ''آستانے'' سے فرار ہوا سیدھا شہر کے جنوبی حصے میں اپنے ایک دوست کے گھر پہنچا تھا جو ایک اور سرکاری محکمے میں ملازم تھا اور ایک سرکاری کالونی میں رہائش رکھنے کے سبب شیر گل کو یہ امید ضرور تھی کہ وہ یہاں چند روز اطمینان سے گزار کر اپنی ذہنی اور جسمانی حالت کو معمول پر ضرور لا سکے گا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے بدن کی تمام ہڈیاں سلامت تھیں۔اس عقوبت خانے سے نکلنے والا شاید وہ ایسا واحد خوش قسمت رہا ہوگا جو اپنے پورے سلامت جسم کے ساتھ جان بچانے میں کامیاب رہا۔

بے گناہ نجمہ کی موت نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ایک لمحہ اُس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی بہن کو بھائی کے جُرم کی سزا دی گئی ہے۔اُسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ یہ لوگ اُس کی بہن کو قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اُسے اغواء کر کے بے آبرو کرنا چاہتے تھے اور حملہ آوروں کے گھناؤنے عزائم کو سمجھتے ہوئے اُس نے اپنی جان دے دینا احسن خیال کیا ہوگا۔

بہن کی موت کا جو جان لیوا پچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا، اُس سے نجات کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اُس کے قاتلوں کو اپنے انجام تک پہنچایا جائے۔

تنظیم کے آگے مقامی انتظامیہ کی حیثیت کیا تھی۔

اس کا شیر گل سے زیادہ بہتر اندازہ کون لگا سکتا تھا کیونکہ اس کا تعلق ایک حساس ایجنسی سے تھا جس کا کام ہی تنظیم کے مکروہ عزائم پر نظر رکھنا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس کی ایجنسی کے لوگ ''نظر رکھنے'' سے آگے کچھ نہیں کر سکتے۔کیونکہ سیاست اور ہوس اقتدار کی اپنی فصیلوں کو عبور کرنا کسی بھی حساس ادارے کے دائرہ اختیار میں شامل نہیں تھا۔

جاری ہے...

''بابا صاحب'' کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے والے ہوس اقتدار کے اندھوں کی قطار لگی رہتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ بابا صاحب ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ ہر کوئی اس کے چرن چھونے کو باؤلا ہوا جاتا تھا۔

لیکن.....!

نجمہ کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔

بالآخر اُس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا جس کے ہاں اُس نے پناہ لے رکھی تھی۔

''شیر گل میں بھی تمہیں یہی کہنے والا تھا کہ سرکار دربار سے اپنی معصوم بہن کے خون کا حساب نہ مانگنے جانا۔ خواری اور ذلت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ آج تمہیں اپنی روایت پر انحصار کرنا ہوگا..... اپنے دشمن سے بدلہ لینے کی روایت۔ اس دشمنی کی بنیاد ہم نے نہیں رکھی۔ ذلیل دشمن کو اگر تم سے کچھ شکایت تھی تو وہ تم پر حملہ کرتا۔ یہ بے غیرتی ہوگی اگر ہم اسے اپنی بہن کا خون معاف کر دیں۔ شیر گل اب تمہارے قبیلے کے جوان اتنے کمزور بھی نہیں ہو گئے کہ وہ نجمہ کے خون بہا کے لئے سرکاری ایوانوں پر ماتھا رگڑتے پھریں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ تنظیم کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمہاری ایجنسی ہی کیا یہ حکومت بھی اس کے سامنے بے بس ہے لیکن ہمیں مثال قائم کرنا ہوگی۔ ہمیں بتانا ہوگا کہ کم از کم ہم بے بس نہیں ہیں..... ہم میں ابھی اتنی غیرت باقی ہے کہ اپنی بے گناہ بہنوں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکیں.....'' اس کے ساتھی کا جوش دیدنی تھا۔

''ثابت خان۔ تم کسی بھی طرح چچا زمان خان کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ ملاقات کی سبیل نکالو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ایجنسی کے لوگ سائے کی طرح اُس کے پیچھے لگے ہوں گے۔ کہیں اس کے تعاقب میں وہ مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ میں ابھی پیش نہیں ہونا چاہتا۔ ثابت خان اگر یہ قرض چند روز تک میں نے نہ اُتارا تو خدا کی قسم میں دم گھٹنے سے مر جاؤں گا۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنا کام خوب سمجھتا ہوں۔''

اُس روز شام گئے ثابت خان پُرسہ کرنے کے بہانے خان زمان تک پہنچ گیا۔ اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ شیر گل کا خدشہ ٹھیک ہے۔ یہاں دو پُراسرار چہرے اُسے نظر آئے تھے۔ اُسے حیرانی بھی ہوئی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ ظالموں پر گرفت کرنے کے بجائے ان لوگوں کو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں مظلوم اپنا انتقام نہ لے لیں۔

گھر کے ایک کمرے میں اُسے نے رازداری کے ساتھ خان زمان تک ساری کہانی منتقل کر دی تھی اور اُسے بتا دیا تھا کہ اُن لوگوں کی آپس میں ملاقات کس طرح ممکن ہے؟

''تم مطمئن رہو بچہ! میں نے بھی پندرہ سال ملٹری انٹیلی جنس ڈیوٹی کی ہے۔ میں جانتا ہوں ہمیں کس طرح اور کہاں ملنا ہے۔''

اُس نے ثابت خان سے شیر گل کا ایڈریس لے کر اُسے اس نصیحت کے ساتھ واپس بھیجا کہ شیر گل کو فی الوقت اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے دینا۔

●

عارفہ پر ایک طرح سے جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

اس نے ابھی تک ذہنی طور پر اپنے والدین کے بزدلانہ فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کی بے گناہ اور پاک دامن سہیلی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کیا تھا اور وہ اس کے جنازے میں بھی تنظیم والوں کے خوف سے شرکت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی جس کی زندگی کا مقصد تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا سہارا بننا اور وقت آنے پر اپنا گھر بسانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

لیکن.....!

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی سوچ کا دھارا بدلنے لگا تھا۔

اُس کے اندر ایک نفرت سی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اُس درندے کا منہ نوچ لے جس نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی معصوم سہیلی کو محض اس جُرم میں مار ڈالا کہ اُس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی جرأت کیوں کی۔

پہلے پہل تو وہ چپ رہی تھی۔ شاید ابھی وہ صدمے کی حالت سے گزر رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اُس میں ایک تبدیلی آئی اور اُسے اپنے والدین کی بزدلی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگلے روز تو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس مسئلے پر اپنے باپ سے باقاعدہ بحث بھی کر لی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ پولیس تک کس طرح پہنچائے۔ وہ چاہتی تھی کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اس گھناؤنے جرم کی خبر کر دے۔

لیکن.....!

وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اُس روز جب اچانک اُس نے اپنے والدین سے نجمہ کے گھر جانے کی ضد شروع کی تو وہ پریشان ہو کر رہ گئے۔

''بیٹی تم صورتِ حال کو جاننے کے باوجود بالکل بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تو بالکل ایسی ہی خواہش ہے جیسے کوئی بچہ آسمان سے چاند تارے توڑ لانے کی ضد کرنے لگے۔''

اس کے بوڑھے اور جہاندیدہ باپ نے اُسے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

''ابا میاں ایک تو آپ نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بلوایا۔ قاتلوں کو مظلوم بنوایا اور اب اپنے ضمیر کی خلش مٹانے کے لئے آپ مجھے اپنی مرحومہ سہیلی کی والدہ کے گھر جا کر پُرسہ کرنے سے بھی روک رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا ہم سب نے کل خدائی عدالت میں نہیں جانا۔ یہی ہے آپ کی تربیت جس کا رونا آپ

ساری زندگی روتے آئے ہیں۔"

وہ پھٹ پڑی۔

"چپ کر جا لڑکی۔ خدا کے لئے خاموش ہو جا۔ اگر تیرے باغیانہ خیالات کی بھنک بھی اس گھر کی چار دیواری سے باہر نکل گئی تو زمین ہم پر تنگ ہو جائے گی۔ بیٹی تجھے ثریا کی کہانی شاید بھول گئی ہے۔ اُس نے یہی جُرم کیا تھا۔ اس معصوم نے بھی صرف اغواء کاروں کی شناخت کی تھی۔ اس کے بعد کس طرح اجتماعی آبروریزی کے بعد اُس کی مسخ شدہ لاش گھر کے دروازے کے سامنے پھینکی گئی تھی۔ بیٹی! اُس کا باپ آج تک پاگل بنا سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے۔ سارا شہر جانتا ہے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کس نے کیا ظلم کیا، لیکن کسی کی جرأت ہے جو تنظیم کے خلاف منہ کھولے..... بیٹی ہم بے چارے تو خیر کسی قابل ہی نہیں لیکن جو لوگ اپنی حفاظت کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ بھی گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔ بیٹی! میں بھی جانتا ہوں کہ اس بڑھاپے میں جب کسی بھی لمحے خدا کے ہاں حاضری کا بلاوا آ سکتا ہے، ہمیں قوانین قدرت کو چیلنج نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن تمہارے سچ کی قیمت کیا ہوتی؟ شاید تم اس کا اندازہ نہ کر پاتی۔ تمہارے اکلوتے بھائی کو یہ درندے کتے کی موت مار ڈالتے اور ہم سب کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیتے..... کیا تمہیں یہ سب کچھ گوارا ہوتا؟ کیا تم ثریا جیسے انجام کا تصور بھی کر سکتی ہو.....؟"

عارفہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دی۔

"لیکن امی جان اُن لوگوں کو ہمارے تعزیت کے لئے جانے پر کیا اعتراض ہوگا۔"

اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بغاوت سمجھا جائے گا۔ بیٹی! وہ سمجھیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہونے لگا ہے اور کسی بھی لمحے تم سچ کہہ سکتی ہو۔ اس طرح تو تمہارے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

امی جان کی بجائے ابا میاں نے جواب دیا۔

●

عارفہ نے ایک مرتبہ پھر دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ جو بغاوت اس کے اندر جنم لے رہی ہے اس کی قیمت اُسے اکیلے ادا نہیں کرنی پڑے گی۔ سارا خاندان اس عذاب کا شکار ہوگا۔

پانچ چھ روز بعد اُس نے بالآخر کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح گھر بیٹھے رہنے سے تو اب اُسے وحشت ہونے لگی تھی۔

عارفہ کے لئے یہ تجربہ بڑا حیران کن تھا کہ کالج میں کسی بھی لڑکی نے کھل کر نجمہ کی حمایت کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو احساس نہیں دلایا تھا کہ اس نے

بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

تنظیم کے سٹوڈنٹ ونگ کی تین چار لڑکیوں نے جو اپنے ''کارناموں'' کی وجہ سے کالج میں خاصی شہرت رکھتی تھیں البتہ اُس کو ''مجرموں کو بے نقاب'' کرنے پر مبارک باد دیتے ہوئے اُس کا حوصلہ بڑھایا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ تنظیم کی اعلیٰ کمان اس کے اس جرأت مندانہ بیان پر بہت خوش ہوئی ہے اور آج سے اس کا شمار تنظیم کے خاص وفاداروں میں ہونے لگا ہے۔

عارفہ کے لئے یہ نئی مصیبت آ گئی تھی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ اس طرح حیلوں بہانوں سے یہ لڑکیاں اُس کی نیت میں آنے والے کسی بھی فتور سے آگاہ ہونے کی سعی لاحاصل کر رہی ہیں۔

یہ اطلاع کہ وہ تنظیم کے ''وفاداروں'' میں شامل ہو گئی ہے۔ اس کے لئے خطرے کی گھنٹی ضرور بن گئی تھی۔

اگر خدانخواستہ تنظیم کے کسی بڑے نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی تو وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

ان ہی پریشان کن سوچوں کے ساتھ وہ کالج سے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

اس شہر پر موسم بھی چند دنوں سے بڑا عجیب اُترا تھا۔ اچانک ہی گھٹائیں لہراتیں اور چھاجوں مینہ برسنے لگتا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ وہ اکیلی ہی تیز تیز قدموں سے بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ جب اچانک ایک سڑک کا موڑ مڑتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار اُس کے قریب آ کر رک گیا۔

''آپ.....!'' عارفہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں.....!! سوار جس نے اپنا چہرہ ہیلمٹ سے ڈھانپ رکھا تھا اب ہیلمٹ ہاتھ میں پکڑے اس سے مخاطب تھا۔

''یہ شیر گل تھا۔''

''مجھے افسوس ہے.....'' عارفہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''دیکھو عارفہ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے کسی مجبوری کی حالت میں یہ بیان دیا ہوگا۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ اس طرح راستے میں کسی خاتون کو روک کر بات کرنا میرے نزدیک بھی انتہائی معیوب ہے۔ میری تم سے صرف ایک درخواست ہے کہ اگر تم قاتلوں کو پہچانتی ہو تو اُن کی شناخت مجھے بتا دو۔''

شیر گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نجمہ کا خون ٹھنڈے ذاکر نے کیا تھا۔'' عارفہ پھٹ پڑی۔

خدا جانے وہ کب سے اس لمحے کی منتظر تھی۔

اُس نے تنظیم کے طلباء ونگ کے ان تمام غنڈوں کی نشاندہی کر دی جنہیں وہ پہچانتی تھی۔

''شیر گل میں ایک کمزور لڑکی ضرور ہوں۔ میرے والدین کی بے بسی نے میرے منہ پر تالے ضرور لگا دیے ہیں لیکن میرا ضمیر ابھی زندہ ہے..... اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے.....''

''شکریہ! میری اگلی درخواست ہوگی کہ اس ملاقات کا تذکرہ تم زندگی میں کبھی بھی کسی سے نہ کرنا۔'' شیر گل نے کہا۔

''میں تمہاری کامیابی کے لئے خدا سے دُعا گو ہوں.....'' عارفہ نے جواب دیا۔

لیکن.....!

اُس کے منہ سے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی شیر گل نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔ آسمان اچانک اتنے زور سے دھاڑا کہ شہر نگاراں کے مکینوں کے دل دہل کر رہ گئے۔

●

خان زمان نے اچانک ہی لاہور چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

افسرِ اعلیٰ کے سامنے ماتحت کی رپورٹ موجود تھی جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ خان زمان کل صبح سات بجے والی ٹرین سے اپنے گاؤں واپس جا رہا تھا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

نجانے کیوں اُنہیں خان زمان کی طرف سے کسی نہ کسی مصیبت کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس بوڑھے فوجی کے تیور اُسے ہمیشہ خطرناک دکھائی پڑے تھے۔

اس خبر نے اُن کے سر سے ایک بوجھ اُتار دیا تھا۔ اپنی تشفی کے لئے انہوں نے ایک انسپکٹر کو مستقل خان زمان سے چپکا دیا تھا جو اُسے دو تین سٹیشن دور تک چھوڑ کر آیا تھا اور اب اُس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ خان زمان اس شہر کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔

خان زمان نے واقعی شہر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن.....!

تعاقب کرنے والے کو علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ اس نے صرف ساہیوال تک ہی سفر کیا تھا، جہاں وہ چپ چاپ ٹرین سے اُتر گیا۔

عام درجے میں سفر کرنے کے سبب نہ کسی نے اس کے چڑھنے کا نوٹس لیا نہ ہی اُترنے کی پرواہ کی۔ ٹرین کا یہ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کسی کو کسی دوسرے کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

ساہیوال کے سٹیشن پر اُس کا ایک میزبان اس کا منتظر تھا۔

دونوں چپ چاپ ایک رکشہ میں بیٹھ کر اپنے گھر تک آ گئے جہاں شام ڈھلنے تک خان زمان نے آرام کیا۔

شام کے بعد لاہور جانے والے ایک ٹرک پر وہ ڈرائیور کے مددگار کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اُس نے اپنا حلیہ بالکل ڈرائیوروں جیسا بنایا ہوا تھا۔

ٹرک اپنے معمول کے مطابق علی الصباح اڈے پر پہنچ گیا۔

ٹرک سٹینڈ پر کسی نے اُس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔

یہاں بھی ایک میزبان جو اس شہر میں ٹیکسی چلاتا تھا اس کا منتظر تھا۔ میزبان نے خان زمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر میٹرڈاؤن کر لیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک سرکاری کالونی تک پہنچ گیا۔ اس کالونی کے ایک کوارٹر میں جس کے دروازے کے باہر ثابت خان کے نام کی تختی لگی تھی ٹیکسی رُک گئی۔

زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔

کالونی میں رہنے والے سرکاری ملازمین اپنے اپنے کام پر روانہ ہو رہے تھے۔ وہ سب بڑی افراتفری کے عالم میں دکھائی دے رہے تھے۔

کسی کو کیا پڑی کہ ثابت خان کے گھر کے باہر رُکنے والی ٹیکسی سے اُترتے مسافر کے متعلق کچھ سوچتا۔

اس کالونی میں ملک کے قریباً تمام صوبوں کے لوگ رہائش پذیر تھے اور مہمانوں کا آنا جانا اکثر یہاں لگا رہتا تھا۔

یوں بھی ثابت خان کوئی ایسا اہم شخص نہیں تھا کہ اُس کے ہاں آنے جانے والوں کا کوئی نوٹس لیتا۔

کسٹم میں نوکری کی وجہ سے لوگ یوں بھی اس کی کچھ زیادہ ہی عزت کرتے تھے۔

ڈرائیور ٹیکسی کے اندر ہی بیٹھا رہا اور خان زمان اپنے استقبال کے لئے پہلے سے گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ دروازہ گھر کے ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ جس کے ایک صوفے پر شیر گل اُس کا منتظر تھا۔

دونوں نے گرمجوشی سے معانقہ کیا۔

دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔

دونوں کے دلوں میں طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اس طوفان کی شدت سے دونوں بخوبی آگاہ تھے۔

اُن کے سروں پر ایک بڑا بوجھ آن پڑا تھا۔ یہ بوجھ جب تک ان کے سر سے نہ اُترتا دونوں چین کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔

"بے فکر ہو جاؤ بیٹا! ان بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ ہم اپنی معصوم بچی کے خون کا حساب بے باق کر سکیں..... خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری

جان ہے میں دشمنوں کو معاف نہیں کروں گا۔ بیٹا! میں تم سے اب بھی یہی بات کہوں گا کہ اپنی ضد چھوڑ دو۔ تم نوجوان ہو تمہیں ابھی بہت عرصہ زندہ رہنا ہے۔ تم پر بہت ذمہ داریاں ہیں..... میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ یا مجبوری نہیں ہے..... تم اپنی نوکری پر جاؤ اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔'' بوڑھے خان زمان نے کہا۔

''ناممکن چاچا! ناممکن! میں جانتا ہوں یا خدا کی ذات کہ گزشتہ آٹھ دس روز سے میں کسی ذہنی عذاب سے گزر رہا ہوں جب تک اپنے ہاتھ سے قاتلوں کا گلا نہیں گھونٹوں گا..... مجھ پر کھانا اور نیند حرام رہے گی۔'' شیر گل کی آنکھوں میں خون جھلک رہا تھا۔

خان زمان کی جہاندیدہ نظروں نے اس کے سینے میں انگڑائیاں لیتے طوفان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ جب تک نجمہ کے قاتل کیفر کردار تک نہیں پہنچتے شیر گل کو سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔

شیر گل کو اس مرحلے پر سمجھانا بیکار تھا۔

''میں فارغ نہیں بیٹھا۔ میں نے ذاکر کے ٹھکانے تلاش کر لئے ہیں۔ یہ حساب جتنی جلدی چکتا ہو جائے اتنا ہی بہتر ہوگا۔'' شیر گل نے اُسے بتایا۔

''تم شاید ساری رات جاگتے رہے ہو..... تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔ شام ڈھلنے پر مجھے ایک نظر ان ٹھکانوں کا جائزہ لینا ہے۔ جس کے بعد حکمت عملی طے کریں گے۔''

بوڑھے فوجی نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

اس درمیان ثابت خان نے جس کے بچے کچھ دنوں سے اپنے آبائی وطن گئے ہوئے تھے ان دونوں کے لئے ناشتہ تیار کر لیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے پر شیر گل نے ایک کاغذ اپنے اور خان زمان کے درمیان بچھا لیا تھا جس پر لکیریں کھینچ کر وہ اُسے ذاکر سے متعلق اپنے طے کردہ پلان سے آگاہ کر رہا تھا۔ ثابت خان اس درمیان اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔

خان زمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

وہ ان لکیروں کی جزئیات پر غور کر رہا تھا۔ ایک ایک نقطے کی وضاحت اس نے شیر گل سے طلب کی تھی۔

راستے جن کی نشاندہی اس نے کی تھی سے متعلق مکمل تفصیلات اس نے پوچھی تھیں۔ ان راستوں کو ملنے والے راستوں سے متعلق جانا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ہاتھ سے دو نشان لگائے تھے۔

''یہ وہ محفوظ مقام ہیں جہاں سے بآسانی فرار ممکن ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' شیر گل نے اُس کے فیصلے پر صاد کر دیا۔

دونوں دوسرے کمرے میں ستانے کے لئے چلے گئے۔

دونوں ہی دیر گئے تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ بالآخر انہیں اونگھ آ ہی گئی۔

ثابت خان کی آمد سے پہلے دونوں تیار بیٹھے تھے۔

سہ پہر کو شیر گل اور خان زمان دونوں ایک ٹیکسی لے کر نکل گئے۔ یہ ٹیکسی ان کے ایک ساتھی کی تھی جسے شیر گل ڈرائیور کے روپ میں چلا رہا تھا اور خان زمان سواری کی صورت میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

تین گھنٹے تک وہ ٹیکسی کو شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتے رہے۔ اس درمیان متعدد مقامات پر رُک کر بوڑھے فوجی نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے صورتحال کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ آنے جانے والے راستوں کی تفصیل مانگی تھی۔

تین گھنٹے بعد جب وہ ٹیکسی سٹینڈ پر واپس پہنچے تو دونوں ایک منصوبے پر متفق ہو چکے تھے۔

●

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔

اس کالونی میں چھٹی کے دن اکثر لوگوں کے ہاں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس روز معمول کے مطابق ثابت خان کے بھی کچھ رشتہ دار یہاں جمع ہوئے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً دس تھی۔

دوپہر تک یہ لوگ ثابت خان کے گھر پر موجود ٹیلیفون پر مختلف پیغامات سنتے رہے۔ بالآخر انہیں مطلوبہ ٹیلی فون آ گیا۔

شاید یہ لوگ اسی فون کے منتظر تھے۔

شیر گل، بوڑھا خان زمان اور اس کے دو ساتھی فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

روانگی سے پہلے اُن سب نے مل کر کامیابی کی دُعا کی۔

یہ لوگ دو مختلف ٹولیوں میں باہر نکلے تھے۔

ایک ویگن میں شیر گل، خان زمان اور ان کے دو ساتھی بیٹھے تھے جبکہ ان کے تعاقب میں ایک ٹیکسی میں چار اور ساتھی آ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ایک سڑک سے ملحقہ آبادی کے کونے میں ویگن رُک گئی۔ ٹیکسی اس سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

ویگن کو رکتے دیکھ کر سگریٹ پان کی ایک دکان سے ایک نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُن کے نزدیک آ گیا۔ اُس نے ویگن چلانے والے سے اس طرح اچانک ہاتھ ملایا تھا جیسے راہ چلتے اچانک کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے۔

''کوٹھے پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ موجود ہے۔ ابھی واپس چلا جائے گا۔ دونوں اُس کار میں آئے ہیں۔'' اُس نے سڑک کے دوسری طرف ایک کونے میں

کھڑی سفید رنگ کی شیراڈ کی طرف اشارہ کیا اور آگے نکل گیا۔

''چلو!'' پچھلی سیٹ سے خان زمان نے سرگوشی کی۔

ویگن آگے کی طرف رینگ گئی۔

''گاڑی کو اُلٹے ہاتھ لے جا کر تھوڑا آگے پارک کر دو۔'' دوسرا حکم ملا۔

ویگن ڈرائیور نے اطاعت کی۔

ٹیکسی اُن کے تعاقب میں تھی۔ لیکن یہ لوگ وہاں سے ہٹ کر مخالف سمت کی سڑک کے کنارے اس طرح کھڑے ہو گئے تھے کہ وقت آنے پر اپنے ساتھیوں کی مدد بھی کر سکیں اور آسانی سے فرار بھی ہو سکیں۔

یہ شہر کی جدید سہولیات سے آراستہ کالونی تھی جہاں عام آدمی پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن.....!

اس کالونی میں سب ہی شریف اور عزت دار لوگ نہیں رہتے تھے۔ زیادہ تعداد دو نمبر کے لوگوں کی تھی جن کا دھندا ہزاروں کو کروڑوں میں بدلنے کا تھا۔

اس کالونی کے ایک عالی شان بنگلے میں پرائیویٹ کوٹھی خانہ بھی تھا جہاں سے شہر کے رؤسا اور اعلیٰ افسران کو لذت کام و دہن میسر آتی تھی۔

تنظیم کے اکثر بڑوں کو بھی یہیں سے لڑکیاں سپلائی کی جاتی تھیں اور تنظیم کے طلباء ونگ کا لیڈر اور ''باباصاحب'' کا چہیتا ذاکر بھی اس بنگلے کے ایک کمرے میں داد عیش دینے آیا کرتا تھا۔

یہ بات وہ سب جانتے تھے کہ اس شہر میں ہوا بھی اُن کی مرضی کے مخالف نہیں چل سکتی۔

لیکن.....!

''باباصاحب'' کی خاص ہدایت تھی کہ غیر اخلاقی دھندوں میں ملوث ہونے والے بہر طور رازداری کا اہتمام رکھا کریں۔ اس لئے ذاکر بھی جب اس قحبہ خانے میں آتا تھا تو اپنی گاڑی سامنے والی سڑک پر پارک کر کے پیدل آیا کرتا تھا تاکہ اُس کے آنے جانے کا کسی کو علم نہ ہو۔

شیر گل اور اُس کے ساتھیوں نے بڑی تگ و دو کے بعد پتہ چلایا تھا کہ ذاکر کا سب سے کمزور پوائنٹ کون سا ہو سکتا ہے اور اس کی نظر انتخاب اس بنگلے پر ٹھہری تھی۔

ذاکر کی خصوصی داشتہ تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں آئی تھی۔ اس علاقے کے ٹیلی فون ایکسچینج میں موجود ان کی برادری کے ''ایس ڈی او'' کی خدمات سے استفادہ کرنے کے بعد انہوں نے کوٹھی خانے کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کا اہتمام بھی کر لیا تھا۔

ذاکر عموماً دن کے اوقات میں یہاں آیا کرتا تھا۔ اُس کی داشتہ کے ٹیلی فون پر شیر گل کے ساتھیوں نے کڑی نظر رکھی تھی اور اُس روز جب انہیں یہ مژدہ سننے کو ملا کہ

ذاکر اپنی محبوبہ سے ملنے آ رہا ہے تو وہ سب سجدہ شکر بجالائے۔
انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا آج اور ابھی کرنا تھا۔

●

ذاکر نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔
اپنی حفاظت سے وہ کبھی غافل نہیں رہا تھا۔ وہ کبھی غیر مسلح اپنے گھر سے باہر نہیں آتا تھا۔ اُس کے ساتھ دوست کے روپ میں کوئی نہ کوئی تنظیم کا غنڈہ ضرور چپکا رہتا تھا۔
اس کی کار میں ہر وقت دو جدید اسلحہ سے مسلح غنڈے موجود رہتے تھے۔
لیکن.....!
اپنی معشوقہ سے ملنے کے لئے وہ اکثر مسلح جلوس کے بغیر ہی آیا کرتا تھا۔ یوں بھی اس علاقے میں تنظیم کی اتنی دہشت قائم تھی کہ کوئی نظر اُٹھا کر بھی اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔
آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنی حرام کاری سے فراغت کے بعد اپنے ساتھی کے ہمراہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ تو طاقت کا نشہ تھا کچھ معشوقہ سے ملاپ کا خمار اور سب سے بڑھ کر اس شراب کا اثر جو اس نے اپنی محبوبہ کے کوٹھے پر پی تھی۔ وہ خود کو آسمان پر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔
گو کہ اس کے ساتھی نے بھی کسی حرام کاری میں کمی نہیں کی تھی لیکن اس کے حواس قائم تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج اس کے ''باس'' نے کچھ زیادہ ہی چڑھالی ہے یا پھر یوں ہی آج وہ کچھ زیادہ ہی نشے میں دکھائی دے رہا تھا۔
''ذاکر بھائی، سنبھل کے۔'' اس کے ساتھی نے ذاکر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔
''اے چپ کر بزدل کہیں کے..... کسی سالے کی جرأت ہے جو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے..... سالوں کو بھون کر رکھ دوں گا۔''
شراب کے نشے میں دُھت وہ اول جلول بکنے لگا۔
اس کے ساتھی کے لئے آج ذاکر بھائی کو سنبھالنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ خیریت گزری کہ آج چھٹی کی وجہ سے یہاں کوئی خاص رونق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں بھی یہ بڑی ماڈرن آبادی تھی جو کچھ بھی تھا یہاں چار دیواری کے اندر تھا..... باہر تو صرف سناٹا اور خالی سڑکیں تھیں جن پر سے کبھی کبھی کوئی تیز رفتار گاڑی زناٹے سے گزر جاتی یا پھر کسی بنگلے سے برآمد ہوتے نوکر اور کاریں۔
ہر بنگلے میں جدید اسلحہ سے لیس مسلح چوکیدار موجود تھا۔

لیکن.....!

بنگلے کے اندر۔

یہ لوگ بھی باہر جھانکنے کا تکلف کم ہی کیا کرتے تھے اور عموماً بنگلوں کے مین گیٹ سے ملحقہ اندر بنی چھوٹی سی چیک پوسٹ پر بندوقیں تھامے اونگھتے رہتے تھے جبکہ بنگلوں کے مین گیٹ پر مضبوط تالے لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھلنے سے پہلے یہ مستعد چوکیدار دروازے میں موجود سوراخ سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہی دروازہ کھولا کرتے تھے۔

ذاکر بھائی جسے شراب کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں موجود پستول ہاتھ میں تھام لیا تھا اور اپنے ساتھی کی منت سماجت کے باوجود اُسے دوبارہ جیب میں رکھنے سے انکاری تھا۔

بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔

اس کے ساتھی کے لئے نشے میں دُھت ذاکر بھائی کو سنبھالنا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر ذاکر بھائی نے ترنگ میں آ کر فائرنگ شروع کر دی تو مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔

پولیس والے تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بھاگ جائیں گے یا پھر انہیں احترام سے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچا دیں گے۔

لیکن.....!

''بابا صاحب'' انہیں معاف نہیں کریں گے۔ بابا صاحب کا حکم تھا کہ اس علاقے میں کوئی غنڈہ گردی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ یہاں کے مکین اُن کی پارٹی کا بہت بڑا ذریعہ آمدن تھے۔ ماہانہ لاکھوں روپے فنڈ کے نام پر اُن سے وصول کیے جاتے تھے۔

اس علاقے کے بڑے بڑے سمگلر تنظیم کو باقاعدگی سے اپنی حرام کی کمائی کا ایک چوتھائی حصہ بھیج دیا کرتے تھے گو کہ ان لوگوں کا سیاست سے کبھی دُور کا واسطہ بھی نہیں رہا تھا۔

لیکن.....!

انہوں نے بابا صاحب کو کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں تنظیم کے کسی رکن کی غنڈہ گردی برداشت نہیں کریں گے۔ بہرحال وہ شریف اور پُرامن شہری تھے اور اپنے معمولاتِ زندگی میں کسی طرح کی ہنگامہ آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

ذاکر بھائی کے ساتھی کو یہی فکر دامن گیر تھی کہ اگر خدانخواستہ ذاکر بھائی نے ایک آدھ ہوائی فائر بھی کر دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

اس نے کسی نہ کسی طرح ذاکر بھائی کے ہاتھ میں پکڑا پستول لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اب اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُسے گاڑی کی طرف لا

رہا تھا۔

ذاکر بھائی کا نشہ اچانک ہی ہرن ہو گیا تھا اور اس کے ساتھی کے ہاتھ پاؤں بھی اس ناگہانی آفت سے پھول گئے تھے جو اچانک اُن پر آن پڑی تھی۔

ویگن اس طرح اچانک اُن کے سروں پر نازل ہوئی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ مضبوط ہاتھوں نے دونوں کو دبوچ کر بے بس کر دیا تھا۔ حملہ آوروں نے اُنہیں اس طرح اور اتنی تیزی سے جکڑا تھا کہ وہ ڈھنگ سے اُن کی شکلیں بھی نہیں دیکھ پائے تھے۔

سڑک سنسان تھی۔

اکا دکا گاڑی جو یہاں سے گزرتی اس کے سواروں کے پاس اس ہنگامہ آرائی کو دیکھنے کے لئے شاید وقت ہی نہیں تھا۔ یوں بھی خان زمان کی کمان میں اس کے ساتھیوں نے اس برق رفتاری سے سارا کام کیا تھا کہ شاید کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

دونوں کے منہ ٹیپ سے بند تھے اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور ویگن میں بے بس بھیڑوں کی طرح ڈھیر تھے۔

ویگن تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔

دوسری سڑک پر موجود ٹیکسی سواروں نے ویگن کی روانگی کا انتظار کیا پھر وہ اُن کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہ لوگ اپنے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک موٹر گیراج تھا جس کے ایک حصے میں گیراج کے مالکان رہائش پذیر بھی تھے۔

چھٹی کی وجہ سے گیراج بند تھا۔

ویگن میں سے اُتر کر ایک سوار نے اُس کے مین گیٹ کا تالا کھولا اور ویگن کو اندر لے گئے۔

دونوں زیر حراست درندوں کو جب ڈنڈا ڈولی کر کے باہر نکالا گیا تو اُن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ انہیں کس راستے سے کہاں لایا گیا تھا اور یہ لوگ کون ہیں۔

وہ تو ڈھنگ سے ان کی شکل بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔

دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا گیا تھا اور علیحدہ علیحدہ کمروں میں لے جایا گیا تھا۔ ذاکر کی آنکھوں سے پٹی کھلنے پر اُس کے منہ پر پانی سے بھرا گلاس پھینک کر اغواء کاروں نے اپنا تعارف کروایا تھا۔

''تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ تم بچ نہیں سکتے۔ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔''

خان زمان اور شیر گل کی شکل پر نظر پڑتے ہی ذاکر نے غصے سے بے قابو ہو کر بولنا شروع کر دیا۔

''شاید موت کے صدمے نے ابھی سے تمہارا دماغ کر دیا ہے۔'' شیر گل کی آواز میں جانے کیا قہر چھپا تھا کہ ذاکر کو ایک سنسنی اپنے سارے جسم میں دوڑتی محسوس

ہوئی۔

''پھر بھی مرنے سے پہلے تم جی بھر کے بکواس کر سکتے ہو۔ افسوس اس سے زیادہ ہم تمہیں کوئی رعایت نہیں دیں گے۔ تم ایک بزدل اور بے غیرت دشمن ہو تم نے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کی جان لی ہے۔ اس لئے ہم سے کسی اچھی موت کی توقع نہ رکھنا۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں گولی مار کر تمہارا کام تمام کر دیا جاتا لیکن نہیں..... تم اس سے بڑی سزا کے مستحق ٹھہرے ہو۔ تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ تم نے بڑے بے گناہوں کو محض اپنی طاقت کی نمائش کرنے کے لئے موت کی نیند سلا دیا..... تم بھی مرو گے۔ آج ہی مرو گے لیکن بہت بری موت.....'' شیر گل پھنکارا اور ذاکر سہم کر رہ گیا۔

''میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ تم مجھے جانتے نہیں.....'' ذاکر نے سنبھل کر کچھ کہنا چاہا۔

''میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم جس ملک کا کھاتے ہو اس کو ڈستے ہو۔ بزدلی اور ہوسِ اقتدار میں اندھے حکمرانوں کو بے وقوف بنا کر اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے تم شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ اب تمہارے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں لیکن یاد رکھنا تم مثال بن جاؤ گے۔ ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب ہم جیسے بے بس اور ناکس انسان تم ایسے وحشی درندوں کو کچل سکتے ہیں تو حکومت تمہارے منہ میں لگام کیوں نہیں دیتی۔''

بوڑھے خان زمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

●

شیر گل اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے موجود تھا۔

وہ آج صبح سیدھا دفتر پہنچا تھا۔ دفتر پہنچنے پر اس کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ افسرِ اعلیٰ کے حکم پر اس کا طبی معائنہ بھی کروایا گیا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا۔

شیر گل نے اپنی گمشدگی کی رپورٹ درج کرواتے ہوئے تنظیم کے ایک ایم پی اے اور کونسلر پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے پانچ مسلح ساتھیوں کے ساتھ اُسے اغواء کیا اور ''آستانے'' میں لے جا کر اس پر تشدد کرتے رہے۔

''انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ میری معصوم بہن نے ان درندوں کی مزاحمت کیوں کی اور وہ زندہ اُن کے ہاتھ کیوں نہیں لگی۔'' اُس نے اپنے بیان میں کہا۔

شیر گل نے اپنے اغواء کی وجوہات میں مارکیٹ میں فائرنگ کے واقعے کو بنیاد بنایا اور کہا کہ اُسے تنظیم کی طرف سے وارننگ دی گئی تھی کہ اپنا تبادلہ کروا کر یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا جائے ورنہ اُسے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں کو اس بات کا غصہ تھا کہ میں نے نہ صرف اُن کے ناجائز احکامات کی تعمیل سے انکار کیا بلکہ ملزموں کو شناخت کرتے ہوئے اُن کے خلاف مقدمہ بھی درج کروا دیا۔

شیر گل نے بتایا کہ اغواء کار اس پر پانچ روز تک تشدد کرتے رہے۔ اس درمیان انہوں نے اس کی بہن کے قتل کی خبر بھی اخبارات میں اُسے پڑھائی اور اس مسئلے پر

اسے ذہنی اذیت کا شکار رکھا..... شیر گل نے بتایا کہ گزشتہ تین چار روز سے انہوں نے اس پر تشدد کرنا بند کر دیا تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ کسی روز بھی مناسب موقع دیکھ کر اسے گولی ماردی جائے گی اور اس کی مسخ شدہ لاش کسی گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔

اس نے بتایا کہ اس کی خوش قسمتی تھی یا پھر قدرت نے ابھی اُسے زندہ رکھنا تھا کہ اُسے فرار کا موقع مل گیا اور کل شام وہ اغواء کاروں کے چنگل سے نکل کر پہلے اپنے گھر پہنچا اور رات گھر قیام کرنے کے بعد صبح یہاں رپورٹ کرنے آیا ہے۔

افسرِ اعلیٰ اور شیر گل کے ساتھیوں نے اس کی جرأت پر اُسے داد دی۔ اس کی بہن کی انتقامی موت پر دُکھ کا اظہار کیا اور اُسے یقین دلایا کہ جلد ہی قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔

افسرِ اعلیٰ اور اُس کے ساتھی شیر گل کے لئے اپنے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات محسوس کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قاتل کون ہیں۔

لیکن.....!

قاتلوں پر انگشت نمائی کی ہمت بھی نہیں رکھتے تھے۔

''جناب والا! میری صرف ایک خواہش ہے کہ مجھے اسی شہر میں خدمات پر مامور رکھا جائے۔ میں اپنے ملک کے دشمنوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ ہم بزدل ہیں۔ میری معصوم بہن نے اس لئے قربانی دی ہے اگر میں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس کی روح کے سامنے شرمسار ہوں گا۔''

تم بے فکر رہو شیر گل خان۔ حکومتیں بہت دیر تک مصلحتوں کا شکار نہیں رہا کرتیں۔ میں تمہارے جذبات جانتا ہوں۔ میں حکومت سے تمہاری ترقی کی سفارش کروں گا۔ ایجنسی کو تو تم ایسے ذمہ دار اور محبِ وطن افسران پر ناز ہے۔ تم لوگ ہماری آبرو ہو اور اپنی آبرو کی حفاظت ایجنسی کا فرض ہے۔''

افسرانِ اعلیٰ خاصے جذبات ہو رہے تھے۔

اُن کے حکم پر شیر گل کو علاج معالجہ کی بہترین سہولتیں فراہم کی گئیں اور ایک ہفتے کی رخصت کے ساتھ آرام کرنے بھیج دیا گیا۔ اپنے خصوصی اختیارات کے ساتھ افسرِ اعلیٰ نے اُس کی جرأت مندی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے اس کی اگلے درجے میں ترقی کی پُرزور سفارش کر دی تھی۔

●

شیر گل کی آمد کے تیسرے روز اچانک تنظیم کی طرف سے ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا اعلان کیا گیا۔

یہ پریس کانفرنس ''بابا صاحب'' کے آستانے پر منعقد ہوئی تھی۔ جہاں حاضری دینے کے لئے عمال حکومت کی قطار بندھی رہتی تھی۔ پریس کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہی اخبارات کے نمائندے وہاں حاضر تھے۔ کوئی ایسا رپورٹر نہیں بچا تھا جسے اس کانفرنس کی رپورٹنگ کے لئے طلب کیا گیا ہو اور وہ یہاں حاضر نہ ہو۔

بابا صاحب کی آمد پر وہ سب اس طرح احتراماً کھڑے ہوئے تھے جیسے قدیم دور میں بادشاہوں کی دربار میں آمد پر مصاحب گردنیں جھکا کر کورنش بجایا کرتے

تھے۔

بابا صاحب کا موڈ بڑا خراب دکھائی دے رہا تھا۔

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے موجود گدھوں کو بیٹھنے کی تلقین کی اور ان کی زبان انگارے اگلنے لگی۔

''میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ حکومت کی بعض ایجنسیاں ہمارے اور حکومت کے درمیان موجودہ بہترین تعلقات کو سبوتاژ کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور ہمارے نوجوانوں کو اشتعال دلا کر غلط اقدامات پر مجبور کر رہی ہیں تاکہ وہ ہنگامہ آرائی کریں اور ان کے ہاتھ کوئی بہانہ لگ جائے۔

اس کی تازہ ترین مثال تنظیم کے طلباء ونگ کے لیڈر ذاکر بھائی کا اغواء ہے۔ ذاکر بھائی اور ان کے ایک ساتھی کو حکومتی ایجنسی کے اہلکاروں نے دو دن سے اغواء کر رکھا ہے۔ ان کی کار ہمیں ماڈرن کالونی کے باہر ملی ہے جس کی سیٹوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور دیگر حالات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاکر بھائی کو اغواء کر کے لے جایا گیا ہے۔ ہم نے حکومت کو پہلے ہی وارننگ دی تھی کہ ان سرکاری ایجنسیوں کو لگام ڈالے جو ہمارے اور حکومت کے تعلقات کشیدہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اگر ذاکر بھائی یا ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہے یا کوئی الزامات ہیں تو قانونی طریقے پر عمل کیا جائے۔ میں ایجنسی والوں کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر انہوں نے 24 گھنٹوں کے اندر اندر ذاکر بھائی اور اس کے ساتھیوں کو رہا نہ کیا تو طلباء پر قابو رکھنا ہمارے بس سے باہر ہو جائے گا..... میری وزیر اعظم اور صدر سے درخواست ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف سخت ایکشن لیں جنہوں نے ہمارے آپس کے تعلقات خراب کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔

بابا صاحب اتنے غصے میں اول جلول بک رہے تھے کہ کسی بے چارے رپورٹر میں کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔

یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ذاکر بھائی کے اغواء نے اُنہیں بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ غصے سے بابا صاحب کا چہرہ، جس پر پہلے ہی بہت لعنت برس رہی تھی، مزید بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ حسب روایت بڑے جوش و خروش سے گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے قہر و غضب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ابھی بابا صاحب کا بیان جاری تھا جب اچانک ہی اُن کے ایک مودب ساتھی نے اُن کے کان میں کچھ کہا اور وہ اچانک اُٹھ کر ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔

''بابا صاحب ایک ضروری ٹیلی فون سُن رہے ہیں۔ آپ براہِ کرم تشریف رکھئے وہ چند منٹ میں آتے ہیں۔'' بنے بھائی نے فوراً کھڑے ہو کر وضاحت کی اور اخبار نویس پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان بے چاروں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کانفرنس اُدھوری چھوڑ کر یا بابا صاحب کی طرف سے روانگی کی اجازت ملے بغیر یہاں سے چلا جائے۔

قیدی بن کر رہ گئے تھے بے چارے اخبار نویس۔''

ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔ ان کے مالکان کی سخت ہدایات موجود تھیں کہ تنظیم کو ناراض کرنے کا مطلب اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا تو ہے ہی..... اپنے ساتھیوں کا معاشی قتلِ عام بھی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ معمولی سی غلطی پر تلملا کر اخبارات کے دفاتر پر حملہ آور ہوا کرتے

تھے۔انہوں نے ایک بڑے اخبار کے پریس کو اس جرم میں آگ لگادی تھی کہ اس اخبار نے اُن کے ایک دوسرے درجے کے لیڈر کا بیان اندر کے صفحات پر لگایا تھا جبکہ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ یہ بیان باہر کے صفحے پر لگایا جائے۔

اس ملک کی تاریخ میں وہ بے رحم لمحات بھی آئے جب اخبار مالکان نے اپنے ہی ایک ساتھی کو جھوٹا کہتے ہوئے (جس کے دفتر پر تنظیم نے حملہ کر کے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا) بابا صاحب کے دربار میں پہنچ کر اُن سے باجماعت معافی مانگی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ آئندہ کم از کم اس شہر کے کسی اخبار میں ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوگا جو اُن کے مزاج شاہانہ پر ناگوار گزرے۔

بابا صاحب نے اپنے آستانے پر آئے ان اخبارات کے مالکان کا معافی نامہ قبول کرتے ہوئے انہیں تلقین کی تھی کہ وہ صحافت کی اعلیٰ اقدار اپنائیں اور اپنی من مانیاں چھوڑ دیں۔اُن کے نزدیک صحافت یہی تھی کہ ان کی تنظیم کے ہر حکم کی اطاعت بلا چوں وچراں کی جائے۔

اچانک ہی کانفرنس ہال سے ملحقہ دروازہ کھلا اور بابا صاحب کا لعنتی چہرہ برآمد ہوا۔

انہوں نے گہرے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی اس کے باوجود بیشتر اخبار نویس یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی آنکھوں سے نکلتے انگارے سامنے بیٹھے بے چارے اخبار نویسوں کو بھسم کر کے رکھ دیں گے۔

''وہی ہوا جس بات کی میں نے نشاندہی کی تھی۔ان لوگوں نے بڑی نیچ حرکت کی ہے۔ذاکر بھائی کی مسخ شدہ لاش شہر کے ایک چوراہے پر پھینک دی ہے۔اُن کے ساتھی کی زبان اور ہاتھ کاٹے گئے ہیں اور وہ بے چارہ قریب المرگ ایک ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔میں حکومتی ایجنسیوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم ان حرکتوں سے اشتعال میں آنے والے نہیں۔میں صدر اور وزیراعظم سے درخواست کروں گا کہ ذاکر بھائی کے قاتلوں کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچائے بصورت دیگر حالات کی خرابی کے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے۔''

بابا صاحب قہر برسانے لگے۔

اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔

بنے بھائی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ذاکر بھائی کی شہادت سے بابا صاحب کو بہت دکھ پہنچا ہے اور اُن کی طبیعت بگڑنے لگی ہے۔ڈاکٹر ان کا طبی معائنہ کر رہے ہیں۔

''خدا کرے اب یہ موذی کبھی ٹھیک نہ ہو۔'' کئی اخبار نویسوں کے دل سے بددعا نکلی۔

بہت سے اخبار نویس اپنی وفاداریوں کا ثبوت دینے کے لئے بنے بھائی کے گرد جمگھٹا لگا کر بابا صاحب کی صحت کا رونا رونے اور ذاکر بھائی کی شہادت پر پُرسہ کرنے لگے۔پھر ایک ایک کر کے اپنے دفاتر کو روانہ ہو گئے۔

ذاکر بھائی کی لاش بالکل اُسی حالت میں ملی تھی جس حالات میں تنظیم کے ہاتھوں مرنے والے بے گناہوں کی لاشیں ملا کرتی تھیں۔

اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے اور چہرہ بھی قدرے مسخ ہو چکا تھا۔ اس لاش کے گلے میں ایک خط پرویا گیا تھا۔ جس میں ذاکر کی طرف سے پندرہ بے گناہوں کے قتل کا ارتکاب کیا گیا تھا اور ایک ایک کے قتل کی ترتیب وار تفصیلات بھی درج تھیں۔ ان میں سے بیشتر قتل بابا صاحب کے براہِ راست حکم پر اور باقی قتل اُن کے حواریوں کے احکامات پر کیے گئے تھے۔

یوں دکھائی دیتا تھا کہ اُسے کیفرِ کردار تک پہنچانے سے پہلے اس کی تفتیش کی گئی ہے اور اس تفتیش کے دوران اُس کی طرف سے کیے جانے والے جرائم کی فہرست بھی اُس کے گلے میں لٹکا دی گئی تھی۔

ان تفصیلات کی ایک ایک کاپی ملک کے تمام مقتدر اخبارات و جرائد اور سرکاری اعمال کو بھی روانہ کر دی گئیں اور انہیں کہا گیا تھا کہ مجرم کی طرف سے اتنے قتل کرنے کا اعتراف، جس میں اس کے قاتل ہونے کے ثبوت بھی دیے گئے ہیں اس بات کی نشاندہی کے لئے کافی ہیں کہ تنظیم دہشت گردوں کا ایک منظم گروہ ہے جو حکومت کو بعض سیاسی حوالوں سے بلیک میل کر کے اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے۔ اگر ان لوگوں کی طنابیں نہ کھینچی گئیں تو اس ملک میں لا اینڈ آرڈر کا خدا ہی حافظ ہوگا..... جن لوگوں نے ذاکر بھائی کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا انہوں نے حلفاً اقرار کیا تھا کہ ان کا تعلق کسی تنظیم سے نہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ ذاکر کو قتل کر دیا جاتا۔

قاتلوں نے لکھا تھا کہ انہوں نے ذاکر کے ساتھی کو نشانِ عبرت بنا کر چھوڑ دیا ہے تا کہ حکومت کو یہ باور کرایا جائے کہ اگر وہ لوگوں کو انصاف نہیں دے گی اور درندوں کو اسی طرح چھوٹ دی گئی تو لوگ مقتولین کا انتقام خود لینا شروع کر دیں گے۔

اس شہر میں ایسی جرأت مند واردات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

زبانِ خلق اس قتل کو ذاکر کے آخری شکار بے گناہ نجمہ کی شہادت کا شاخسانہ قرار دے رہی تھی۔

لیکن.....!

اخبارات پر سکوت طاری تھا۔

اخبارات میں اس حوالے سے وہی خبریں شائع ہو رہی تھیں جو تنظیم چاہتی تھی۔

افسرِ اعلیٰ کے سامنے لاش کی مختلف زاویوں سے لی گئی تصویریں اور مرنے والے کے اعتراف کی فہرست دھری تھی۔ اس کا ساتھی تنظیم کے ہسپتال میں پہنچ چکا تھا اور ابھی لمبے عرصے تک کوئی بیان کے قابل نہیں تھا۔ گو کہ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن وہ اپنی کٹی ہوئی زبان اور ہاتھوں سے زندہ درگور ہو چکا تھا۔

حکومت کے دو اعلیٰ رابطوں نے اشاروں کنایوں سے افسرِ اعلیٰ سے اس حوالے سے بات کی تھی کہ کہیں یہ اُن کا ''کارنامہ'' تو نہیں۔

افسرِ اعلیٰ بے چارے سارا دن ٹیلی فون پر صفائیاں پیش کرتے رہے۔

شام کے بعد جب وہ دفتر میں آرام دہ کرسی پر ڈھیر پڑے تھے تو اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اُن کے ذہن پر لپکا۔

''کہیں یہ اُس بوڑھے فوجی کا کارنامہ تو نہیں۔''

لیکن وہ تو کئی روز پہلے شہر سے جا چکا ہے۔ان کے ذہن نے جواب دیا۔

نجانے کیوں اُن کا دل اُن کے دماغ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

دال میں ضرور کچھ کالا ہے.....وہ بڑبڑائے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا۔

''فائل نمبر 13 الف لے آؤ۔'' انہوں نے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد فائل اُن کی میز پر موجود تھی۔

انہوں نے فائل میں درج تفصیلات اور اپنے ماتحت کی رپورٹ دوبارہ پڑھی اور چند ثانیوں کے لئے کچھ سوچنے لگے۔

اچانک ہی انہوں نے اپنے آپریٹر کو صوبہ سرحد کے ایک شہر میں ایجنسی کے آفس کا نمبر ملانے کو کہا۔

پانچ منٹ کے بعد اُن کے میز پر دھرے خصوصی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔صوبہ سرحد کے شہر میں ایجنسی کا افسرِ اعلیٰ لائن پر تھا۔مقامی افسرِ اعلیٰ نے اُسے خان زمان کے ایڈریس سے آگاہ کرتے ہوئے جلد از جلد اس کی گزشتہ چند دنوں کی مصروفیات کی تفصیل مانگی۔

دوسری طرف سے اگلے روز شام تک تفصیلات بہم پہنچانے کے وعدے کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

افسرِ اعلیٰ کی ساری رات کروٹوں کی نذر ہو گئی۔

وہ شیر گل خان کے بیان کی فائل اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے اور ایک مرتبہ پھر بڑی باریک بینی سے اُس کی طرف سے اپنے غائب رہنے کے جواز کا جائزہ لے رہے تھے۔

شیر گل بھی ایجنسی کا تربیت یافتہ تھا کیا مجال جو اُس کے بیان میں ذرا سا بھی جھول موجود ہو۔اُس نے بیان میں کوئی ایسی جزئیات نہیں لکھی تھی جن کو شک کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔بڑی کوشش کے بعد بھی افسرِ اعلیٰ اُس کے بیان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں نکال سکے۔

گزشتہ دو روز سے شیر گل ایجنسی کی نظر میں تھا۔اس کی حفاظت کے پیش نظر اس پر کڑی نگرانی لگائی گئی تھی۔اس درمیان اس نے سوائے ایک مرتبہ ڈاکٹر سے

ملاقات کرنے اور مقامی قبرستان میں اپنی بہن کی قبر پر فاتحہ خوانی کے کچھ نہیں کیا تھا..... باقی سارا وقت اپنی ماں کے ساتھ گھر پر ہی گزرا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ابھی تک وہ کسی فیصلے پر کیوں نہیں پہنچ سکے۔

اگلے روز سارا دن وہ بے چینی سے صوبہ سرحد سے رپورٹ کے منتظر رہے۔ شام گئے وہاں سے بذریعہ فیکس مشین آنے والی رپورٹ اُن کے سامنے رکھ دی گئی۔

اس رپورٹ کے مطابق اُس کے گاؤں کے لوگوں نے بیان کیا تھا کہ وہ پروگرام کے عین مطابق گاؤں پہنچا تھا اور یہاں سے معمول کی زندگی گزار رہا تھا۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی غلط رپورٹ کسی تھانے میں درج نہیں کروائی گئی تھی۔ وہ ایک بہادر فوجی تھا جس نے دو بڑی جنگوں میں حصہ لیا اور ایک جنگ میں جرأت کے ایک اعزاز سے نوازا گیا۔ گاؤں کے لوگ اُس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

افسرِ اعلیٰ کا جی چاہتا تھا اپنا سر پیٹ لے۔

اس رپورٹ کی صداقت پر اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بہت چالاک بوڑھا ہے کم بخت۔'' وہ بڑبڑائے۔

انہیں اب بھی اس واردات میں اس بوڑھے فوجی کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ یہ بات اُن کے علم میں پہلے سے تھی کہ فوج میں بھی خان زمان نے بہت عرصہ تک انٹیلی جنس ڈیوٹی کی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے جُرم کا کوئی معمولی سا ثبوت بھی نہیں چھوڑا تھا۔

جس دلیری اور ہوشیاری سے اُس نے یہ واردات کی تھی وہ کسی عام غنڈے کے بس کی بات نہیں تھی۔

انہیں شیر گل کے گھر پر اس بوڑھے سے اپنی آخری ملاقات یاد تھی۔

انہوں نے اس بوڑھے کی آنکھوں کو انتقام کے شعلے اگلتے دیکھا تھا، لیکن اُنہیں حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس شخص نے کتنی صفائی سے کتنا خطرناک کام کیا تھا۔

مرحلے وفا کے

عارف کی ٹریننگ کیمپ میں مکمل ہوگئی تھی۔

اُس کے انچارج سجاول نے بتایا تھا کہ اس کی ملاقات شاید پاکستان میں کہیں ہو جائے لیکن وہ اجنبی رہیں گے جب تک کہ ''سجاول'' خود نہ چاہے۔ اس مرتبہ جب وہ پاکستان آنے لگا تو میناکشی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے آیا اور اسے حکم دیا گیا تھا کہ میناکشی کی حفاظت کرنی ہے اور اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون بھی۔

میناکشی عارف کی دُلہن بن کر اسلامی نام کے ساتھ پاکستان آئی تھی۔

اب وہ میناکشی نہیں مسز پروین عارف تھی۔ ایسی شادیاں چونکہ عام سی بات ہے اس لئے کسی نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

پروین کو عارف کے والدین نے کھلے دل سے قبول کیا تھا کیونکہ ایسی امیر کبیر بہو جس نے آتے ہی اُن کے گھر کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی انہیں نہ ملتی۔

ایک عارف چوہدری ضرور تھے کہ کبھی کبھی جب وہ شراب اور شباب کے نشے سے فارغ ہوتے تو چند لمحوں کے لئے اُن کا ضمیر انہیں ضرور ملامت کرتا۔

لیکن.....!

جس تنظیم سے اُس کا رشتہ جُڑ گیا تھا وہاں ضمیر نام کی چڑیا سے کوئی آشنا نہیں تھا۔ وہاں تو احکامات تھے اور ان کی تعمیل کرنا ہوتی تھی۔ بصورتِ دیگر زندگی جہنم بنا دی جاتی تھی۔ یہ لوگ اپنے کارکنوں کو پہلے ایسی عادتیں ڈال دیتے تھے جو اُن کا نشہ بن جاتی تھیں اور وہ اچانک ایسی شاندار زندگی گزارنے لگتے تھے کہ پھر اس کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار رہتے تھے۔

جاری ہے...

بابر اس کا بچپن کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ دونوں اتفاق سے ایک ہی علاقے میں رہتے تھے اور تین بلاک چھوڑ کر آصف کا گھر تھا۔ آصف اس تنظیم کے طلباء ونگ کا اہم کارکن تھا اور اس علاقے کی کمان بھی وہی کر رہا تھا۔

دونوں نے تنظیم کے حکم پر تین چار ''کارنامے'' بھی اکٹھے انجام دیئے تھے اور حال ہی میں تنظیم کے ایک باغی کو ''سزا'' دینے کا اہم فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

اس روز بنے بھائی نے جب اچانک عارف کو ایک ہنگامی میٹنگ میں اپنے پاس بلایا تو مقامی سیکٹر انچارج بھی وہاں موجود تھا۔

بنے بھائی کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

''سالے، کتے کے پلے، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے اب ہمیں آنکھیں دکھائیں۔ ہمیں ڈاج کریں۔ سالے کو ایسی سزا دلواؤں گا کہ ساری زندگی یاد کرتا رہے۔'' وہ غصے سے چلایا۔

''کیا بات ہے بنے بھائی! کس نے جرأت کی تمہارے حکم سے سرتابی کی۔'' عارف نے بنے بھائی کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''اس غدار نے۔''

یہ کہتے ہوئے بنے بھائی نے عارف کے سامنے ایک تصویر پھینک دی۔

یہ بابر کی تصویر تھی۔

عارف کو اپنے خون کا خمیر بدلتا محسوس ہوا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنے دل جذبات کا اظہار نہ ہونے دے۔ اگر بنے بھائی کو اس پر معمولی سا شک بھی ہو جاتا کہ عارف کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو رہا ہے تو وہیں اُس کا دماغ درست کر دیتے۔

''دیکھو عارف جب ہم نے تنظیم سے رشتہ جوڑ لیا تو سارے خون کے رشتے ہمارے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ یہ امتحان کی گھڑی ہے جس میں تمہیں سرخرو ہونا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ بابر کا تعلق باغی گروپ سے ہے اور تنظیم کے بھگوڑوں کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ تنظیم کے کسی بھی غدار سے رابطہ رکھنے کی کم از کم سزا موت ہے۔ تم جانتے ہو۔ آصف نے چونکہ تنظیم کے لئے بہت خدمات انجام دی ہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ یہی رعایت مل سکتی ہے کہ اُسے آسان موت دی جائے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے گاڑی کے نیچے دے ڈالو۔ جس قسم کی مدد درکار ہے۔ ''آستانے'' سے لے لو۔ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہئے۔'' بنے بھائی پھنکارے۔

''ایسا ہی ہوگا بنے بھائی..... آپ بے فکر ہو جایئے۔'' عارف نے ہوشیاری دکھائی۔

''کالیا کو تم جانتے ہو..... مقامی سیکٹر کمانڈر ہے۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔'' بنے بھائی نے کالیا کی طرف اشارہ کیا۔

''او۔ کے۔'' عارف باہر آ گیا۔

''اگر سالا معمولی سی گڑبڑ بھی کرے تو مار دینا۔ بابا صاحب نے خاص طور سے اس کا امتحان لینے کے لئے یہ ذمہ داری اس کے سر تھوپی ہے۔ اگر اسے ننگا ہونا ہے تو ابھی ہو جائے۔ زیادہ نقصان نہ کرے۔'' بنے بھائی نے سمجھایا۔

''سیدھا کر دوں گا سالے کو..... کسی کی جرأت نہیں کہ بابا صاحب کے حکم سے معمولی سرتابی کرے۔''

کالیا کا قہقہہ بڑا ہولناک تھا۔

●

عارف کا بند بند جکڑا جا چکا تھا۔

وہ اپنی مرضی سے شاید سانس لینے پر قادر نہیں رہا تھا۔ اس کے لئے تنظیم کے کسی بھی حکم سے سرتابی احکامات الٰہی سے نافرمانی کے مصداق تھی۔ بنے بھائی نے اسے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچایا تھا۔ اُسے اس کے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تنظیم کے لئے ہر غیر قانونی کام کو قانونی جان کر انجام دیا۔

لیکن.....!

بابر کو قتل کرنے کا فیصلہ جو بابا صاحب کے حکم پر ہوا تھا۔ عارف نے اُسے قبول نہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ چاہے بھی تو بابر کو قتل نہیں کر سکے گا۔ جس بات کا علم تنظیم کو اب ہوا تھا اس کا احساس عارف کو بہت پہلے سے ہونے لگا تھا۔

اُسے یاد آ گیا جب ایک روز وہ دونوں مخالف تنظیم میں شامل ہونے والے ایک طالب علم کے اغواء کا پروگرام بنا رہے تھے جسے انہوں نے آستانے میں لے جا کر سبق سکھانا تھا تو بابر نے اس سے کہا تھا۔

''اس بلا مقصد خونریزی کا آخر کیا جواز ہے۔''

بابر کے منہ سے پہلی مرتبہ اس طرح کا فقرہ سن کر پہلے تو عارف کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا اور انہوں نے دوبارہ اُسے محض تصدیق کرنے کے لئے کہا تھا۔

''کون سی خونریزی؟''

''بھئی یہی وسیم چوہدری کو اغواء کر کے ہاتھ پاؤں توڑنے یا جسم میں سوراخ کرنے والی خونریزی..... معلوم نہیں ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا پھر یہ فرعون بن گئے ہیں۔ ایک لڑکا جسے یونیورسٹی میں داخل ہوئے بمشکل تین ماہ گزرے ہیں اُسے ہم محض اس جُرم کی سزا دیئے جا رہے ہیں کہ اس نے ہماری مخالف تنظیم کے دو جلسوں میں شرکت کیوں کی؟ عارف بھائی مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے..... یوں لگتا ہے جیسے ہماری تنظیم پر بڑے نامحسوس طریقے سے دشمن نے قبضہ کر لیا ہے اور اب یہ لوگ ایک اچھے مقصد کے لئے جمع ہونے والے جانثاروں کے اس گروہ کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے ہم جو کچھ کر رہے

ہیں آخر اس کا مطلب کیا ہے۔'' بابر نے کھل کر بات کہہ دی تھی۔

''بابر تم ہوش میں تو ہو..... کیا بک رہے ہو.....'' عارف میاں نے گھبرا کر اُسے اس کی اصلیت کا احساس دلانا چاہا۔

''عارف بھائی میں ہوش میں آیا ہی اب ہوں۔ اس سے پہلے جب ہم آنکھیں بند کر کے بندروں کی طرح ''بابا صاحب'' کی ڈگڈگی پر ناچتے رہے تو واقعی ہم ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ عارف بھائی اس ملک کے لئے میرے بزرگوں نے اپنے خون کا نذرانہ دیا تھا تو اس لئے نہیں کہ ہم زبان اور صوبے کے مسئلے پر اپنے ہی بھائی بندوں کا قتل عام شروع کر دیں گے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن آج یا کل تم بھی میری طرح ضرور پاگل ہو جاؤ گے۔ آخر شراب اور شباب کے نشے میں کب تک ڈوب کر ہم اس خونی کھیل کا حصہ بنے رہیں گے۔''

بابر نے کہا اور عارف نے خاموشی سے سن لیا۔

اس بات کا احساس شاید بابر کو ہو گیا تھا کہ عارف اس کے نظریات میں بغاوت کی شکایت ''مرکز'' میں نہیں کرے گا۔ کیونکہ اُن کی دوستی اس تنظیم میں شامل ہونے سے بہت پہلے کی تھی۔ بابر کو تو یہاں تک اُمید تھی کہ عارف اس کا ساتھ دے گا۔

لیکن.....!

عارف نے اس سے کبھی اپنے بھارتی انٹیلی جنس کے جال میں پھنسنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُسے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ یہ راز کبھی کسی کے سامنے نہ کھولے کیونکہ اس کی کم از کم سزا موت تھی۔

''بابر تم میرے دوست ہو۔ بچپن کے دوست! میں تمہیں ایک بھائی کی حیثیت سے نصیحت کرتا ہوں کہ آج کے بعد دوبارہ کبھی کسی کے سامنے یہ الفاظ نہ دہرانا۔ تمہیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ تم جو بغاوت کرنے جا رہے ہو اس کی قیمت چکانے کی ہمت تم میں نہیں۔''

''ہاں! ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ میرے سارے خاندان کو زندہ درگور کر دیں گے لیکن میں کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میں روز روز کی خونریزی سے تنگ آ چکا ہوں۔''

بابر نے زچ ہونے والے لہجے میں کہا تھا۔

یہ اُن دونوں کی آخری ملاقات تھی۔

بابر نے عین آخری لمحات میں زبردست بخار کا ''ڈرامہ'' رچا کر اس مشن سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وسیم چوہدری کے اغواء کا کارنامہ عارف نے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے انجام دیا تھا۔ چونکہ بابر نے اس سے پہلے اس نوعیت کی بہانہ بازی نہیں کی تھی اس لئے بنے بھائی نے یہی سمجھا ہو گا کہ واقعی اسے اچانک بیماری نے گھیر لیا ہے۔

لیکن.....!

اس کے بعد اس کی مشتبہ حرکات نے ان لوگوں کو بابر سے بدظن کر دیا ہوگا۔ فی الوقت عارف نے یہی سوچا تھا۔

✹

کالیا نے اُس سے اگلے روز شام کو ملاقات کرنی تھی۔ اس درمیان منصوبے کے مطابق اس نے بابر کو دھوکہ سے کہیں بلانا تھا جہاں اُن دونوں نے مل کر تنظیم کے اس غدار کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔

بابر کی موت کا کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

اس کا فیصلہ ان دونوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

عارف جانتا تھا کہ بھلے ان کا ضمیر گہری نیند سو چکا ہے اور مستقبل بعید میں بھی اس کی بیداری کے چانسز نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود وہ بابر کے قتل کی گھناؤنی سازش میں حصہ دار نہیں بن سکے گا۔

وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس کا اور بابر کا سامنا ہو جائے تا کہ وہ اسے فوراً جان بچانے کی ترغیب دے سکے..... اگر کچھ دیر ہو جاتی اور بابر فرار ہو جاتا تو فوراً شک اس پر کیا جاتا۔

یہی سوچتا وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا جب اس نے شومئی قسمت سے بابر کو ایک ٹیکسی سے اُتر کر بازار کی طرف آتے دیکھا۔

عارف جانتا تھا کہ بنے بھائی کے حکم کے ساتھ ہی اس کی نگرانی بھی شروع ہو گئی ہو گی لیکن اُسے یہ بھی اُمید تھی کہ شاید ابھی تک اس پر نگران آنکھوں کا تقرر نہیں ہوا۔

وہ اسی طرح موٹر سائیکل چلاتا بابر کے نزدیک پہنچ گیا۔

''سیدھے جرینا ہوٹل پر پہنچ جاؤ۔ فوراً، ابھی گھر نہ جانا۔'' اس نے ایک لمحے کے لئے رُک کر اُس سے کہا اور سیدھا چلتا چلا گیا۔

بابر نے بھی شاید صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کر لیا تھا۔ عارف نے جس انداز میں بات کی تھی اس کے بعد تو اُسے بہت کچھ سمجھ آ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے ٹھٹھک کر صورتِ حال کا جائزہ ضرور لیا تھا پھر فوراً ہی اپنا رُخ تبدیل کر لیا تھا۔ عارف نے اپنی بات کے آخر میں اسے یہ سگنل دے دیا تھا کہ اس کی یہاں آج موجودگی کا کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ملنا چاہئے۔ ''گھر نہ جانے'' کا مطلب ان کی زبان میں یہی تھا۔

بابر انہی قدموں پر واپس پلٹ گیا۔

کافی دور تک اُس نے پیدل فاصلہ طے کیا تھا۔

''جرینا ہوٹل'' ان کے لئے جائے امان تھی۔

دونوں کبھی باقاعدگی سے وہاں نہیں گئے تھے۔ یہ اُن کے کالج کے زمانے کا ساتھی تھا اور دونوں اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اب بھی کبھی کبھی اپنے پرانے دور کی یادیں تازہ کرنے کے لئے دونوں یہاں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ تنظیم کے کسی اور ساتھی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ دونوں یہاں بھی بیٹھتے ہیں۔ جرینا ہوٹل پر آخری مرتبہ وہ آج سے تین چار ماہ پہلے بیٹھے تھے۔

بابر نے دو تین سڑکوں کو پیدل ہی عبور کیا تھا لیکن بڑی احتیاط سے اس بات کا اس نے بطور خاص خیال رکھا تھا کہ اس کی یہاں موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو سکے۔

اس نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا تھا جس پر اس کی آشنائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک موڑ مڑتے ہوئے اس نے سامنے آتے رکشہ کو ہاتھ دے کر روکا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جرینا ہوٹل یہاں سے چھ سات میل دور تھا۔ یہ کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا لیکن بابر نے بطور احتیاط یہاں پہنچنے کے لئے راستے میں تین جگہ سواریاں تبدیل کی تھیں۔ جب وہ ہوٹل پر پہنچا تو عارف پہلے سے اس کا منتظر تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ اپنی اس بالشت بھر کی زبان کو تالا لگا لو..... اس تنظیم میں بہت سے نوجوان تمہاری طرح کے نظریات رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اس طرح علمِ بغاوت بلند نہیں کیا۔ بابر تم گدھے ہو..... تمہیں اس بات کا شعور نہیں کہ تم دو جوان بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو..... بوڑھے والدین کی واحد اُمید اور یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ تم اپنے ہاتھ میں تلوار تھام کر توپوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا تم نے.....''

نہ جانے عارف غصے میں کیا کیا کہتا رہا اور بابر سر جھکائے سنتا رہا۔

اس نے بابر کو بتا دیا کہ تنظیم کی طرف سے کالیا اور اُسے بابر کے قتل کی مہم سونپی گئی ہے۔

''انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہیں۔ جہاں میرے جیسے کانٹے کو نکالنے کا سامان کیا ہے وہاں تمہاری وفاداری کو بھی آزمایا ہے..... تم خود بہتر فیصلہ کر سکتے ہو عارف بھائی..... میرا ذہن تو ماؤف ہو چکا ہے۔'' بابر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

●

اس خبر نے کہ ''بابا صاحب'' کی طرف سے اس کے قتل کے احکامات جاری ہو گئے ہیں۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے گئے۔

''وقت کم ہے میرے دوست۔ جہاں تک میرے ذہن نے سوچا ہے مجھے اس مصیبت کا ایک ہی حل نظر آتا ہے۔ تم یہاں سے گھر نہیں جاؤ گے۔ دوسرے کسی صوبے کی طرف نکل جاؤ وہاں سے جس طرح بھی ممکن ہو سوائے بھارت کے کسی بھی دوسرے ملک کی طرف اپنی شناخت بدل کر نکلنے کی کوشش کرو۔ تمہاری والدہ کی طرف سے پولیس سٹیشن میں تمہارے کل صبح سے گھر سے غائب ہونے کی رپورٹ درج کروائی جانا ضروری ہے..... چونکہ اس فیصلے کو مقامی برانچ سے پوشیدہ

رکھا گیا ہوگا اور تنظیم کی طرف سے کبھی بھی یہ تاثر نہیں دیا جائے گا کہ تم باغی ہو گئے ہو۔ خدانخواستہ ان لوگوں کو اپنے ذلیل مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو یہ فوراً اس قتل کی ذمہ داری مخالف تنظیم پر ڈال دیتے..... اب بھی تمہارے پُراسرار طور پر غائب ہونے پر بھلے ان کو اس بات کا بھی یقین ہو کہ تم خود کہیں چھپ گئے ہو اس کے باوجود تمہارے اغواء کی خوب تشہیر کریں گے اور اس کا الزام بھی مخالف تنظیم یا پھر کسی سرکاری ایجنسی پر لگا دیں گے..... تھانے میں تمہارے اغواء یا غائب ہو جانے کی رپورٹ فوراً درج ہوگی کیونکہ تھانے والوں کو علم ہے کہ تم تنظیم کے آدمی ہو اور تمہارے ساتھ اُن کو ہر ممکن تعاون کرنا ہوگا۔ تم چند دنوں کے لئے دوسرے صوبے میں ٹھکانہ بناؤ۔ اپنے ایڈریس سے مجھے اس فون نمبر پر آگاہ کر دینا..... صرف اتنا پیغام دینا کہ عارف کو کہیں فلاں نمبر پر فون کر لیں..... فی الحال یہ رقم رکھ لو..... میں تمہارا پیغام ملتے ہی تمہیں اور رقم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خالہ جان اور بہنوں کی طرف سے مطمئن رہنا اگر اللہ تعالیٰ نے تم پر مہربانی کر دی اور دوسرے کسی صوبے میں کوئی ٹھکانہ بن گیا تو میں اپنی کوشش سے تمہارا مکان فروخت کروا دوں گا۔ گو کہ یہ مشکل کام ہوگا لیکن انشاء اللہ ہو جائے گا..... جس کے بعد میں خالہ جی اور بہنوں کو بھی تمہارے پاس ہی بھیج دوں گا یا پھر تم کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جاؤ اور حالات بہتر ہونے پر واپس لوٹ جانا..... اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے۔ تم خدا کے لئے جلدی نکل جاؤ۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ خالہ جان کے نام خط لکھ کر مجھے دے دو جس میں انہیں کہہ دینا کہ وہ میرے مشورے پر عمل کریں لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میں نے اُنہیں کیا مشورہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے عارف بھائی..... میرے خیال سے فی الحال اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی۔ میں تمہارے اس احسان کا بدلہ شاید کبھی نہ چکا سکوں۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ کہیں یہ درندے میرے گھر....."

"بابر! میرا ضمیر ضرور مر گیا ہے لیکن میری غیرت ابھی نہیں مری۔ خدا جانے شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیحت دینے کے لئے ہی اس سانحہ سے دوچار کیا ہے۔ میں بھی تمہارے راستے کا مسافر ہوں لیکن میرے پاؤں میں بہت مضبوط بیڑیاں ہیں۔ مجھے یہ بیڑیاں کاٹنی ہیں..... ضرور کاٹنی ہیں اور انشاء اللہ کاٹوں گا لیکن حکمت سے..... میں ان کو اندر سے پھاڑ کے رکھ دوں گا۔" اسے اپنی آواز خود اجنبی لگ رہی تھی۔

عارف کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُن کی زبان سے یہ فقرے کیسے ادا ہو رہے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی زندگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ عالمِ ہوش میں اُن کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نکل سکے گی۔

جس بری طرح سے اُسے تنظیم نے اپنے شکنجے میں جکڑ کر "را" کے سامنے پھینک دیا تھا اس کے بعد سے تو وہ اپنی مرضی سے گردن ہلانے کے لائق نہیں رہا تھا۔

"میرے خیال سے مجھے چلنا چاہئے..... اچھا دوست زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اپنی ماں اور بہنوں کو خدا کے بعد تمہارے آسرے پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ ممکن ہو تو میرے گھر سے میری چیک بک لے لینا۔ میں چاہتا ہوں بنک سے رقم ہی نکلوا لی جائے۔ اب قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت تو محسوس ہوگی۔" بابر نے ایک کاغذ پر اپنی والدہ کے نام پیغام لکھ کر اُسے تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....تم چلو۔ میں انشاءاللہ حالات ٹھیک ہونے پر تم سے ضرور ملوں گا۔ ہمارا بچپن ضرور واپس لوٹے گا۔ گھر کی فکر دل کو نہ لگانا۔ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔'' اتنا کہہ کر اُس نے بابر کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

بابر نے اُسے جھٹکا دے کر اپنے ساتھ گلے لگا لیا۔

دونوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ دونوں کے دل خون رو رہے تھے۔

لیکن.....!

فی الوقت دونوں لاچار تھے۔ اس شہر میں کسی کو ''بابا صاحب'' کے خلاف دم مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سلسلے میں نہ سرکار ان کی مدد کر سکتی تھی نہ خود اپنی جان بچانے سے زیادہ اپنے لئے کچھ کر سکتے تھے۔ پھر بھی غنیمت تھا کہ وہ محفوظ تھے۔

●

بابر سے جدا ہو کر وہ سیدھا گھر آیا تھا۔

اس کی طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔

مینا کشی حسب معمول گھر سے غائب تھی۔ عارف نے اندازہ لگایا تھا کہ آج کل وہ کچھ زیادہ ہی غائب رہنے لگی ہے۔ ضرور کوئی شکار پھانس رہی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچتا تو لرز کر رہ جاتا کہ اس شہر نگاراں میں جہاں پچیس تیس لاکھ غیر ملکی غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہیں جانے کتنی لڑکیاں مینا کشی جیسی ہوں گی اور کتنے مرد اس کی طرح ''را'' کے ایجنٹ ہوں گے۔''

''کیا بنے گا اس ملک کا۔'' جب کبھی یہ خیال آتا تو وہ گھبرا اُٹھتا۔

خدا جانے کون سی ایسی طاقت تھی جس نے ابھی تک اس ملک کی سالمیت کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ جبکہ ہوسِ اقتدار میں اندھے اپنی زمین کا رزق کھا کر پاکستان کے ٹکڑوں پر پلنے والے جانے کتنے انسان نما بھیڑیے پاکستان کی رگوں پر اپنے دانت گاڑے بیٹھے تھے۔

ان کے زہریلے دانت جسدِ ملی میں بہت دور تک اُتر گئے تھے۔ ان لوگوں نے مادرِ وطن کا سودا کہاں کہاں نہیں کیا تھا۔

ایسے ایسے مناظر اُنہیں دیکھنے کو ملے تھے کہ خدا کی پناہ۔

''بابا صاحب'' کے آستانے پر غیر ملکیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ آخر کیا کرنے آتے تھے۔

ایک ایسی تنظیم جس کا وجود پاکستان کے چند شہروں سے باہر کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسی تنظیم کے سربراہ سے انہیں کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

جہاں تک اپنوں کا سوال تھا ان کے تو ''بابا صاحب'' کی چوکھٹ پر سر رگڑنے کی وجہ سمجھ میں آ سکتی تھی کہ وہ تو خون پینے والی جونکوں کی طرح ہر صورت اقتدار سے

چمٹے رہنا چاہتے تھے اور ہر ایسی جماعت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے جو مذموم مقاصد کی بجا آوری میں ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ حکمرانوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ''بابا صاحب'' کے رابطے بیرون ملک کہاں کہاں ہیں..... یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کس کے کھونٹے سے بندھے ہیں اور کس کے اشارے پر بندر کی طرح ناچتے ہوئے پاگل کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔

سب کچھ حکمرانوں کے علم میں تھا۔

انہوں نے درجنوں ایجنسیاں یونہی نہیں پال رکھی تھیں۔ ان کے پاس غلاموں کی ایک فوج ظفر موجود تھی جو انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھیں۔ سیاسی ہوا کے رُخ کا تعین کرتی تھی۔

لیکن.....

''وہ بھولے بادشاہ'' بنے۔ ''بابا صاحب'' کی عظمت کے گن گاتے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس صوبے میں ''بابا صاحب'' ایک طاقت ہے۔ ایک ایسی طاقت جو کسی بھی پلڑے میں اپنا وزن ڈال دے تو طاقت کا توازن ہی بگڑ جائے گا۔ وہ ''بابا صاحب'' کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا کر بھی وہ ''بابا صاحب'' کو خوش رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔

ان حالات میں اگر کہیں تنظیم میں کسی سطح پر کوئی لاوا پک بھی رہا تھا تو اسے باہر نکلنے کی راہ میسر نہیں آتی تھی اور وہ اندر ہی اندر کھول کر پھر ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔

●

عارف کے اندر موت جیسی گہری نیند سویا ضمیر اچانک ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوا تو اسے خود پر کنٹرول پانے میں بڑی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے گھر والوں نے عارف چوہدری کو اتنی بے قراری کے عالم میں دیکھا تھا۔

''خیریت تو ہے بیٹا۔'' بوڑھی ماں سے نہ رہا گیا۔

''سب ٹھیک ہے اماں..... اماں تم ایک کام کرو..... لیکن ایک بات غور سے سن لینا۔ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا ابھی جاؤ اور بابر کی امی کو کسی بہانے سے گھر لے آؤ۔''

اس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا! اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ لئے آتی ہوں ابھی..... ذرا ہنڈیا دیکھ لوں۔''

''نہیں اماں..... تم ہنڈیا کی فکر چھوڑ دو..... بہن دیکھ لے گی۔ تم فوراً انہیں لے آؤ۔''

اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

''اے بیٹا! تم ہوش میں تو ہو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بابر کی امی کوئی بھاگے چلی جا رہی ہے۔ کہاں لے آتی ہوں۔'' اس کی والدہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''اماں! خدا کے لئے تم ابھی جاؤ۔'' اس نے اس طرح عالم وحشت میں اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا کہ بوڑھی عورت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

''اچھا جاتی ہوں..... ابھی جاتی ہوں۔ تم مطمئن رہو۔ آرام سے لیٹ جاؤ میں جا رہی ہوں۔''

بوڑھی عورت کی حیرانگی میں اب پریشانی نمایاں تھی۔ اس نے اپنا برقعہ اُٹھایا اور بابر کے گھر کی طرف چل دی۔

شاید بابر کی ماں کے لئے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ عارف نے اُسے فوری بلا بھیجا ہے۔ ایسا زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ آج سے پہلے عارف نے کبھی ایسے نہیں کہا تھا۔ اس کے گھر کے دروازے اُس پر بند ہی کب ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے اُن کے گھر کے فرد کی طرح اُن کے درمیان آ جا رہا تھا۔

لیکن.....!

کچھ دنوں سے بابر کے تیور بھی بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس بات کا علم تو بابر کی امی کو بھی تھا کہ ان کا بیٹا تنظیم کی سیاست میں بہت زیادہ حصہ لے رہا ہے اور کچھ عرصے سے تو وہ راتوں کو بھی گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔

اُس روز تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکیں جب بابر نے کسی بات پر جھنجھلا کر اپنی امی کے سامنے ''بابا صاحب'' کی شان میں اچھی خاصی گستاخی کر ڈالی تھی۔ یہ ان کے لئے واقعی لرزا دینے والی بات تھی۔

ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا تھا ورنہ وہ تو ''بابا صاحب'' کی تعریفوں کے پل باندھے رکھتا تھا۔ اس طرح اچانک اس کا بدل جانا کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ بابر کی امی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور وہ اندازہ کر سکتی تھیں کہ تنظیم کے ''غداروں'' کے ساتھ تنظیم کے ''وفادار'' کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ مروجہ سیاست کی کبھی حامی نہیں رہی تھیں۔

ان کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو بزور روک سکتیں۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ان کی اولاد نرینہ کا دھیان اپنی پڑھائی کی طرف رہے کسی اور طرف نہ جائے۔ باپ نے، بہنوں نے بھائی کو بہت سمجھایا۔

لیکن.....!

''بابا صاحب'' نے جو زہر ان جوانوں کے ذہنوں میں گھول رکھا تھا اس نے انہیں بدتمیز بنا دیا تھا۔ وہ اپنے والدین کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اب جب سے بابر نے ''بابا صاحب'' کے خلاف گھر میں بڑبڑانا شروع کیا تھا تو اس کے گھر والے خوش ہونے کے بجائے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ ایک مرتبہ اس دلدل میں پھنس جانے والے کے لئے واپسی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور ان کے بیٹے کے اندر جو بغاوت جنم لینے لگی ہے وہ اس خاندان کو کہیں کا نہ چھوڑے گی۔

بابر کی امی کو اس بات کا علم تھا کہ عارف سے زیادہ اُن کے بیٹے کا نزدیکی دوست اور رازدار کوئی اور نہیں۔ آج جب اچانک عارف کی اماں نے انہیں اپنے بیٹے کا پیغام فوراً ملاقات کے لئے دیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔

''خیریت!'' بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا۔

''ارے بہن! بس کیا بتاؤں میں تو خود بڑی پریشان ہوں۔ آج جب سے عارف میاں گھر لوٹے ہیں ایک پل کو قرار نہیں۔ مجھے کہا ہے کہ تمہیں فوراً بلا کر لاؤں اور کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ پابند بھی کر دیا ہے کہ نہ تو اس بات کا کسی اور سے ذکر کروں نہ ہی اس سے کوئی سوال پوچھوں..... عارف کی والدہ نے کہا۔

''چلو میں چلتی ہوں..... ذرا بچیوں کو بتا دوں۔''

●

تھوڑی دیر بعد دونوں بوڑھی عورتیں عارف کے گھر موجود تھیں۔

''اماں آپ ذرا باہر چلیں میں نے خالہ جی سے ضروری بات کرنی ہے۔''

عارف کے منہ سے نکلنے والے کلمات نے ایک مرتبہ پھر دونوں بوڑھیوں کو لرزا کر رکھ دیا۔

''خدا خیر کرے بیٹا! ایسی کیا بات ہے۔'' اس کی ماں کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

''دیکھو اماں خدا کے لئے میری بات مان لو اور کوئی سوال نہ کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔ وقت کم ہے آپ باہر جائیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو آہستہ سے کمرے سے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

بیٹھئے خالہ جان! میں آپ کو اس طرح زحمت دینے کے لئے معافی چاہتا ہوں لیکن مجبوری تھی۔ بابر کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ مجھے اُمید ہے آپ حوصلے اور جرأت سے کام لیں گی۔ پہلے یہ خط پڑھ لیجئے۔ اتنا کہہ کر اس نے بابر کی والدہ کو بابر کا مختصر خط تھما دیا۔

پریشان اور بوکھلائی ہوئی بوڑھی عورت نے خط کپکپاتے ہاتھوں سے تھاما اور پڑھنا شروع کیا جس میں لکھا تھا کہ فی الوقت وہ کچھ مدت کے لئے اپنے گھر والوں سے الگ ہو رہا ہے اور اپنی والدہ کو کہا تھا کہ وہ سوائے عارف کے کسی اور پر اعتبار نہ کریں۔

خط پڑھنے کے بعد انہوں نے استفہامیہ نظروں سے عارف کی طرف دیکھا۔

''خالہ جی وقت بہت کم ہے مختصر بات کرتا ہوں۔'' ''بابا صاحب'' کی طرف سے بابر کو قتل کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں اور بنے بھائی کو مہم سونپ دی گئی ہے۔ اس کی جان کی سلامتی کے لئے اس کا فوراً پردے سے غائب ہو جانا ضروری تھا۔ وہ دوسرے صوبے میں کسی محفوظ مقام پر چلا گیا ہے۔ مجھے دو دن تک اس کے ٹھکانے کی خبر ہو گی جہاں آپ کی اس سے بات کروا دوں گا۔ کارساز تو خدا کی ذات ہے اور ہماری زندگی اور موت کا مالک بھی وہی ہے۔ میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ بابر کی جان بچانے کے لئے میں اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ ارم اور حسنہ میری بہنیں ہیں انہیں کبھی بابر کی کمی کا احساس نہیں ہو گا۔ اگر آپ نے رونا دھونا شروع کر دیا یا خدانخواستہ دیواروں کو بھی اس راز کا علم ہو گیا کہ بابر فرار ہو چکا ہے اور اس میں میرا ہاتھ شامل ہے تو وہ درندے جن کے

چنگل میں ہم پھنس چکے ہیں میرے اور آپ کے گھرانے کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دیں گے۔ فی الوقت یہ راز میرے اور آپ کے اور خدا کے درمیان رہے گا۔ بابر کی بہنوں کو بھی صرف اتنا بتا دیجئے کہ اگر انہیں اپنے بھائی کی زندگی عزیز ہے تو اپنی زبان بند رکھیں اور اس کی زیادہ جستجو نہ کریں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا بیٹے۔" بابر کی ماں نے اچانک ہی کہا تھا۔ اس کے لہجے میں چھپے اعتماد نے عارف کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ خالہ ان سے ہر ممکن تعاون کرے گی اور یہ خطرہ ٹل جائے گا۔

"آپ نے اسی وقت تھانے میں بابر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانی ہے۔ پیسوں کی فکر نہ کیجئے بس یہ کوشش کیجئے کہ رپورٹ درج کروانے کا وقت جتنا پیچھے لے جا سکیں اتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہیں ناں۔ اس وقت پانچ بج رہے ہیں آپ جب پولیس اسٹیشن جائیں تو رپورٹ درج کروانے کا وقت آج صبح یا دوپہر کا لکھوائیے اور یہ کہئے گا کہ اطلاع دیئے بغیر بابر گزشتہ 40 گھنٹے سے غائب ہے۔ چونکہ وہ تنظیم کا سرکردہ ممبر ہے اسے مخالف تنظیم کی طرف سے جان کا خطرہ تھا عین ممکن ہے کہ کسی نے اسے اغواء کر لیا ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس ڈرامے کو کسی بھی مرحلے پر غیر حقیقی نظر نہیں آنا چاہئے۔ مجھے علم ہے کہ وہ کل رات گھر پر نہیں تھا اور اسے پرسوں بھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کیونکہ آج کل وہ تنظیم کے لوگوں سے کچھ دور دور رہنے لگا تھا۔"

عارف نے انہیں سارا پلان سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ایسا ہی ہوگا۔ مجھے تمہاری اور بابر کی دوستی پر فخر رہے گا۔ اس نے زندگی میں شاید یہی ایک اچھا کام کیا تھا کہ تمہارے ساتھ دوستی رکھی۔ ارم اور حسنہ کو میں انشاء اللہ سنبھال لوں گی۔ بابر میری واحد اولاد نرینہ ہے۔ اس کے باپ کا سایہ ہم پر نہیں ہے۔ اب اچھا یا برا۔ لے دے کر اگر ہمارے لئے اس بے رحم دنیا میں کوئی آسرا ہے تو اسی بیٹے کا....." ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ضبط کے مضبوط بندھن توڑ کر آنسو اُن کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

لیکن.....!

بوڑھی اور معزز خاتون نے عینک اُتار کر آنکھیں صاف کیں اور مضبوط ارادے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"رپورٹ درج کرانے کے بعد مقامی آفس میں واویلا کرتی رہئے گا۔ آپ کی طرف سے مسلسل اس الزام کی تکرار ہو کہ اُسے مخالف تنظیم نے اغواء کروایا ہے تاکہ ان وحشیوں کو آپ پر شک نہ ہو سکے۔ اس بات کا خیال رہے کہ "بابا صاحب" بڑا مکار شخص ہے اور آپ کی کڑی نگرانی "آستانے" کے انٹیلی جنس یونٹ سے کروائے گا..... اس لئے بہت محتاط رہئے گا۔"

عارف نے انہیں نصیحت کی۔

"بیٹا انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ انہیں شک نہ ہونے دوں۔ تم بابر کی چیک بک لے جاؤ۔"

"خالہ جی اس دروازے سے باہر جایئے اور کوشش کیجئے کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو کہ تھانے میں رپورٹ لکھوانے سے پہلے آپ نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ اپنی

امی کو میں سمجھا لوں گا..... خدا حافظ!''

''خدا حافظ بیٹا! اللہ تمہیں حفظ و امان میں رکھے۔''

●

خالہ جی کے باہر جاتے ہی اُس نے اپنی ماں کو دوبارہ کمرے میں بلایا۔ ابھی تک بابر کی ماں کے گھر آنے کا علم سوائے ان دونوں کے اور کسی کو نہیں ہوا تھا۔

''اماں بی! مختصر بات یہ ہے کہ بابر کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اگر آپ اُسے کچھ اپنا سمجھتی ہیں تو اس کی زندگی بچانے کے لئے آپ کو میری دو باتوں پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ پہلی بات تو وہی کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں دوسری بات کہ بابر کی والدہ کے اپنے ہاں آنے کا کسی سے تذکرہ نہیں کیجئے گا..... آپ یوں سمجھئے کہ وقت دو گھنٹے پیچھے چلا گیا ہے اور میں ابھی آپ سے مل رہا ہوں۔ خدا کے لئے اس بات کا ذکر میری بیوی یا گھر کے کسی بھی فرد کے سامنے ہرگز نہ کیجئے۔''

عارف کے چہرے کا تناؤ گفتگو کی سنجیدگی اور قدرے گھبراہٹ نے ان کی اماں پر بھی گھبراہٹ طاری کر دی تھی لیکن اُنہوں نے صورتِ حال کو کسی حد تک سمجھتے ہوئے فی الوقت خاموش رہنا اور اپنے بیٹے کی ہاں میں ہاں ملانا ہی ضروری سمجھا تھا۔

''بیٹا! میرے لئے بابر دوسرا بیٹا ہے تم جانتے ہو کہ میں نے اُسے ہمیشہ ماں کی نظروں سے دیکھا ہے۔ مطمئن رہنا اس کی زندگی مجھے تمہاری زندگی کی طرح عزیز ہے۔ میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔ تمہارے ابا سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔'' اماں بی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عارف کی والدہ نے فی الوقت بیٹے کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی، لیکن ایک دھڑکا ان کے دل کو مستقل لگ گیا تھا۔

بابر کی والدہ نے عارف میاں کی نصیحت پلے باندھی۔ گھر آ کر انہوں نے مناسب پیسے لئے اور تھانے کا رُخ کیا۔

تنظیم کے ایک سرکردہ رُکن کی والدہ کی تھانے میں آمد کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کسی کی مجال تھی کہ اُن کے حکم سے انکار کرتا۔ موقع پر موجود اے ایس آئی نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ڈرتے ڈرتے بابر کی والدہ سے معمولی رشوت وصول کر کے دوپہر کے اوقات میں اُن کی رپورٹ درج کر دی۔ اس وقت تھانے میں زیادہ ذمہ دار لوگ نہیں تھے اور عملے کے زیادہ لوگ عدالتوں میں مصروف تھے۔ یہ بات رپورٹ لکھنے والے تک ہی رہی کہ ایف آئی آر میں کچھ گھنٹوں کا ہیر پھیر کیا گیا ہے۔

یہاں سے بوڑھی عورت نے مقامی تنظیم کے دفتر کا رُخ کیا اور زندگی میں دوسرا جھوٹ یہ بولا کہ وہ صبح سے دو تین مرتبہ دفتر آئی تھی لیکن یہاں تالا لگا دیکھ کر واپس لوٹ گئیں۔ واقعی دفتر صبح سے بند تھا اور کچھ دیر پہلے ہی کھلا تھا۔

انہوں نے مقامی ذمہ داروں کو بتایا کہ بابر دو دن سے غائب ہے اور مجبور ہو کر انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے۔ انہوں نے روتے ہوئے تنظیم کے مقامی ذمہ داروں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ضرور اُن کے بیٹے کو مخالف تنظیم والوں نے اغواء کیا ہے۔ کیونکہ ان کے بیٹے نے کئی دفعہ اس بات کا شک ظاہر کیا تھا۔

''خالہ بی! آپ بے فکر رہئے گھر تشریف لے جایئے ہم انشاء اللہ پوری کوشش کریں گے میں سیکٹر آفس سے رابطہ کر کے انہیں صورتِ حال کی خبر دیتا ہوں۔''

مقامی یونٹ انچارج نے انہیں تسلی دی اور تنظیم کے ساتھی انہیں گھر تک چھوڑنے آئے۔ پھر انہیں تسلی و تشفی دے کر واپس لوٹ گئے۔
بابر کی بہنوں کو جب اس سانحہ کی خبر ہوئی تو ان کے گھر میں کہرام مچ گیا اور محلے کے لوگ پُرسہ دینے کے لئے جمع ہونے لگے۔

●●●

سفر آخر سفر ہے

عارفہ کو اچانک اپنے ہاں دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ اور یہاں.....؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شیر گل نے گھر میں داخل ہو کر معمول کے مطابق اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی اور جیسے ہی گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کی نظر صحن میں بیٹھی عارفہ پر پڑی جو اس کی والدہ کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔

''ہاں میں..... کیا میں یہاں نہیں آ سکتی۔ کیا ہوا اگر میری سہیلی اس دنیا میں نہیں رہی۔ میں تو ابھی زندہ ہوں۔'' اُس کی آواز میں چھپے کرب نے شیر گل کو بھی اُداس کر دیا تھا۔

وہ خاموش رہا۔

اس وقت خاموشی سے بہتر کوئی زبان نہیں تھی جو اُس کے دلی جذبات کی عکاسی کر سکتی تھی۔

''تم بیٹی کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لاتی ہوں۔'' نجمہ کو بوڑھی ماں جس کی آنکھیں اپنی مرحومہ بیٹی کے لئے خون روتے روتے اب دھندلانے لگی تھیں ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلی گئی۔

''خدا کو شاید یہی منظور تھا۔ کاش وہ اس روز کالج ہی نہ گئی ہوتی لیکن نہیں کوئی تو بہانہ آخر بننا تھا۔''

شیر گل نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں بہت عجیب محسوس کر رہی ہوں آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے..... سنا ہے کسی نے اس موذی کو کتے کی موت مار ڈالا ہے..... یقیناً نجمہ کی روح کو بہت خوشی ہوئی ہوگی۔''

عارفہ نے شیر گل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ظالموں کی رسی دراز کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت ہے لیکن جب وہ گرفت پر آئیں تو پھر بڑے بڑے نمرود اور فرعون بھی نہیں بچ پاتے، اس بے چارے کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔''

شیر گل نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''شیر گل! معلوم نہیں آپ میری بات کو کس انداز میں لیں گے، لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس درندے کی موت سے میرے دل پر پڑی منوں وزنی چٹان ہٹ گئی ہے۔ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ اتنی کمزور کہ اپنے والدین کی عزت کے خوف سے میں نے اپنی ہتھیلی پر حملہ کرنے والے وحشیوں کی نشاندہی بھی نہ کی، لیکن خدا شاہد ہے میں نے ایسا کسی خوف سے نہیں محض اپنے والدین کی بے حرمتی کے ڈر سے کیا۔ مجھے مرنے سے خوف نہیں آتا شیر گل۔ میں ساری زندگی اسی پچھتاوے کا شکار رہوں گی کہ اس وحشی کی موت میں میرا ہاتھ کیوں نہیں تھا..... کاش میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر موت کی گہری نیند سلایا ہوتا..... کاش ایسا ہوتا۔''

انٹیلی جنس کی نوکری کرتے ہوئے شیر گل کو بھی چار پانچ سال ہونے کو آئے تھے اور وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی اداکاری نہیں کر رہی۔ اس کے دل کی آواز ہے جو اس کے ہونٹوں کے راستے باہر آ رہی ہے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ شیر گل کے گھر آنے کے جرم کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔

واقعی وہ بہادر لڑکی تھی۔

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں عارفہ۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ تم کسی ذہنی کش مکش کا شکار ہو کیونکہ اس بھیانک تجربے سے میں بھی گزرا ہوں لیکن اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ اچھا ہوا تم نے ذاکر کا نام پولیس کے سامنے نہیں لیا۔ ورنہ خدا جانے ''بابا صاحب'' کے غنڈے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے لیکن تم نے دیکھا وہ مارا گیا..... وہ کتے کی موت مارا گیا۔ ایک نجمہ ہی کیا نجانے ایسی کتنی معصوم اور بے گناہ لڑکیاں جنہیں اس موذی نے روحانی اور جسمانی موت سے دوچار کیا ہے آج خوش ہوں گی۔

انسان بے بس ضرور ہے لیکن ظلم کے خلاف اگر کمزور انسان بھی ڈٹ جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں۔''

شیر گل نے کہا۔

اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ عارفہ صورتِ حال کو سمجھنے لگی ہے۔ یہ عارفہ ہی تھی جس نے اس قاتل کی نشاندہی کی تھی اور وہ دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شہر کی پولیس کم از کم ذاکر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یقیناً اُسے اندازہ ہو گا کہ یہ کارنامہ کس نے انجام دیا ہے۔

''میں اس کی جان کی سلامتی کے لئے خدا کے حضور جانے کتنی دعائیں مانگ چکی ہوں شیر گل جس کسی نے اس موذی کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ اُس نے واقعی اس شہر کی سہمی ہوئی اور خوفزدہ لڑکیوں کو نئی زندگی سے دوچار کیا ہے۔ شیر گل شاید آپ اندازہ کر سکیں کہ اس شہر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم نجانے کتنی لڑکیاں ان غنڈوں کی ہمیت کا نشانہ بننے کے بعد اس خوف سے حرفِ شکایت لب پر نہیں لا سکتیں کہ ان کے والدین اور بہن بھائیوں کو زندہ درگور کر دیا جائے گا..... آپ کو علم ہے کہ ذاکر اور اس کے درندے ساتھی جو بلا خوف و خطر کسی بھی باکرہ لڑکی کی عزت کو مٹی میں ملا دیتے تھے اس کی زبان بند رکھنے کے لئے اس کی

پاکدامنی کا خون کرنے کے بعد اُسے یہ احساس دلا دیتے تھے کہ اگر اس نے اپنی زبان کھولی تو اس کی بہنوں اور بعض حالتوں میں ماں کا بھی یہی حشر ہوگا اور یہ بے چاری لڑکیاں خوفزدہ بھیڑ کے بچوں کی طرح ان وحشیوں کے جبر سہتی رہتی تھیں۔ شیر گل میرے کالج کی تین لڑکیاں گزشتہ ایک سال کے دوران اپنی بے کسی اور بے بسی پر بطور احتجاج خودکشی کر چکی ہیں۔ ان ہنستی مسکراتی زندگیوں کو موت کے اندھے غار میں دھکیلنے والا یہی وحشی درندہ ذاکر اور اس کے ساتھی تھے۔''

●

اس مرحلے پر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

شیر گل کی ماں چائے بنا کر لے آئی تھی اور ان کے سامنے دھری میز پر رکھ کر واپس لوٹ گئی تھی شاید ابھی تک اس کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا ناممکن تھا۔

''عارفہ! آپ کو اس بات کا احساس تو ہوگا کہ اس گھر میں آپ کی آمد سے ان لوگوں.....

''جہنم میں گئے وہ لوگ۔ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی مصلحتوں پر۔ میں نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ میں زندگی میں اُن کا پہلا اور آخری ناجائز حکم مان رہی ہوں۔ یہ زندگی میری ہے۔ خدا کی عطا کردہ اس زندگی کو اپنی جان کو اپنے آپ کو میں نے اس شہر میں جنم لے کر تنظیم کے وحشیوں کے پاس گروی نہیں رکھ دیا۔ وہ کون ہوتے ہیں مجھے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے والے۔ شیر گل! میں یہاں حوصلہ پانے آئی ہوں۔ مجھے اُمید کی کرن دکھائی دی ہے۔ میں اندھیروں میں بھٹکنے کے بجائے روشنی میں آ کر جینا چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بے حوصلہ نہ کرنا۔ میری اُمید کو اس ابتدائی مرحلے پر ہی موت کی نیند نہ سلا دینا۔ یہ بغاوت جو میرے اندر جاگی ہے میرے جیسی کئی مجبور اور مظلوم لڑکیوں کے لئے مشعل راہ بن جائے گی۔ شیر گل مجھے اس نازک مرحلے پر آپ کا ساتھ چاہئے۔'' اُس نے شیر گل کی بات کو غصے سے کانٹتے ہوئے اچانک ہی اپنی بات کے خاتمے پر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو شیر گل گڑبڑا کر رہ گیا۔

عارفہ کی اس اچانک اور قطعی لاشعوری حرکت نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

خود عارفہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس نے حیران پریشان شیر گل کا بازو چند لمحے تھام کر آہستگی سے چھوڑا اور شرمندہ سی ہو کر نظریں جھکا لیں۔

خود شیر گل ایسی ہی کیفیت کا شکار تھا۔

چائے دونوں کے ہاتھوں میں پکڑی پیالیوں میں ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ دونوں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

●

پہلے شیر گل نے حوصلہ کیا اور اپنی نظریں اس پر گاڑ دیں۔

''آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور لے لیجئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کیتلی میں موجود چائے اس کے کپ میں انڈیل دی تھی۔

سحر زدہ سی عارفہ نے کسی معمول کی طرح اپنا پیالی والا ہاتھ آگے کر دیا۔

''عارفہ! اس لمحے خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہاری بات کا کیا جواب دوں۔ مجھے علم نہیں کہ تمہارا یہ فیصلہ جذباتی ہے یا واقعی تم نے سوچ سمجھ کر بغاوت کی یہ راہ اپنائی ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں ایک بات ضرور کہوں گا کہ انسانوں کی جس قبیل سے میرا تعلق ہے وہاں بزدلی کو بے غیرتی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے لئے کوئی انکشاف نہیں کرنے جا رہا۔ تم سمجھدار ہو اور جان گئی کہ ذاکر کو اس بھیانک انجام تک کس نے پہنچایا ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا اور سرکاری ملازم ہوں۔ ڈسپلن میری زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک تنظیم اور قاعدے سے زندگی بسر کی ہے۔ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اُسے مرنا ہے۔ آج نہیں تو کل، لیکن بے غیرتی کی زندگی سے عزت کی موت بدرجہا بہتر ہے۔ یہ سبق ہمیں پیدا ہوتے ہی سکھا دیا جاتا ہے۔ نجمہ مجھے کتنی عزیز تھی تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ ٹریفک کے کسی حادثے میں ماری جاتی تو ہم اُسے خدا کی رضا جان کر قبول کر لیتے لیکن کوئی بھی وحشی درندہ محض اس زعم میں کسی بے گناہ کو جان سے مار ڈالے کے قانون نافذ کرنے والے اس کے سامنے بے بس ہیں اور اُسے قتل عام کا لائسنس محض اس لئے مل گیا ہے کہ وہ حکمرانوں کی کمزوری بن چکا ہے۔

قانون کی اطاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر حکومت کسی کو کھلی غنڈہ گردی کی اجازت دے دے تو ہم اس کی وحشت اور بہیمیت پر خاموش تماشائی بنے رہیں۔ دنیا کی عدالتوں نے اس فانی زندگی کے ساتھ دم توڑ دینا ہے۔ لیکن خدائی عدالت ایک دائمی حقیقت ہے جہاں ہم سب نے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ پیر سلامت ہوں اور اُس کی بہن کو محض اس لئے درندگی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے کہ اس نے وحشیوں کی اطاعت سے انکار کر دیا، اپنی عزت کو اپنی جان پر مقدم جانا..... شہیدہ کے اس عمل نے اسے تو خدا کے دربار میں سرخرو کر دیا لیکن اس کا بھائی جسے کل خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے وہاں کیا منہ لے کر جائے گا۔ جہاں انسانی قانون بے بس ہو جائے وہاں مکافاتِ عمل ہوتا ہے۔ جو ہو کر رہا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم نے ایک روایت قائم کی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ اب ہر کوئی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ضرور سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ مصلحتوں کا شکار ہو کر وہ ظالموں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنے رہیں اور اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بغاوت کی وہ راہ جو تم نے اپنائی ہے دراصل سلامتی کا راستہ ہے۔ باغی تو تم سے اس سے پہلے تھیں۔ خدا کے احکامات کی باغی..... تم نے دنیاوی مصلحتوں کو مقدم جانا اور کسی بھی خوف کا شکار ہو کر خدا کے احکامات کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے حقائق جن کا تمہیں علم تھا کی پردہ پوشی کی اور نہ صرف یہ بلکہ بے گناہوں کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔''

ایک لمحے کے لئے رُک کر اُس نے عارفہ کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ تابعدار مریدوں کی طرح احترام کے بے پناہ جذبات کے ساتھ اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کی بات سن رہی تھی۔

''یہ تو سلامتی کی راہ ہے..... بد بخت انسانوں کا ایک ایسا گروہ جس نے ناجائز ذرائع، دھونس، دھاندلی، مروجہ گھٹیا اور ذلیل قسم کی سیاست کے بل بوتے پر اتنی طاقت حاصل کر لی ہے کہ اب وہ ریاست کی سالمیت کے لئے چیلنج بن رہا ہے اور خدا کے نام پر لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر حاصل کردہ اس ملک ہی کو توڑنے پر تلا بیٹھا ہے۔ ایسی انسانیت کش لسانی تنظیم کے خلاف اپنی حد تک علم بغاوت بلند کرنا جہاد ہے۔ اس میں ہم سب کی سلامتی ہے کاش اس شہر کے مردوں کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو جائے۔ کاش کمزوری اور ہوس زدہ حکمرانوں کو بھی علم ہو جائے کہ مصلحت اور منافقت جہنم کا راستہ ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم نے جو راستہ اپنایا ہے اس پر ہر قدم پر تم مجھے اپنے شانہ بشانہ موجود پاؤ گی۔ سچائی کے اس سفر میں آنے والی موت شہادت ہے اور شہادت کی موت ہی کسی مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔ پاکستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں ان کے خلاف تم خود کو کبھی اکیلے محسوس نہیں کرو گی۔''

اپنی بات کے خاتمے پر شیر گل نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

عارفہ محسوس کر رہی تھی کہ قدرت نے اسے صحیح مقام پر پہنچا دیا ہے اور زندگی کے گھور اندھیروں میں اس نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو کچھ پل ہی کے لئے سہی اندھیروں کی موت ضرور بنے گی۔

''شیر گل میں یہاں آئی تو ایک کمزور لڑکی تھی لیکن تم نے مجھے جس جرأت سے نوازا ہے وہ میرا سرمایہ افتخار ہے۔ میں تمہیں ان لوگوں کی ہر ایسی سازش کا سراغ لگا کر دوں گی جس سے ملک و ملت کو کوئی خطرہ درپیش ہو جس کے بعد تم اس قابل ہو سکو کہ کوئی جرم کرنے سے پہلے ہی ان موذیوں کی گردن دبوچ لو۔''

''کاش ایسا ممکن ہو۔'' شیر گل نے دل ہی دل میں کہا۔

''مجھے اب چلنا ہوگا۔'' عارفہ نے وقت کا احساس کیا۔

''آؤ میں تمہیں سٹاپ تک چھوڑ آؤں۔''

شیر گل بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی والدہ نے دونوں کی گفتگو تو نہیں سنی تھی لیکن سب کچھ اپنے وجدان سے جان لیا تھا۔

''بیٹی کبھی کبھی آ جایا کرو۔ تجھے دیکھ کر مجھے نجمہ.....'' بوڑھی لیکن حوصلہ مند عورت نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور منہ موڑ کر واپس لوٹ گئی شاید وہ اپنے آنسو اپنے بیٹے سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

دونوں باہر آ گئے۔

دوپہر ڈھل چکی تھی اور شہر نگاراں پر شام اُترنے لگی تھی۔ شام کو چلنے والی ہوا نے دوپہر کے حبس زدہ ماحول کو قدرے تازگی بخش دی تھی۔ دھوپ کی جان توڑ حدت دم توڑ چکی تھی۔

عارفہ نے کہا اور ویگن کی طرف چل دی۔

''خدا حافظ!'' شیر گل نے کہا۔

وہ سٹاپ پر کھڑا ویگن کو اس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر واپس لوٹ آیا۔

***

جاری ہے...

احسان شناس

کالیا شام کو جب عارف سے ملنے آیا تو بابر کے غائب ہونے کی خبر نے اُسے چونکا دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....'' کالیا نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میرا مطلب کیا ہے؟ یار میں نے کوئی غیر ملکی زبان نہیں بولی۔ وہ گزشتہ دو دن سے غائب ہے اور سُنا ہے کہ اس کی والدہ نے تھانے میں اس کے اغواء کی رپورٹ بھی لکھوا دی ہے۔'' عارف نے وضاحت کی۔

''بھاگ گیا سالا۔'' کالیا نے اُسے گالی بکتے ہوئے کہا۔

''یا بھگا دیا گیا۔'' عارف نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کالیا کو کچھ سوچنے کا موقعہ دیئے بغیر اُسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس کے متعلق کچھ سوچتے عارف نے گیندان کے کورٹ میں پھینک دی۔

''کیا بات کر رہے ہو تم..... ہوش میں تو ہو۔'' کالیا چکرا کر رہ گیا تھا۔

''کالیا!'' آستانے میں کوئی دشمن کا آدمی بیٹھا ہے۔ جو بھی فیصلہ ہو اُس کی اطلاع باہر آ جاتی ہے۔ مجھے پہلے سے شک تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ ہم میں غدار بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ ضرور کسی نے بابر کو بتا دیا ہو گا کہ اس کے قتل کا حکم جاری ہو چکا ہے اور وہ بھاگ گیا..... یہ اغواء کی رپورٹ تو مجھے کوئی ڈرامہ ہی نظر آ رہا ہے..... اس کے پس پردہ کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے..... خیر! جائے گا کہاں میں تو اُسے زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر بنے بھائی کے سامنے پیش کر دوں گا۔''

عارف بڑی شاندار اداکاری کر رہا تھا۔

''مجھے بھی معاملہ گڑبڑ ہی نظر آتا ہے۔ بنے بھائی کو اطلاع ہو گئی ہے یا نہیں۔'' کالیا نے پوچھا۔

''میں نے تین چار فون کئے ہیں۔ مل نہیں رہے۔ میرے خیال سے اُن کے ہاں چلتے ہیں۔ مل کر بات کریں گے۔'' عارف نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے!'' کالیا گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہ کہیں بابر کے فرار میں اس کا ہاتھ شامل نہ کر دیا جائے کیونکہ کالیا کو بنے بھائی نے عارف میاں سے دو روز پہلے اعتماد میں لے کر یہ حکم سنایا تھا اور اس بات کے امکانات زیادہ تھے کہ اس پر شک کیا جا سکتا تھا کیونکہ عارف میاں کے گھر

پہنچنے سے پہلے ہی بابر غائب ہو چکا تھا۔

دونوں تھوڑی دیر بعد عارف کی گاڑی پر بنے بھائی کی طرف جا رہے تھے۔

بنے بھائی کسی کام سے گھر سے باہر تھے دونوں مہمان خانے میں اُن کے منتظر تھے۔ رات گئے جب بنے بھائی کی واپسی ہوئی تو ان کی لٹکی ہوئی شکلیں دیکھ کر اُن کا ماتھا ٹھنکا۔ بنے بھائی دوسرے شہر گیا ہوا تھا اُسے ابھی تک بعد میں پیش آنے والے واقعات کا علم نہیں ہوا تھا۔

بنے بھائی نے ملاقات کے لئے بیٹھے باقی لوگوں سے معذرت کر کے اُنہیں اگلے روز آنے کا کہہ دیا اور خود ان لوگوں کے ساتھ اہم میٹنگ کا بہانہ کر کے محفوظ کمرے میں چلے گئے۔

''بنے بھائی بھاگ گیا سالا۔'' اس مرتبہ کالیا نے پہل کی۔

''نہیں بنے بھائی بھگا دیا گیا۔'' عارف نے حملہ کیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' بنے بھائی کا پارہ اچانک چڑھ گیا۔

''اس کی ماں نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی ہے کہ بابر دو دن سے غائب ہے۔'' کالیا نے وضاحت کی۔

''کہیں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی وہ۔'' بنے بھائی نے غصے سے کہا۔

''نہیں بنے بھائی میں نے اچھی طرح انکوائری کر لی ہے۔ دو دن سے اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ مقامی یونٹ میں تو اس کا آنا جانا پہلے بھی کم تھا۔ اب تو وہ اُدھر کا رُخ ہی نہیں کرتا تھا۔ عارف نے وضاحت کی۔

''یہ بھی تو ممکن ہے مخالفوں نے اسے اغواء کر لیا ہو..... آخر اُس کے دشمن بھی تو بہت تھے۔'' کالیا نے کہنا چاہا۔

''کالیا یار تم آخر یہ ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو کہ وہ خود غائب نہیں ہوا۔ جبکہ میرا استدلال یہ ہے کہ وہ خود غائب ہوا ہے..... اور عین ممکن ہے کہ اُسے دو دن پہلے ہی کسی نے بھاگ جانے کا مشورہ دے دیا ہو۔ آخر آستین کے سانپ کہاں نہیں پائے جاتے۔ یہ جو سرکاری ایجنسیوں کے لوگ شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھرتے ہیں تو کیا وہ جھک مار رہے ہیں۔ کوئی تو اُنہیں اپنے کام کا آدمی ملا ہوگا۔''

عارف نے بڑی چالاکی اور چکر بازی سے کالیا کو ایسی دلدل میں دھکا دے دیا تھا کہ اب اس کے بچنے کی اُمید ہی کم نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مکاری سے بنے بھائی کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ بابر کو دو روز پہلے اپنے متعلق تنظیم کے فیصلے کا علم ہو گیا ہوگا اور اس کا اشارہ اس سلسلے میں نام لئے بغیر کالیا کی طرف تھا۔

اب صورت حال یہ بن گئی تھی کہ کالیا کو عارف اس طرح ہیر پھیر کر کے بات کہتا کہ وہ بے چارہ مسلسل صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ جس سے بنے بھائی نے ذہن میں یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ اگر یہ بے قصور ہے تو عارف کی طرح جرأت سے بات کیوں نہیں کر رہا اور اس طرح گھبرایا گھبرایا سا کیوں نظر آ رہا ہے۔

بنے بھائی کھانے کا کہہ کر اگلی کوئی بات سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون پر ''آستانہ'' میں بات کر رہے تھے۔ جہاں سے مشورے کے بعد انہوں نے کوئی انتہائی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

●

کالیا تنظیم کا بڑا پرانا جاں نثار تھا۔ اب تک بنے بھائی کے حکم پر وہ درجنوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس نے عارف میاں کی طرح بھارتی انٹیلی جنس کے ٹریننگ کیمپ میں خصوصی تربیت حاصل کی تھی۔ اب تک ملک کے کئی انتہائی اہم اور خفیہ راز کالیا کے ذریعے ''را'' کو پہنچ چکے تھے۔

اب تک درجنوں باغیوں کی ماؤں بہنوں کی وہ کالیا کے ذریعے بے حرمتی کروا چکے تھے۔ اتنے اہم شخص کے متعلق بنے بھائی اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں بہرحال مشاورت درکار تھی۔

شاید دوسری طرف بھی قسمت عارف میاں کی یاوری کر رہی تھی کیونکہ جس اہم ایم پی اے سے بنے بھائی نے بات کی تھی۔ وہ قتل و غارت گری سیل کا انچارج تھا اور اس نے بنے بھائی سے کہا تھا کہ جو شخص پیسے ہی کے لئے ان کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پیسے ہی کے لئے دوسروں کے لئے بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے وہ کسی سرکاری ایجنسی سے مل گیا ہو اور انہیں اس بات کی اطلاع دے دی ہو۔ بابر بھی تو کسی سرکاری ایجنسی کے لئے کام کر رہا تھا اُن لوگوں نے ہی کالیا کی اطلاع پر اُسے فوراً غائب ہو جانے کا مشورہ دیا ہوگا۔

بنے بھائی کے دماغ میں یہ بات ایسی بیٹھی کہ پھر وہ اسی پر قائم ہو گئے۔ انہوں نے سوچا یوں بھی کالیا ان کے اتنے گناہوں میں شریک ہو چکا ہے کہ اگر وہ کسی سرکاری ایجنسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اُنہیں جہنم رسید کروا دے گا۔

اس مرتبہ بنے بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ دو مسلح باڈی گارڈ بھی موجود تھے۔

''باندھ دو سالے کو اور لے جاؤ آستانے میں۔'' انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی کالیا کی طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دیا۔

دونوں کے کالیا کی طرف بڑھنے سے پہلے عارف کا ہاتھ چل گیا۔ اُس نے اچانک اُٹھ کر کھڑے ہونے والے کالیا کے گھٹنے پر ایسا ہاتھ مارا کہ وہ منہ کے بل نیچے آن گرا۔

''سالا! بھاگنا چاہتا ہے۔ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ کمینہ، پاجی۔ غدار تیری کھال کھینچ کر جسم سے الگ کر دوں گا۔''

عارف اپنی اداکاری کے مکمل جوہر دکھا رہا تھا اور دونوں باڈی گارڈ کالیا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہاں پھینک گئے۔

''ایمبولینس کے لئے فون کر دیا گیا۔ اپنے مریض کو ہسپتال لے جا کر اس کا خوب علاج کرو۔ اس سے سچ اگلوائے بغیر اسے مرنے نہ دینا۔''

بنے بھائی نے عارف سے کہا جو اکساری اور جاں نثاری کی تصویر بنے بنے بھائی کے ہر حکم پر اس طرح سر ہلا رہے تھے جیسے اُن کے ایک اشارے پر اپنا دل اپنے

ہاتھوں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں گے۔

''تم نے اچھا نہیں کیا عارف۔ میں کتنا بُرا سہی تمہارے خلاف میں نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ جو شخص میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہارے حوالے کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بھی حکم دیا تھا کہ معمولی شک گزرنے پر تمہیں گولی مار دوں۔ میں چاہتا تو یہاں آنے سے پہلے تمہارا کام تمام کر کے کہہ دیتا کہ تم نے بابر کو فرار کروایا ہے اور کوئی مجھ سے نہ پوچھتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا..... جبکہ تم نے کم از کم اس مرتبہ مجھے غلط پھنسوایا ہے حالانکہ تم سے زیادہ بہتر اس بات کو کوئی نہیں جانتا کہ میں نے بابر کو فرار نہیں کروایا۔ عارف مجھے اب بھی تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ اوّل تو یہ لوگ مجھے اب زندہ نہیں چھوڑیں گے کیونکہ میں ان کے بے شمار گناہوں کا عینی شاہد ہوں۔ ایک بات میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے بنے بھائی کو کتے کی موت ضرور ماروں گا۔ یہ میرا خدا تعالیٰ سے عہد ہے اگر اس نے اپنی رحمت کی اور میرے گناہ معاف کر دیئے تو وہ مجھے ضرور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی مہلت دے گا۔''

●

بابر والے واقعے کے بعد سے عارف میاں کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کسی نے اُن کا دل نکال کر وہاں کوئی اور دل رکھ دیا ہے۔ ان کے خیالات یکسر بدلنے لگے تھے کم از کم تنظیم کے معاملے میں اُنہیں کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہی تھی۔

اس وقت بھی عجیب حادثہ گزرا۔

اُسے یوں لگا جیسے کالیا سچ کہہ رہا ہے۔ جیسے واقعی اس کے خیالات بدل گئے ہیں اور عارف جیسے بے شمار نوجوانوں کو بلیک میلنگ کے ذریعے وطن سے غداری پر مجبور کرنے والے بنے بھائی کو جیسے واقعی کالیا قتل کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔

''کالیا مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا سچ..... لیکن اگر واقعی تمہارے اندر کوئی انقلاب آ گیا ہے تو میں اتنا گرا ہوا انسان نہیں کہ تمہیں اس طرح مرجانے دوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم ایک دفعہ ضرور ان کے چنگل سے نکلو گے اور ہاں بنے بھائی کا بہت سا قرض میں نے بھی لوٹانا ہے۔ اگر تم کچھ کئے بغیر مر بھی گئے تو مطمئن رہنا کہ میں تمہارے حصے کا کام کر دوں گا۔''

باتیں کرتے کرتے وہ کالیا کے ہاتھوں کی رسیوں کی گانٹھیں کھول کر انہیں اتنی ڈھیلی کر چکا تھا کہ اب وہ آسانی سے اپنے پاؤں کی رسیاں کھول سکتا تھا۔

''ایمبولینس آ گئی۔'' بنے بھائی نے اچانک اندر آ کر انہیں مطلع کیا۔ بنے بھائی کے چہرے پر برستی لعنت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

ٹھیک ہے بنے بھائی مریض کو بھیج دیتے ہیں۔ میں بھی پہنچتا ہوں اور کرتا ہوں اس کا آپریشن۔''

عارف کی بات ختم ہونے پر بنے بھائی کے حلق سے بلند ہونے والے خونخوار قہقہے سے کمرے کے در و دیوار ہل کر رہ گئے تھے۔

''آؤ چلتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عارف نے زمین پر گرے کالیا کو اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔

کالیا نے اُٹھتے ہی بنے بھائی کو گالیاں دینی شروع کر دی تھیں۔

عارف نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

''بہت زبان چلتی ہے سالے کی۔ اے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جا کر ٹیپ لاؤ۔ ابھی اس کی زبان بند کرتا ہوں۔'' اس نے مسلح باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔

بنے بھائی گالیاں سن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا..... باڈی گارڈ ٹیپ لینے چلا گیا۔

''یہاں بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ مسلح باڈی گارڈ موجود ہیں۔ ایمبولینس میں صرف دو نرسیں ہوں گی۔ وہاں موقع مل جائے گا۔'' اُس نے کالیا کے کان میں سرگوشی کی۔

باڈی گارڈ ٹیپ کا رول لے آیا تھا۔

''اب بولتے رہنا بیٹا۔'' کہتے ہوئے اُس نے مغلظات بکتے کالیا کے منہ کو ٹیپ سے بند کر دیا۔

اُسے قریباً گھسیٹتا ہوا وہ برآمدے تک لایا تھا جس کے ساتھ ہی تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایمبولینس کے باہر دو مستعد نرسیں اپنے ''مریض'' کے استقبال کے لئے موجود تھیں۔

دونوں نوجوان تھیں۔

لیکن.....!

اُن کے چہروں سے درندگی اور آنکھوں میں وحشت برس رہی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے انہوں نے کوئی نشہ کر رکھا ہو۔ کالیا کی شکل پر نظر پڑتے ہی اُن کی آنکھوں میں پہلے سے موجود وحشت دوچند ہو گئی۔

''لو بھئی ذرا خیال سے لے جانا..... مریض کی حالت بڑی نازک ہے۔'' عارف نے آنکھ دبا کر انہیں کہا۔

''بے فکر رہئے ڈاکٹر صاحب ہم خدمت میں کوئی کمی نہیں آنے دیں گے۔'' ایک نرس نے بڑا فحش اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''چل بیٹا ایمبولینس کے اندر آرام کر لے۔'' عارف نے اسے ایمبولینس کے پچھلے دروازے کے نزدیک پہنچا کر کہا۔

کالیا نے جان بوجھ کر معمولی سی ہچکچاہٹ دکھائی تھی جب اچانک ایک نرس نے اس کی پسلی میں اور دوسری نے دوسری پسلی میں زوردار ہاتھ مارا۔ کالیا کے جسم کو 440 وولٹ کا کرنٹ لگا اور وہ تڑپ کر قریباً اُچھل کر اندر جا گرا۔

دونوں نے داد طلب نظروں سے عارف میاں کی طرف دیکھا۔ جنہوں نے تنظیم کے اصول کے مطابق دونوں کے ساتھ باری باری معانقہ کر کے انہیں بھرپور داد دی۔

بنے بھائی اس منظر سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے عارف کو اندر آنے کا اشارہ کر کے واپس مڑ گئے۔

دونوں نرسوں نے عارف کو بڑے فحش اشارے کرتے ہوئے جلد آستانہ پہنچنے کی تلقین کی اور ایمبولینس کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

●

''بنے بھائی خدا کا شکر ہے کہ اس غدار کا بروقت علم ہو گیا اور ہاں آپ بابر کی طرف سے بے فکر ہو جایئے۔ اس کے گھر والو کو مجھ پر بہت اعتبار ہے۔ بابر کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے گھر والوں کے قریب رہ کر ان پر کڑی نظر رکھوں گا۔ آخر اس کا رابطہ ان لوگوں سے تو ضرور ہو گا۔ کوئی نہ کوئی طریقہ تو اس نے پیغام رسانی کا رکھا ہی ہو گا..... بنے بھائی بچ کر نہیں جا سکتا وہ.....اب سالے کو جہنم رسید کر کے ہی واپس لوٹوں گا..... آپ دیکھتے رہئے گا میں کرتا کیا ہوں۔''

اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

''ہاں! ہاں کیوں نہیں۔ ہمیں تم پر فخر ہے عارف اور ہم نے تمہارے لئے بہت جلدی بہت کچھ کر دیا ہے۔ کالیا کے بعد ''بابا صاحب'' کے حلقہ خاص میں اب تمہاری جگہ ہی بنے گی۔ تم اس سالے بابر کو ڈھونڈو کسی بھی طرح.....اور ہاں اس کے گھر والوں کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔

''بنے بھائی اب اور کچھ نہ کہئے گا۔ میرا خون بہت کھول رہا ہے کہیں میں اس کا بدلہ اس کے گھر والوں سے ہی نہ لے لوں۔''

''ارے گھبراؤ نہیں۔ اس کا موقعہ بھی تمہیں ضرور دیں گے۔ اب وہ دونوں جو باقی رہ گئی ہیں تمہاری ہماری ملکیت ہی تو ہیں۔''

بنے بھائی نے خباثت کا مظاہرہ ایک اور خونیں قہقہے سے کیا۔

اس درمیان اچانک ہی سامنے والے کمرے کا پردہ ہٹا اور تنظیم کی خواتین ونگ کی ایک فاحشہ ٹرالی گھسیٹتی اندر آئی۔

''آؤ.....مہارانی۔ آؤ بھئی بہت دیر لگا دی تم نے.....اکیلے آئی ہو کیا۔''

بنے بھائی نے اُسے آتے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بنے بھائی..... مجھے معلوم پڑ گیا تھا کہ عارف کی مہمان داری بھی کرنی ہے.....آج بڑی خاص میزبان آ رہی ہیں آپ کے تو بھاگ جاگ جائیں گے۔''

اتنا کہہ کر اس نے دونوں کے لئے شراب سے بھری ٹرالی سے پیگ تیار کرنے شروع کر دیئے۔

''اری کچھ بتاؤ گی بھی کون ہے وہ؟'' بنے بھائی کو پئے بغیر ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

''بنے بھائی تمہارا مہمان بڑا خاص آدمی لگتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بس تھوڑا سسپنس اور ہے جب تم میزبان کو دیکھو گے تو یقین کرو گے۔ میری بات تمہیں مذاق لگے گی۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی سامنے کا پردہ ہٹا اور جو شکل برآمد ہوئی اس پر نظر پڑتے ہی دونوں اس طرح اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے تھے جیسے صوفے میں لگے

سپرنگوں نے انہیں فضا میں اچھال دیا ہو۔

''آپ، دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔''

''ہاں میں! بھئی کیا میرا داخلہ یہاں بند ہے۔'' آنے والی نیم برہنہ عورت نے کہا۔

یہ رخسانہ تھی۔

''بابا صاحب'' کی سیکرٹری۔

عارف نے ابھی تک رخسانہ سے اپنی پہلی ملاقات نہیں بھلائی تھی۔ عمر تو اس کی چالیس کے نزدیک رہی ہوگی، لیکن وہ حلف اُٹھا کر کہہ سکتا تھا کہ رخسانہ کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں۔

''بڑی شہرت سُن رکھی تھی آپ کی۔ آپ نے تو دوبارہ ملاقات کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی۔ ہم نے کہا خود ہی چلے آئیں۔ آج جب صغریٰ نے بتایا کہ بنے بھائی کے ہاں آپ بھی ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں نے کہا مجھے بھی لے چلو۔ رات اکٹھے کاٹ لیں گے..... دن میں تو کام اتنا ہوتا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔''

اُس نے اپنے بدن کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر اُن کے سامنے والی کُرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

دونوں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔

رخسانہ عارف کے بالکل سامنے اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اُنہیں بے خود کیے دے رہی تھی۔ عارف میاں پلکیں جھپکے بغیر اس کے جسم پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

اس درمیان صغریٰ نے تین پیگ تیار کر کے تینوں کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے۔

اب وہ چوتھا پیگ اپنے لئے تیار کر رہی تھی جسے ہاتھ میں پکڑے وہ بنے بھائی کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

اس درمیان رخسانہ نے باری باری سب سے جام ٹکرایا اور عارف کے نام کا نعرہ بلند کر کے ایک گھونٹ حلق میں انڈیل کر اُن کے ساتھ چپک گئی۔

رخسانہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔

''بابا صاحب'' کی سیکرٹری تھی۔

تنظیم کے بڑے بڑے لوگ اس کی چند منٹ کی رفاقت کے لئے ترستے تھے۔ بابا صاحب نے آج تک اس کی کوئی بات نہیں موڑی تھی۔ جانے کتنوں کو اس نے پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا اور جانے کتنے وہ تھے جنہیں اُس کی معمولی سی شکایت پر بابا صاحب نے آسمان کی بلندیوں سے اس طرح زمین پر پٹخا تھا پھر ان کو زندگی بھر اپنے قدموں پر کھڑے ہونے نصیب نہ ہوا۔

خدا جانے اُسے عارف کی کون سی ادا بھا گئی تھی کہ یوں بھاگی چلی آئی تھی۔

●

''یہ آپ نے دہلی میں شادی کیا رچالی کہ ہمیں بھلا ہی دیا..... عارف میاں ہم بھی کام آنے والے لوگ ہیں..... کبھی آزما دیکھنا.....'' وہ عارف پر پھبتی جا رہی تھی۔

''میری کیا مجال رخسانہ صاحب! مجھے تو ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ واقعی آپ مجھ پر اتنی مہربانی فرما رہی ہیں۔'' عارف گھگھیایا۔

''ارے صاحب! دل آنے کی بات ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے دروازے پر بھی تانتا بندھا رہتا ہے۔ اُمیدواروں کا، لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اس دل کو آپ بھا گئے..... آپ کبھی الگ سے ملئے ناں..... کچھ مستقبل کا پروگرام بنائیں گے۔

اس نے عارف پر اپنا بوجھ لادتے ہوئے کہا۔

''زہے نصیب! زہے نصیب! جب آپ فرمائیں۔'' عارف بھی ذبح ہوئے جا رہا تھا۔

''آپ میرا پرائیویٹ نمبر رکھ لیں..... اور ہاں اس بات کا خیال رہے کہ یہ نمبر پرائیویٹ ہے صرف آپ کے لئے۔''

اُس نے عارف کو صوفے کے ساتھ دھری چھوٹی سی میز پر رکھے کاغذ پر قلم سے اپنا نمبر لکھ دیا جسے عارف نے اُسی لمحے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''میں خود کو کتنا خوش قسمت سمجھ رہا ہوں اس کا اندازہ شاید آپ کو نہ ہو سکے۔''

عارف نے اپنی بانہیں رخسانہ کے گلے میں حمائل کیں۔

''صاحب! کھانا تیار ہے۔'' بیرے نے اچانک مداخلت کی۔

''آیئے کچھ کھا لیجئے۔ پھر ساری رات باتیں ہی کرنی ہیں۔'' بنے بھائی نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

عارف نے اسی لمحے رخسانہ کے چہرے پر بڑے واضح ناگواری کے احساسات دیکھ لئے تھے۔ اس نے بنے بھائی کے لئے اپنے جذبات چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔

''جانے یہ بڈھا خود کو سمجھتا کیا ہے کم بخت۔'' اُٹھتے اُٹھتے اُس نے عارف میاں کے کان میں سرگوشی کی۔ ''معلوم ہوتا ہے اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔'' شاید رخسانہ کے دماغ کو شراب چڑھنے لگی تھی۔

''جانے دیجئے..... تھوک دیجئے غصے کو۔'' عارف نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں تو جانے دیا۔'' رخسانہ نے مسکراتے ہوئے عجیب سی حرکت کر کے عارف کے جسم میں سنسنی دوڑا دی۔

کھانے کی میز پر بیٹھے عارف میاں سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ ایک ہی گناہ میں برابر کے شریک ہیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے

ہیں۔صرف دکھاوے کے لئے کبھی کبھی ہنس کر بات کر لیتے ہیں۔دراصل ان سب کو مشترکہ مفادات نے ایک مرکز پر اکٹھے کر دیا تھا۔
عارف نے سوچا اگر کبھی ان کے مفادات بدل گئے تو یہ ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے۔شاید وہی مکافاتِ عمل ہوگا۔

✹

چاروں کھانے میں مصروف تھے جب کمرے کے کونے میں رکھے سُرخ رنگ کے فون کی گھنٹی بجی۔یہ شاید بنے بھائی کا خصوصی فون تھا جس کو وہ سنا کرتا تھا۔
شراب کے نشے میں دھت بنے بھائی نے فون اُٹھایا تو وہ پہلے کی طرح مستعد تھا۔دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اُس نے تو بنے بھائی کا نشہ ہرن کر دیا اور فون اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔
بمشکل خود کو بنے بھائی نے سنبھالتے ہوئے صوفے پر ڈھیر کیا تھا۔
عارف چوہدری جان تو گئے تھے کہ کیا خبر اُنہیں سنائی گئی ہے جس نے بنے بھائی کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے پھر بھی اُس نے بے چینی کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔
''خیریت ہے بنے بھائی.....کیا بات ہے۔کیا بات ہے آپ۔''
''کالیا سالا کتے کا بچہ بھاگ گیا.....ایمبولینس میں اس نے اپنی رسیاں کھولیں۔ایک نرس کو جان سے مار ڈالا اور دوسری قریب المرگ ہے۔'' بنے بھائی کے منہ سے غصے سے سوائے گالیوں اور مغلظات کے اور کوئی ڈھنگ کی بات نہیں نکل رہی تھی۔
''لیکن یہ ہوا کیسے۔اسے تو ہم نے یہاں سے باندھ کر بھیجا تھا۔'' عارف نے تشویش ظاہر کی۔
''سمجھ نہیں آتی سالا جادوگر تھا۔اتنی مضبوطی سے اُسے پہرے داروں نے باندھا تھا اور وہ.....''
''بنے بھائی۔'' اچانک عارف کو ایک اور خیال آ گیا۔
''کیا۔'' بنے بھائی نے اس طرح عارف کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ یہیں سے جادو کر کے کالیا کو دوبارہ باندھ کر لے آئے گا۔
''آپ کے پہرے دار.....میرا مطلب ہے۔''
عارف نے چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کئے تھے اور بات کو اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔
''نہیں.....یہ اُدھر کے لوگ ہیں،یہ غداری نہیں کر سکتے۔'' بنے بھائی نے فتویٰ سنا دیا۔
''بنے بھائی کیا بدمزگی پھیلا دی ہے تم نے.....ارے لعنت بھیجو اگر کالیا بھاگ گیا.....بھاگ کر کون سی ماں کے پاس جائے گا۔''بابا صاحب'' کے عقیدت مند اُسے جہاں دیکھیں گے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ہمارے تو رنگ میں بھنگ نہ ڈالو۔''
رخسانہ جو خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی تھی اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں دھرا کھانا مکمل کر رہی تھی اُسے غصہ آنے لگا تھا۔

''ہاں بنے بھائی آپ تو یوں گھبرا گئے جیسے یہ کوئی انہونی بات ہوگئی۔ارے ابھی چند روز پہلے ہی وہ سالا انٹیلی جنس والا افسر بھی تو آستانے سے بھاگ گیا تھا کیا کر لیا اس نے۔ ہیں ہیں.....'' دوسری فاحشہ کو خاصی چڑھ گئی تھی۔اس نے شیر گل کے فرار کی طرف اشارہ کیا۔

''ایسا ماضی میں نہیں ہوا کہ ایک مرتبہ ہماری گرفت میں آنے والا کوئی ہماری مرضی کے بغیر زندہ نکل گیا ہو.....یہی تو پریشان کن بات ہے۔'' بنے بھائی نے تشویش ظاہر کی۔

''بنے بھائی اگر اب تم نے اس موضوع پر بات کی تو میں عارف کے ساتھ یہاں سے چلی جاؤں گی۔سمجھے آپ۔''

رخسانہ نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

''ارے صاحب! آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں.....زبان کاٹ کر آپ کے سامنے رکھ دوں گا اگر دوبارہ میرے منہ سے یہ بات نکلی۔میری کیا مجال ہے کہ حضور کے سامنے ان کی مرضی کے خلاف بات کر سکوں، میں معافی چاہتا ہوں آپ کو پریشان کیا۔''

بنے بھائی نے کھانے کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

چاروں دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگئے۔بنے بھائی یوں تو یہاں ہونے والی فحش اور بے ہودہ گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔لیکن ان کا ذہن ابھی تک کالیا میں اُلجھا ہوا تھا۔بنے بھائی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کالیا نے آخر اتنی مضبوط گانٹھیں کس طرح کھول لی ہیں۔اس کے ساتھ گھر میں ہمیشہ ''را'' کے دو خاص آدمی اس کے پہرے داروں کی صورت میں رہا کرتے تھے اور ان دونوں سے غداری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''پھر آخر کس نے اس کی مدد کی۔''

یہ تھا وہ سوال جو بنے بھائی کو پریشان کیے دے رہا تھا۔

کہیں وہ آستین کا سانپ ان کے سامنے تو نہیں بیٹھا؟ بنے بھائی کا دھیان فوراً عارف کی طرف گیا تھا۔

لیکن.....!

اس وقت جس طرح ''باباصاحب'' کی سیکرٹری رخسانہ اس کی جوانی پر لٹو ہو رہی تھی اس کے بعد تو بنے بھائی کے لئے عارف پر شک کرنا گناہ کبیرہ کے مترادف تھا۔

پھر بھی اس نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کالیا نے کسی نرس کو ہی بہلا پھسلا کر معاملہ برابر کر دیا ہو۔

لیکن اس کے تو منہ پر ٹیپ لگی تھی۔وہ تو آواز نہیں نکال سکتا تھا۔اس بات کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بنے بھائی کو یاد آ گیا تھوڑی دیر کے لئے وہ غصے سے باہر آئے تھے جب کالیا نے انہیں گالیاں دی تھیں اور عارف میاں نے پہرے دار کو ٹیپ لانے کے بہانے

باہر بھیجا تھا۔

کہیں یہ اُس سے ملا ہوا تو نہیں تھا؟ لیکن ایسا تھا تو اُس نے کالیا کو پھنسایا ہی کیوں؟

اس طرح کے سوالات نے بنے بھائی کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ جتنا وہ اس گتھی کو سلجھاتے وہ مزید اُلجھتی چلی جاتی۔

بنے بھائی کے لئے اس وقت سوائے خاموشی سے کھانا کھاتے رہنے کے اور کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا۔ بہر حال انہوں نے عارف کو چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سوائے بنے بھائی کے سب نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا اور اس وقت وہ لوگ دوبارہ اس ڈرائنگ روم میں موجود تھے جہاں سے مے نوشی کرنے کے بعد وہ اندر گئے تھے۔

ان کی ہوس بڑھنے لگی تھی۔

●

شاید وہ شیطانی کھیل کھیلنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ جب اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ جھٹکے سے کھلا، اس کے ساتھ ہی بنے بھائی کا ایک پہرے دار اندر آ گرا۔ اُسے کسی نے دھکا دے کر اندر پھینکا تھا۔

چاروں کو صوفوں میں لگے سپرنگوں نے اوپر اُچھال دیا تھا اور وہ یوں کھڑے ہو گئے تھے جیسے اچانک زلزلہ آ گیا ہو۔

واقعی یہ زلزلہ تھا۔

ان کی توقع سے بھی بڑا طوفان۔

پہرے دار کے عقب سے ہاتھ میں کلاشنکوف پکڑے کالیا برآمد ہوا۔

''جس ملک سے اس کا تعلق ہے میں نے بھی اس کے باپوں سے تربیت حاصل کی ہے۔ شاید آج کے دن کے لئے ہی میں ''را'' کے ٹریننگ کیمپ میں گیا تھا۔''

کالیا نے خوف سے کپکپاتی ٹانگوں والے بنے بھائی سے کہا۔

''کالیا! کوئی بے وقوفی نہ کرنا..... میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں کہ ''باباصاحب'' تمہیں معاف کر دیں گے اور تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ بھی کریں گے۔'' رخسانہ نے جس کے حواس ابھی تک قائم تھے کہا۔

''خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا..... تمہارے ''باباصاحب'' کی..... اُس نے ''باباصاحب'' کو موٹی سی گالی دیتے ہوئے رخسانہ کو ڈانٹا..... ''ان موذیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا اور تم یہاں سے زندہ جاؤ گی تو ہی اپنے باباصاحب کو کچھ بتا سکو گی۔ اب تو صبح اس کتے کے پلے کو علم ہو گا کہ اس فرعون کے گھر میں کوئی موسیٰ آ گیا ہے جو اس کی سلطنت کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دے گا۔ حرام خورو! مجھے تو سمجھ ہی اب آئی ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا ظلم کیا۔ تم نے میرے ضمیر کا سودا اس دشمن سے

کیا جونسل در نسل میرے خون کا پیاسا رہا ہے..... تم غدار ہو..... غدارو! تم نے اس قوم کے خون کی قیمت وصول کی ہے۔ جس نے اس ملک کی بنیادیں اپنے خون سے استوار کی تھیں۔ تم دوبارہ ہمیں غلام بنانا چاہتے ہو۔ تم نے میرے جیسے نجانے کتنے نوجوانوں کو گمراہ کر کے ملک دشمنی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ تم وحشی درندے جینے کا حق نہیں رکھتے۔"

وہ جنونیوں کی طرح چلانے لگا۔

اچانک ہی اس کے ہاتھ میں پکڑی گن نے شعلہ اُگلا اور زمین پر گرے "را" کے ایجنٹ کا بھیجہ قالین پر بکھر گیا۔ اس نے اپنی دانست میں بڑی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کالیا کی ٹانگ کھینچ کر اُسے گرانا چاہا تھا۔

چاروں سہم کر رہ گئے۔

"کالیا..... تم پاگل ہو گئے ہو" بنے بھائی نے حوصلہ کیا۔

"ہاں اور اب تم اس پاگل پن کا نشانہ بننے والے ہو۔"

کالیا نے جنونیوں کی طرح قہقہہ لگایا اور تین گولیاں اس کے سینے میں اُتار دیں۔ بنے بھائی کا مردہ جسم قالین پر چند لمحے کے لئے تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس صورتِ حال نے اُن پر خوف طاری کر دیا تھا۔ خوفزدہ فاحشہ صغریٰ کے حلق سے اچانک ہی چیخ نکلی اور وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی لیکن ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ کالیا کی گن کے شعلے اُسے بھی چاٹ گئے۔

موت کے خوف نے رخسانہ کے چہرے کا رنگ زرد کر دیا تھا لیکن عارف میاں کو اُمید تھی کہ کالیا انہیں کچھ نہیں کہے گا کیونکہ اس نے بھی کالیا پر احسان کیا تھا۔

کالیا نے اچانک ہی اداکاری کی تھی جیسے اُس کا پاؤں اچانک بنے بھائی کی لاش سے ٹکرایا ہے۔

یہ عارف کے لئے بھاگ جانے کا سگنل تھا۔

عارف نے موت کے خوف سے نیم مردہ رخسانہ کے بازو کو جھٹکا دے کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور کمرے کے دوسرے دروازے سے بھاگتا چلا گیا۔ رخسانہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔

کالیا نے ڈرامے میں شاید حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ان کے تعاقب میں تین چار گولیاں چلا دی تھیں۔

عارف جیسے تیسے اُسے بھگاتے ہوئے اپنی کار تک لے آئے تھے۔ کار کے کھلے دروازے سے اُس نے رخسانہ کو پچھلی سیٹ پر پھینکا اور بجلی کی سی پھرتی سے کار سٹارٹ کر دی۔

گاڑی روک کر اُس نے بنے بھائی کے بنگلے کا مین گیٹ کھولا تھا۔ جب وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو کالیا نے ان کے عقب میں پھر ایک فائر کر دیا تھا۔ گولی

شاید گاڑی کی ڈگی میں لگی تھی کیونکہ رخسانہ اس طرح زور سے چیخی تھی جیسے گولی اسے لگی ہو۔

عارف نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گاڑی اڑتی چلی گئی۔ رات کا اندھیرا خوف کے زہریلے سانپ کی طرح سڑک پر سرسرا رہا تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔'' اُس نے گردن موڑ کر رخسانہ سے پوچھا۔

''ہاں..... گولی ڈگی میں لگی ہے۔'' رخسانہ ابھی تک اتنی خوفزدہ تھی کہ اس کے منہ سے ڈھنگ سے کوئی بات نہیں نکل پا رہی تھی۔

عارف نے بنے بھائی کی موت پر دل ہی دل میں اب تک نجانے کتنی مرتبہ اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''میرے گھر کی طرف چلو۔'' رخسانہ نے اسے ہدایت دی اور اس نے گاڑی کو دوسری سڑک پر گھما دیا۔

●●●

باغی گروپ

بابا صاحب کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے سامنے بیٹھے دونوں گدھوں کی بوٹیاں نوچ کر کھا جائے۔ اُسے بنے بھائی کی خبر اس حادثے سے بمشکل چند منٹ بعد ہی مل گئی تھی جب تحریک کے ایک ذمے دار نے کسی اہم کام سے بنے بھائی کے ہاں فون کیا اور اسے متعدد مرتبہ فون کرنے پر بھی کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

اپنے شکوک کی تصدیق کے لئے جب وہ ذمہ دار تحریک کے غنڈوں کی ایک کھیپ لے کر رات دیر گئے بنے بھائی کی رہائش گاہ پر پہنچا تو تین لاشیں منہ کھولے ان کی منتظر تھیں۔

بنے بھائی کو بھی کوئی قتل کر سکتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہاں موجود غنڈوں میں سے کسی کو نہ مل سکا۔ انہیں حقیقت حال کا علم نہیں تھا۔ حسب روایت اُن کے گندے دماغوں نے اس قتل کی ذمہ داری بھی ''ایجنسیوں'' پر ڈال دی۔

اس ذمہ دار نے بابا صاحب کو تمام احتیاطیں بالائے رکھ کر آدھی رات ہی کو یہ اہم خبر سُنا دی۔ حالانکہ ان لوگوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ''بابا صاحب'' کو کبھی رات گیارہ بجے کے بعد سے صبح تک ڈسٹرب نہ کریں۔ کم از کوئی افسوسناک خبر اُسے نہ سنائی جائے۔

لیکن.....!

معاملات کی سنگینی نے اس ذمہ دار کو مجبور کر دیا تھا۔

بابا صاحب نے خبر سنتے ہی مغلظات بکنی شروع کر دی تھیں۔ اُن کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ دماغ کی رگیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ ذاکر کے بعد بنے بھائی کا قتل اور وہ بھی کالیا کے ہاتھوں۔

بابا صاحب کا دل اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو واقعات اُن تک پہنچے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔

ابھی تک اُن کو جو اطلاعات پہنچائی گئی تھیں اس کا ذریعہ ایمبولینس کا ڈرائیور اور کالیا کے ہاتھوں بچ جانے والی دوسری نرس تھی جس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اس کے ذریعے لسانی تحریک کے ذمہ داروں کو علم ہوا کہ کالیا انہیں مار کر بھاگ گیا تھا اور انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ بنے بھائی کے ہاں ہونے والے قتل کالیا ہی نے کئے ہیں۔

''رخسانہ کو بلاؤ.....لیکن خیال رکھنا اُسے نیند سے بیدار نہ کرنا پڑے۔'' بابا صاحب نے اچانک ہی حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے اُن کا ایک غلام فون پر رخسانہ سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔

اس نرس نے بابا صاحب کو اطلاع دی تھی کہ اُس نے رخسانہ اور صغریٰ کو بنے بھائی کے ہاں عارف کے ساتھ دیکھا تھا۔

صغریٰ کی لاش وہاں موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ رخسانہ اور عارف زندہ ہیں۔

عین ممکن ہے انہیں اغواء کر لیا گیا ہو۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی بابا صاحب نے اپنی چہیتی سیکرٹری رخسانہ سے رابطے کا حکم دیا تھا۔

صرف رخسانہ ہی ایسی تھی جس کے متعلق بابا صاحب کے نزدیکی ساتھی برملا یہ بات کہہ سکتے تھے کہ وہ بابا صاحب کی کمزوری ہے۔

اُن کے آستانے پر پہنچنے والے عمال حکومت کے دلوں کی دھڑکنیں بابا صاحب کے موڈ کے اتار چڑھاؤ کی محتاج رہا کرتی تھیں.....اگر دورانِ گفتگو بابا صاحب کو کسی بات پر غصہ آتا تو مخاطب کو اپنی دھڑکنیں بے قابو ہوتی محسوس ہوا کرتی تھیں۔

بابا صاحب کے لئے کسی بھی بڑے یا چھوٹے حکمران کو ڈانٹ پلا دینا معمولی بات تھی۔ لسانی تحریک کے بڑے بڑے لیڈروں کو وہ گالیاں دے کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

لیکن.....!

اس رخسانہ میں نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بابا صاحب کے چہرے کی سختی نرمی میں بدلنے لگتی تھی۔

اُن کی اس کمزوری سے اس شہر کے ارباب بست وکشاد آگاہ تھے اور خوب فائدہ اُٹھاتے تھے۔

ان لوگوں نے بابا صاحب تک پہنچنے کے لئے رخسانہ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ بابا صاحب تک اپنی کوئی بھی التجا براہِ راست پہنچانا کارِ دارد تھا.....اس کے لئے وہ لوگ رخسانہ کو استعمال کرتے تھے۔

لیکن.....!

رخسانہ تک پہنچنے کے لئے انہیں راستے میں آنے والی کئی رکاوٹوں کو اپنے دھن کی کشتی میں سوار ہو کر عبور کرنا پڑتا تھا۔

رخسانہ کو بھی ان لوگوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ وہ کام کی نوعیت کے حساب سے اپنا حصہ ایڈوانس وصول کر لیا کرتی تھی۔ اس شہر میں وہ کروڑوں کی جائیداد کی مالک تھی۔ اس نے کہاں کہاں، کس کس مد میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے اس کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

لیکن.....!

ایک بات سب بخوبی جانتے تھے کہ وہ کروڑوں میں کھیلتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو آج تک اس کے متعلق کوئی بات اپنے لبوں تک لانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

یہ لوگ رخسانہ کے اندر چھپی اس درندہ صفت عورت سے بخوبی آگاہ تھے۔ جو معمولی سی ناراضی پر بڑی بھیانک سزا دلا سکتی تھی۔ اُس نے جب بھی لسانی تحریک کے کسی بڑے کی آنکھوں یا رویے میں اپنے متعلق غصہ یا نفرت محسوس کی اُسے بابا صاحب کے ذریعے ایسا سبق سکھایا کہ دوسروں کے لئے عبرت کا نمونہ بنا کر رکھ دیا۔

بابا صاحب جیسے درندہ صفت انسان کو مطمئن رکھنے والی عورت کتنی اذیت پسند ہو سکتی تھی۔

اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا تھا۔

بابا صاحب کے خصوصی عملے کے لوگوں میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اپنی مرضی سے تحریک کے کسی بھی بڑے سے ذاتی سطح پر روابط استوار کرے۔ کیونکہ بابا صاحب کے نزدیک ایسا کرنا بغاوت کے مترادف تھا۔

لیکن.....!

یہ رخسانہ تھی جس کے بڑے بڑوں سے ذاتی تعلقات تھے۔ ان میں صرف لسانی تحریک ہی کے نہیں بلکہ حکومت کے بھی بڑے بڑے عہدیدار شامل تھے۔ کسی بھی سرکاری دفتر میں رخسانہ بی بی کا فون جانے کا مطلب تھا کہ یہ کام بہر حال ہونا چاہئے۔ ورنہ بابا صاحب کی ناراضی مول لینا پڑے گی۔

●

رخسانہ گاڑی کو اپنی رہائش گاہ پر لے آئی تھی۔

اس کی حواس باختہ شکل پر نظر پڑتے ہی اُس کے سمندر کنارے موجود شاندار بنگلے کے مستعد محافظوں نے بنگلے کا آہنی گیٹ کھولا اور اس کی کار کے گرد گھیرا ڈال کر مؤدب کھڑے ہو گئے۔

''تم لوگ جاؤ..... صبح تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دینا۔'' اُس نے پہرے داروں کو حکم دیا۔

اپنے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر وہ سب لوگ جس مستعدی سے یہاں آئے تھے۔ اُس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔

عارف نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا ہوا تھا اور اس طرح اپنے کندھے پر رخسانہ کا آدھا بوجھ برداشت کرتے ہوئے اس کی شاندار خواب گاہ تک چلے آئے تھے۔

عارف نے اس سے پہلے اس بنگلے کو دُور سے ہی دیکھا تھا۔ تحریک کے باقی لوگوں کی طرح اُسے صرف اس بات کا علم تھا کہ یہ بابا صاحب کی سیکرٹری رخسانہ کا بنگلہ

ہے۔اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس بات کا تو اُسے بھی اندازہ تھا کہ اندر سے یہ بنگلہ کتنا شاندار ہوگا لیکن اپنی آنکھوں سے اندر کا احوال دیکھ کر اس کی حیرت گم ہو رہی تھی۔اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ملک میں کوئی عورت اتنے قیمتی اور عظیم الشان ساز و سامان کے ساتھ بھی زندگی بسر کر رہی ہے۔

بابا صاحب کا رہن سہن بظاہر جتنا سادا تھا رخسانہ کا اس کے برعکس اتنا ہی شاہانہ۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے سرہانے رکھے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری سے رابطہ کیا تھا۔

''میں جب تک خود بیدار نہ ہو جاؤں کوئی کال نہ ملانا۔'' مختصر سا پیغام دے کر اُس نے فون رکھا اور اپنے شاندار پلنگ پر بے دم سی ہو کر لیٹ گئی۔

''بیٹھو!'' اُس نے عارف کو ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

تین چار گہرے سانس لینے کے بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اُف میرے خدایا۔میرا تو دل ابھی تک ڈوبا جاتا ہے۔خدا کی پناہ۔مجھے تو اپنے زندہ رہنے پر یقین نہیں آ رہا۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔

''آپ آرام کیجئے۔میں آپ کے لئے کوئی جوس وغیرہ منگواتا ہوں۔کوئی ٹرنکولائزر لے لیجئے۔آپ کے لئے آرام کرنا ضروری ہے۔'' عارف اس پر بچھے جا رہا تھا۔

اُسے یقین تھا کہ لسانی تحریک کی طرف سے اس قتل عام کی تفتیش پر مامور کسی بھی کمیٹی کے عتاب سے اُسے صرف رخسانہ بچا سکتی ہے۔عین ممکن تھا کہ وہ انکوائری کمیٹی میں کسی بھی گھاگ ممبر کے نزدیک اپنی کسی غیر معمولی حرکت کی بناء پر مشتبہ ٹھہر جاتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ اُسے محض اس لئے زندہ نہ رہنے دیتے کہ وہ بہر حال ایک بڑے حادثے کا عینی شاہد ہے۔

عارف نے ''آستانہ'' میں لمبا عرصہ گزارا تھا۔وہ جانتا تھا کہ کالیا کے ہاتھوں زندہ بچ جانے والی زندہ درگور نرس کی سانسوں کی ڈور تب تک بندھی ہے جب تک اس معاملے کی تحقیق میں اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے جس کے فوراً بعد تحریک کی بقاء کے لئے اس کی قربانی دے دی جائے گی۔

یہ سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جا سکتا تھا۔

ان جرائم پیشہ درندوں کے درمیان زندگی کی ضمانت کیا تھی..... کسی بھی لمحے اُسے ''رازداری'' قائم رکھنے کے لئے کتے کی موت مارا جا سکتا تھا۔

آئے روز اس شہر کے گلی کوچوں میں لسانی تحریک کے وفاداروں کی جو لاشیں برآمد ہوتی تھیں ان میں بعض ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں بابا صاحب کے حکم پر ہی ایک ''بڑے جُرم'' میں حصہ لینا پڑتا تھا اور بابا صاحب کے حکم پر ہی پھر انہیں رازداری کے تحفظ کے لئے قتل بھی ہونا پڑتا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو..... اچانک ہی رخسانہ نے اُسے چونکا دیا۔

''جی کچھ نہیں.....اس کو کہنے کے لئے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

رخسانہ نے چند منٹ بعد ہی خود کو حیرت انگیز حد تک نارمل کر لیا تھا۔

''میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو.....لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میرے جیتے جی کسی کو تمہاری طرف میلی نظروں سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی..... عارف تم نے میری جان بچائی ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو وہ پاگل کتا مجھے بھی مار دیتا۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔ تم میرے محسن ہو۔ شاید قسمت نے مجھے اسی لئے تم تک پہنچایا کہ تم میری زندگی بچالو..... یہ ٹھیک ہے کہ میں کالیا کو زمین کی ساتویں تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی اور اسے ایسی موت نصیب ہوگی جس کا تصور بھی شاید اس شہر میں کسی نے نہ کیا ہوگا، لیکن اُس لمحے وہ میری جان لے سکتا تھا۔ اس بات سے میں بخوبی آگاہ ہوں.....تم اطمینان سے لیٹ جاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے عارف میاں کو اپنے پلنگ پر اپنے قریب ہی بازو کو ہلکا سا کھینچ کر لٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد عارف خود ابنارمل ہونے لگا۔ کچھ دیر پہلے جو گھبراہٹ رخسانہ پر طاری تھی اب اُن کے ذہن پر سوار ہونے لگی تھی۔ انہوں نے زندگی میں کبھی سوچا نہیں تھا کہ بابا صاحب کی سیکرٹری اُن پر اتنی مہربانی ہو جائے گی کہ اپنا آپ ہی نچھاور کرنے پر تُل جائے۔

رات دیر گئے تک رخسانہ عارف کے احسان کا بدلہ چکاتی رہی۔ صبح عارف میاں کی آنکھ اس کے بستر پر کھلی تھی۔

رخسانہ وہاں موجود نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹی تو خاصی نکھری نکھری اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ رات والی پریشانی کا دُور تک نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے عارف میاں کی رہنمائی بھی خود ہی باتھ روم تک کی اور اس کی واپسی پر اس کا استقبال ناشتے کی میز پر کیا۔

''بابا صاحب کا فون آیا تھا۔'' اُس نے ٹوسٹ کو مکھن لگا کر عارف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خیریت!'' عارف کا دل دھک سے رہ گیا۔

''ہاں میں نے انہیں تمہاری بہادری اور تحریک کے لئے جانثاری سے آگاہ کر دیا ہے۔ بہت خوش ہو رہے تھے بابا صاحب.....ہم ابھی تھوڑی دیر بعد اُن ہی سے ملنے جا رہے ہیں.....تحریک کا کوئی بھی ذمہ دار اگر تم سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرے تو اُسے سختی سے ڈانٹ دینا۔''

رخسانہ نے اس کی تسلی کرواتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔'' عارف رخسانہ پر بچھا جا رہا تھا۔

''اس منہ سے۔''

رخسانہ نے کہتے ہوئے ایک عجیب سی حرکت کر دی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ''بابا صاحب'' کے آستانے پر موجود تھے۔

رخسانہ بی بی کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہاں موجود بابا صاحب کے ذاتی عملے کے لوگوں کی نظریں جھکتی چلی جاتی تھیں۔ وہ رخسانہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے عارف میاں کو بھی اتنا ہی احترام دے رہے تھے۔

بابا صاحب کے جس کمرے کی طرف رخسانہ اُسے لئے جا رہی تھی وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ بابا صاحب کی خواب گاہ میں کسی کو قدم رکھنے کی مجال نہیں تھی۔ جب کہ رخسانہ کے تعاقب میں عارف میاں منہ اُٹھائے چلتے چلے جا رہے تھے۔

بابا صاحب اکثر فراش رہتے تھے۔

یہ ان کی خاص ادا تھی۔

یہ ایک سگنل ہوتا تھا حکمرانوں کے لئے کہ بابا صاحب کو اُن کی خوشنودی مقصود ہے اور وہ کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ اُن کا طبی معائنہ کرنے کے لئے بھی خصوصی میڈیکل ٹیم مقرر تھی جس کے تمام ارکان لسانی تنظیم کے جانثار تھے۔

بابا صاحب کی خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی ایک لمحے کے لئے عارف میاں کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑنے کا احساس ہوا۔

بابا صاحب ایک آرام دہ تخت پوش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔ تنظیم کی ایک رضا کارہ بڑے خشوع و خضوع سے اُن کے پاؤں دبا رہی تھی جبکہ دوسری اُن کے چرنوں میں پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔

''چلو تم لوگ۔'' انہوں نے رخسانہ کی صورت دکھائی دیتے ہی رضا کاراؤں سے کہا۔

دونوں نے قریباً جھکتے ہوئے رخسانہ کو آداب کہا اور اُلٹے قدموں کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''آؤ عارف میاں آؤ..... بڑی تعریف کی ہے تمہاری رخسانہ نے بھئی بڑے زبردست آدمی معلوم ہوتے ہو۔''

بابا صاحب نے اتنی بے تکلفی سے عارف میاں کو مخاطب کیا تھا کہ اُسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''بابا صاحب اگر کل یہ نوجوان اپنی جان پر کھیل کر میری جان نہ بچاتا تو۔''

''ارے چھوڑو رخسانہ جی! ہمارے جیتے جی کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔'' بابا صاحب نے اس کی بات راستے ہی میں کاٹ دی۔

''تم ذرا چائے وغیرہ کا بندوبست کرو.....'' انہوں نے رخسانہ کو حکم دیا۔

رخسانہ نے تسلی دینے والی نظروں سے عارف کی طرف دیکھا اور باہر چلی گئی۔

''کیا ہو گیا تھا اس سالے کالیا کو..... کتے کے پلے کی یہ مجال۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ ارے بنے بھائی کو مار ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس شہر میں قیامت کیوں نہیں آ جاتی۔ پہلے ذاکر مارا گیا اور اب بنے بھائی..... اُف میرے خدایا۔

بابا صاحب نے عالم وحشت میں دو مرتبہ اپنی عینک اتار کر دوبارہ ناک پر جمائی تھی۔ اس درمیان اُن کے چہرے پر بنتے بگڑتے تاثرات اس بات کی نشاندہی کو کافی تھے کہ وہ غصے سے باؤلے ہو رہے ہیں..... انہیں اپنے ساتھیوں کی موت کا غم نہیں تھا اس بات پر اُن کا خون کھول رہا تھا کہ اس ملک میں کون شخص ہے جس نے اُن کے دو جانثاروں کو جان سے مار دینے کی ہمت کی۔

''بابا صاحب! جہاں تک مجھے شک ہے ایجنسی کے لوگ ہماری صفوں میں خاصے اندر تک گھس آئے ہیں۔ یہ سب اُن ہی کا کیا دھرا ہے۔ عارف میاں نے اپنے خشک گلے میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''ارے کھال کھینچ لوں گا سالوں کی۔ اُن کے جسموں میں اتنے سوراخ کرواؤں گا کہ جسموں کی شناخت ممکن نہ رہے..... ڈھونڈو..... ڈھونڈو ان غداروں کو اور ایک ایک کر کے مار ڈالو۔ جاؤ، تمہیں کھلی چھٹی دے رہا ہوں۔ کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں۔ اُن کے جسموں سے پاؤ پاؤ گوشت اُتار کر تڑپا تڑپا کر مار ڈالو۔ کیا ہوا کیا تھا..... کیسے ہوا؟ مجھے بتاؤ..... بتاؤ مجھے..... میں سوچتا ہوں کچھ، مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ باقی سالے سارے عیاشیوں میں پڑ گئے ہیں۔'' بابا صاحب کی وحشت دیدنی تھی۔

کبھی وہ اپنے سر کے بالوں میں زور زور سے انگلیاں چلاتے۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کو جھٹکا دیتے اور کبھی عینک اُتار کر اچانک اپنے ہاتھ میں پکڑتے پھر ناک پر جما لیتے۔

جاری ہے...

عارف میاں نے انہیں تفصیلاً ساری واردات سنانی شروع کی۔ اس نے کمال ہوشیاری سے بابا صاحب کو بھی باور کروادیا کہ کالیا ہی اصل غدار تھا جس نے بابر کو بروقت خبردار کر کے دوڑایا اور جب اس کی غداری کا بھید کھل گیا تو اُس نے بنے بھائی کو ہی قتل کر ڈالا۔ اُس نے جان بوجھ کر بابا صاحب کے ذہن میں ایک مستقل شک پیدا کر دیا تھا کہ اُن کے نزدیکی لوگوں میں ضرور ایجنسی کے لوگ موجود ہیں۔

''مجھے پہلے ہی اس بات کا شک تھا..... خیر دیکھ لوں گا..... ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

بابا صاحب کی لاف گزاف جاری تھی جب رخسانہ چائے کی ٹرالی لے کر آ گئی۔

اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی حیرت انگیز طور پر بابا صاحب کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔

''اسے مرکز میں لے آؤ..... کام کا لڑکا ہے۔'' انہوں نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''جو حکم بابا صاحب۔''

رخسانہ نے کہتے ہوئے چائے بنا کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

چائے نوشی کے دوران بابا صاحب بڑی مکاری سے عارف میاں کو ٹٹولتے رہے۔

وہ اس سے مختلف نوعیت کے سوال پوچھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک خصوصی میٹنگ میں اب سے ایک گھنٹہ بعد شرکت کا حکم دے کر اُسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔

رخسانہ اُسے اپنے کمرے میں بٹھا کر دوبارہ بابا صاحب کے پاس آ گئی تھی۔ جنہوں نے فوراً پرویز بھائی سے رابطے کو کہا تھا۔

چند منٹ میں لسانی تنظیم کے پانچ سرکردہ بھیڑیوں تک بابا صاحب کا یہ حکم پہنچ چکا تھا کہ انہیں فوراً میٹنگ کے لئے ''آستانہ'' پہنچنا ہے۔

اس اہم میٹنگ میں ان پانچوں کے علاوہ بابا صاحب اور عارف بھی موجود تھا۔ صبح کے اخباروں میں بنے بھائی کے قتل کی خبر ان لوگوں نے پڑھ لی تھی اور اس اہم میٹنگ کے بعد ہی انہیں اگلا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

بابا صاحب کے حکم پر ایک مرتبہ پھر عارف نے اپنا گھسا پٹا بیان سب کے سامنے دہرایا جس میں اس نے حسب سابق کالیا کو ایجنسی کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے اس پر غداری کا الزام لگایا اور کہا کہ بابر کو فرار کروانے میں اُسی کا ہاتھ ہے۔ بنے بھائی کو اس پر شک ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مزید تفتیش کے لئے اُسے ''آستانے'' بھیجنا چاہا تھا جبکہ کالیا راستے میں فرار ہو گیا اور اُن کی موجودگی ہی میں واپس آ کر اُس نے چار بندے بھی مار ڈالے۔

بنے بھائی نے آخر کالیا پر ہی کیوں شک کیا تم پر.....''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تصدیق کر چکے ہیں۔ پرویز نے کچھ کہنا چاہا تو بابا صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روک دیا۔

''مجھ پر بھی شک کیا تھا انہوں نے..... لیکن ایک مرحلے پر طیش کھا کر کالیا نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ اس پر شک بجا ہے۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دونوں گارڈز کی مدد سے ہم نے اس پر قابو پا لیا۔''

بابا صاحب کے منع کرنے کے باوجود عارف میاں نے ایک ایسی کہانی سنا دی جس کا عینی شاہد اُن کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

اس کے بعد کسی کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ سب کو ''بابا صاحب'' کی ناراضگی کی فکر دامن گیر ہونے لگی تھی۔

''بنے بھائی اور باقی تینوں کے قتل کا الزام ایجنسیوں پر لگاؤ اور مخالف پارٹی کی ملی بھگت قرار دے دو..... کالیا کا نام کسی کی زبان پر نہیں آنا چاہئے..... تم پانچوں اُسے 48 گھنٹے کے اندر اندر زندہ یا مردہ میرے پاس پیش کرو گے..... اور تم۔''

بابا صاحب نے اچانک ہی حاکمانہ لہجے میں اُنہیں مخاطب کیا تھا اور اب انہوں نے ہاتھ کی انگلی سے عارف کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اگر میں بھول نہیں رہا تو اس کی دو بہنیں جوان ہیں..... ہیں ناں..... تم ان دونوں کو آج رات ہی ''آستانے'' پر پہنچا دو۔ اس کی ماں کو مار ڈالنا۔ بوڑھیا بیچاری اپنی جوان بیٹیوں کے اغواء اور بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کرنے سے بچ جائے گی..... میں تنظیم کے جانثاروں کے والدین کی بہت عزت کرتا ہوں اور ہاں اُن دونوں کو میرے آنے تک چھونا بھی نہیں..... پہلے میں پھر کوئی اور..... انہیں اتنی عزت تو ملنی چاہئے آخر وہ کالیا کی بہنیں ہیں۔''

اپنی بات کے خاتمے پر بابا صاحب نے زوردار قہقہہ لگایا جس میں وہاں موجود درندوں نے اُن کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ ان کے چہروں پر برستی لعنت دوچند ہو گئی تھی۔ اپنے ہی ایک سابقہ ساتھی کی نوجوان بہنوں کی آبروریزی کے تصور نے اُن کے شیطانی ذہنوں میں ہلچل مچا دی تھی اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح جلد از جلد اپنے خون کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔

●

اگلے ہی لمحے بابا صاحب اپنے کمرے میں جمع ہونے والے اخبار نویسوں سے مخاطب تھے۔ انہوں نے بنے بھائی کے قتل کو لسانی تنظیم کے لئے کبھی نہ پورا ہونے والا نقصان قرار دیا اور اس قتل کا الزام ایجنسیوں پر لگاتے ہوئے کہا کہ ایجنسی کے لوگوں کی آشیر باد سے مخالف لسانی تنظیم نے یہ گھناؤنا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مخالف لسانی تنظیم کے چار سرکردہ لوگوں کے نام لیتے ہوئے براہِ راست ان کو اس بہیمانہ واردات کا مرتکب قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے نہ صرف بنے بھائی اور تین دوسرے لوگوں کو اُن کی رہائش گاہ پر قتل کیا بلکہ تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایک ایمبولینس پر حملہ کر کے ایک نرس کو آبروریزی کرنے کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور دوسری تنظیم کے ہسپتال میں قریب المرگ ہے۔

بابا صاحب نے اخبار نویسوں کو ان دونوں رضا کاراؤں پر ہونے والے گھناؤنے ظلم کی واردات رو رو کر سنائی۔ ان کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا اور وہ بار بار اپنی عینک

اُتار اُتار کر آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کرتے تھے۔

بابا صاحب نے مخالف تنظیم کی اس غیر انسانی حرکت کی زبردست مذمت کرتے ہوئے ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے ایمبولینس روک کر دونوں نرسوں کو اغواء کیا اور ان کی اجتماعی آبروریزی کرنے کے بعد اُن میں سے ایک کو مار ڈالا، دوسری کی حالت بھی خطرناک ہے۔

ابھی بابا صاحب کی کانفرنس جاری تھی جب اُن کے ایک خادم نے ایک ٹیلیفون ان تک پہنچایا۔

بابا صاحب نے فون پر ابھی کچھ سنا ہی تھا کہ ریسیور اُن کے ہاتھ سے گر پڑا۔

اُن کے خادمین دیوانہ وار بابا صاحب کی طرف لپکے۔ شاید انہوں نے کوئی انتہائی افسوسناک خبر سُن لی تھی۔

بابا صاحب کمال کے اداکار تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ انہوں نے بچوں کی طرح زاروقطار رونا شروع کر دیا۔

''حضرات! ہمیں افسوس ہے کہ بابا صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ دراصل ابھی ابھی ہمیں خبر ملی ہے کہ اس حادثے کی دوسری شکار نرس اور ہماری دیرینہ ساتھی جس نے تنظیم کے لئے عظیم الشان قربانیاں دی ہیں انتقال فرما گئیں۔ کل سے ہمارے ڈاکٹر مرحومہ کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن اس حادثے سے ان کے دماغ کو زبردست صدمہ پہنچا تھا..... جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔''

بات کرنے والے بھیڑیئے کی آواز بھرا گئی۔

یہ مقامی ایم پی اے اور تنظیم کے غنڈوں کا چیف تھا۔

حضرات ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں بابا صاحب کی حالت صدمے کی وجہ سے سنبھل نہیں رہی اس لئے وہ مزید بات چیت نہیں کر سکیں گے۔ میں حکومت کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر 48 گھنٹے کے اندر اُس نے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا تو ہم راست اقدام کریں گے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ حکومت اپنی ایجنسیوں کو لگام دے ورنہ ہمارے کارکن خود اُن سے نمٹ لیں گے۔ ہمارے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ اپنے کارکنوں کے جذبات پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ذاکر بھائی کی موت نے ہی اُن کے دل چھلنی کئے ہوئے تھے کہ اب ظالموں نے بنے بھائی کو مار ڈالا..... ہم پر زبردست دباؤ ہے لیکن میں اپنے دُکھی دل بھائی بہنوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ بابا صاحب کے حکم کے مطابق کوئی انتقامی کارروائی نہیں کریں گے۔ براہِ کرم پُرامن رہئے۔ ہمیں آپ کے جذبات کا احساس ہے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر حکومت نے ہمارے دیئے ہوئے وقت کے اندر قاتلوں کو گرفتار نہ کیا تو ہم خود حکومت سے نمٹ لیں گے۔''

یہ لسانی تنظیم کا نام نہاد چیئرمین علیم شارق تھا۔

اس نے اخبار نویسوں کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا اور کانفرنس ختم کر دی۔

●

اشفاق بھائی کے فون کی گھنٹی بجی اور بجتے ہی چلی گئی۔

اس نے حیرانگی سے فون کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس فون پر آخر کس نے کال کیا ہے۔ کیونکہ اس فون کا نمبر اس کے چند ساتھیوں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا اور اُن میں سے کسی کو کم از کم اس وقت فون کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

''ذرا دیکھنا کون ہے۔'' انہوں نے اپنی ساتھی عظمت سے کہا۔

''ہیلو!'' عظمت نے آواز بدل کر ہیلو کہا تھا۔

''آپ جو کوئی بھی ہوں، میری ایک درخواست سن لیجئے۔'' دوسری طرف سے کوئی بہت جلدی میں بات کر رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' عظمت نے سختی سے پوچھا۔

''خدا کے لئے میری بات سنئے۔ تعارف ہوتا رہے گا۔ کالیا یا تو آپ تک پہنچ چکا ہے یا جلدی پہنچ جائے گا..... مستقبل میں وہ آپ کا بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔ اس وقت جیسے بھی ممکن ہو اُس کی والدہ کو کہہ دیجئے کہ فوراً کہیں روپوش ہو جائیں۔ فوراً۔ شام کے بعد کسی بھی لمحے اُن پر قیامت ٹوٹ سکتی ہے۔''

دوسری طرف سے بات کرنے والا بہت جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔

''تم کون ہو..... اور کیا بات کر رہے ہو۔ کون سا کالیا تم نے کس نمبر پر فون کیا۔''

عظمت نے فون کرنے والے سے تین چار سوال ایک ساتھ پوچھ کر اُس سے لمبی بات کرنے کی چال چلی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو پہچان لے۔

''میرا حوالہ بابر کا دوست ہے..... کالیا سے کہنا جس نے تمہیں رہائی دلائی اس نے فون کیا تھا۔ خدا حافظ۔''

دوسری طرف سے بات کرنے والے عارف نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جب سے ''باباصاحب'' نے اُسے کالیا کی بہنوں کے اغواء کا حکم دیا تھا وہ بیقراری سے اس لمحے کا منتظر تھا جب اُسے فون کرنے کا موقع ملے اور وہ کالیا کے اس احسان کا بدلہ اُتار سکے جو اس نے دونوں کی جان بخشی کر کے اس پر چڑھایا تھا۔

یہ فون نمبر اُسے بابر نے دیا تھا۔

بابر کے روابط لسانی تنظیم کے باغی گروپ سے تھے جس کی قیادت اشفاق بھائی کر رہا تھا اور یہ لوگ ''دستوری گروپ'' کے نام سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا کر بیٹھ گئے تھے۔

یہ لوگ ابھی اس قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اپنے ہی شہر میں آزادی سے گھوم پھر سکیں۔ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے نوجوانوں کو دشمن ملک کا آلۂ کار

بنا کر اس کے کیمپوں میں تخریب کاری کی تربیت دینے کی مخالفت کی تھی۔

انہوں نے بابا صاحب کو باور کرانا چاہا تھا کہ جن لوگوں کی قیادت کے وہ دعویدار ہیں وہ تو اس ملک کے قیام کے لئے اپنی قربانیوں کا حوالہ لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو اس تنظیم کی بنیاد ہی اس ناانصافی پر رکھی تھی جو ملک کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی تھی۔

بابا صاحب تو ان کی بنیادیں ہی ڈھا دینا چاہتے تھے۔

اُنہیں کہا جاتا کہ یہ بڑا کم ظرف دشمن ہے۔ اُن کی مدد نہیں کر رہا انہیں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ تنظیم کے نوجوان خون کو گرما کر ملک کی بنیادوں پر کلہاڑی چلانا چاہتا ہے جس میں ان کے اباؤ اجداد کا خون کام آیا ہے۔

ان مٹھی بھر سر پھرے نوجوانوں کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے غیر ملکی طاقت کا آلہ کار بننے کے بابا صاحب کے فیصلے کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اُسے ملک دشمن قرار دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بابا صاحب نے لسانی تنظیم کے نام پر ایک سموک سکرین تان رکھی ہے۔

دراصل اصلیت وہ نہیں ہے جو انہیں بتائی گئی ہے۔

اس دھویں کی چادر کے پیچھے ملک و قوم کی سلامتی کے ساتھ ایک گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے۔ عقل کے اندھے لیکن گانٹھ کے پورے بابا صاحب نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کی آشیر واد سے ملک کا نقشہ ہی بدل دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

وہ ایک چھوٹی سی ریاست بنا کر اس کا مہاراجہ بن کر زندگی بتانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد سے اپنا علیحدہ ملک بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

اس گھناؤنے خواب کی تعبیر کی صورت تب ہی مل سکتی تھی جب وہ اس ملک میں انارکی اور لاقانونیت کا طوفان لے آتا۔ جس کے لئے اُسے جوان خون کی ضرورت تھی جو اسے میسر تھا۔

اشفاق بھائی کبھی بابا صاحب کا قریب ترین اور جانثار ساتھی شمار ہوتا تھا۔ دونوں نے مل کر بُرے دن اکٹھے گزارے تھے۔

لیکن.....!

اشفاق بھائی کا خواب وہ نہیں تھا جس کی تعبیر کرنے بابا صاحب جا رہے تھے۔

ان لوگوں نے کبھی یہ جان کر ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی کہ اس طرح وہ ملک کا نظم و نسق بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

وہ تو جلسے اور جلوسوں کو جمہوری طریقے سے اپنے مطالبات منوانے کا صحیح راستہ جانتے تھے۔

اس بات کا علم تو اُنہیں بعد میں ہوا کہ آج تک وہ استعمال ہی ہوتے آئے تھے اور بابا صاحب کی شکل میں دراصل ایک خونخوار بھیڑیا اُن پر مسلط ہو گیا تھا جس کے

زہریلے دانت ملکی سلامتی کی جڑوں میں گہرے اُترتے جا رہے تھے۔

اشفاق بھائی کا ضمیر انگڑائی لے کر جاگا اور ایسا بیدار ہوا کہ پھر اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ عزم کیا کہ وہ بابا صاحب کے گھناؤنے خوابوں کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔

اس کے ساتھ تنظیم کی خاموش اکثریت تھی۔

لیکن.....!

کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

بہرحال ایک ایسا سر پھرا اور کار تھا جو بلی کے گلے میں گھنٹی باندھتا اور یہ سر پھرا اشفاق بھائی تھا۔ اس نے جرأت رندانہ سے کام لے کر ایک روز اس شہر کی ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کے سامنے بابا صاحب کی اصلیت بے نقاب کر دی۔

اس ناکردہ گناہ کی اُسے جو قیمت چکانا پڑی اس کا شاید اشفاق بھائی نے تصور نہیں کیا تھا۔

اُسے تو یہی اُمید تھی کہ جس طرح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس نے علم بغاوت بلند کیا ہے اور پریس کو بابا صاحب کی اصل شکل دکھائی ہے اس کے بعد محبِ وطن لوگوں کی ایک فوج اُس کی پشت پر آن کر کھڑی ہو جائے گی اور وہ بابا صاحب کے خونی پنجے سے تنظیم کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن.....!

اگلے روز وہ حیران رہ گیا۔

کسی اخبار نویس نے اس کی بات شائع کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اپنے اپنے مفادات کے غلام ان قلم کی عصمت بیچنے والے صحافتی درندوں میں سے کسی کو یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ اشفاق بھائی کی تنظیم سے علیحدگی کی خبریں شائع کر دیتا۔ انہوں نے تو اپنے قلم اور ضمیر جانے کب سے بابا صاحب کے پاس گروی رکھ دیئے تھے۔ وہ بھلا بابا صاحب کی ناراضی کیسے مول لے سکتے تھے۔

اشفاق بھائی کی کانفرنس کا تو اخبارات نے مکمل بائیکاٹ کیا تھا۔

لیکن.....!

اُن کے حوالے سے ایک بڑی خبر کو تمام اخبارات نے اپنے صفحۂ اوّل پر خوب مصالحے لگا کر سرخیاں جما کر شائع کیا تھا۔

اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ تنظیم کے ناراض اور غصے سے بپھرے جلوس نے اشفاق بھائی اور اس کے ساتھیوں کے مکانات کو آگ لگا دی ہے۔ ان کے اہل خانہ میں بہت سے نفرت کی بھڑکائی اس آتش کا ایندھن بن گئے تھے۔ انہیں بابا صاحب کے غنڈوں نے زندہ باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔

اُن کے اہل خانہ کی لاشیں بابا صاحب کی اگنی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

اشفاق بھائی اوران کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی قتل کر دینے کے احکامات ''آستانہ'' سے جاری ہو گئے۔

بابا صاحب کے تربیت یافتہ قاتل شکاری کتوں کی طرح اُن کی بو چاروں طرف سونگھتے پھرتے تھے۔

ان حالات میں بھی اشفاق بھائی اوران کے ساتھیوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ لوگ بابا صاحب کے قہر سے بچتے بچاتے اپنے آپ کو منظم کرتے چلے گئے۔ وہ بہت کم اس شہر میں قیام کرتے تھے اور اکثر ملک کے دوسرے حصوں میں اپنے خفیہ ٹھکانوں پر رہا کرتے تھے۔

دستوری گروپ نے تنظیم میں موجود اپنے دیرینہ ساتھیوں سے کبھی رشتہ نہیں توڑا تھا۔ انہیں اُمید تھی کہ جلد یا بدیر یہ لوگ اُن سے آن ملیں گے کیونکہ بابا صاحب کی اصلیت اب بے نقاب ہونے لگی تھی۔

بابر اور کالیا جیسے باغیوں کے لئے اُن کے ٹھکانے جائے پناہ کا کام دیتے تھے۔ تنظیم کا ہر باغی اپنی پہلی فرصت میں ان ہی سے رابطہ قائم کیا کرتا تھا۔ اس طرح اُنہیں قدرے اخلاقی سہارا ہی مل جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

●●●

انقلابی تبدیلی

عارف کو اُمید تھی کہ کالیا بھی پناہ لینے کے لئے ہی سہی اِدھر کا رُخ کرے گا اور اب جو اُس کا ضمیر جاگا تھا تو عارف اپنی سی کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب چکانے کا مصمم ارادہ باندھ لیا تھا۔

فی الوقت عارف اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ علم بغاوت بلند کرتا۔ اُس کے ساتھ ''را'' کا دُم چھلا لگا تھا اور اس دلدل میں وہ بہت گہرائی تک اُترا ہوا تھا۔ اسے لعنت کا یہ طوق اپنے گلے سے اُتارنے کے لئے کسی مضبوط سہارے اور سرکاری ضمانت کی ضرورت تھی۔

وہ جانتا تھا بالآخر یہ دستوری گروپ ہی اُس کا سہارا بنے گا۔

لیکن.....!

ابھی اس میں شمولیت کا وقت نہیں آیا تھا۔

ابھی تو اُسے بڑے حساب چکانے تھے۔

اس کے سر پر قرض کا بوجھ آن پڑا تھا اُسے اُتارنا تھا اور اس بوجھ کو اُتارنے کے لئے اُسے کسی سرکاری سہارے کی تلاش تھی۔

اس نے بابر کی مدد کر کے، کالیا کو فرار کروا کر اور اب کالیا کی بہنوں کی عزت اور ماں کی جان بچا کر دراصل اپنے اوپر احسان کیا تھا۔ اپنا مستقبل محفوظ کیا تھا اور دستوری گروپ کو اپنے خاموش لیکن مؤثر ہونے کا یقین دلایا تھا۔

عارف ایک ایک قدم پھونک پھونک کر بڑی احتیاط سے رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔

صبح سے اب تک وہ رخسانہ سے چپکا ہوا تھا۔

اس نے اشفاق بھائی کو بابا صاحب کے گھر سے فون کیا تھا۔

لیکن.....!

اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔ اُس نے رخسانہ کو بتا دیا تھا کہ وہ بابا صاحب کے حکم پر کالیا کی بہنوں کو اغواء اور ماں کو قتل کرنے جا رہا ہے۔

رخسانہ نے اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے رخسانہ کے چہرے پر اس اطلاع کا خوشگوار تاثر دیکھ کر ہی اندازہ لگایا تھا کہ رخسانہ کو اس خبر سے دلی خوشی ہوئی ہے اور اس کے جذبہ انتقام کو خاصی تسکین بھی ملی ہے۔

''میں خود تمہارے ساتھ ان دونوں کی مہمانداری میں شمولیت کروں گی۔'' اس نے بے قابو ہوتے ہوئے عارف میاں سے لپٹ کر کہا۔

عارف نے اس کے سامنے ہی ''آستانے'' میں فون کر کے تین چار لڑکوں اور ایمبولینس کا بندوبست کر لیا تھا۔

''مریضوں کو بڑی محبت سے لے کر آنا۔''

شام ڈھلنے پر رخسانہ نے اُس سے کہا۔

''بس ایک رات بابا صاحب دونوں کے ساتھ گزار لیں۔ پھر دونوں ہماری تصرف میں ہوں گی۔''

رخسانہ نے جنس زدہ عورتوں کی طرح سسکاری لی۔

''ارے کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔'' عارف نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''آستانے'' سے ایمبولینس یہاں آئی تھی اور عارف یہیں سے اُٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔

اس نے ایمبولینس والوں کو اُن کی منزل اور مقصد سمجھا دیا تھا اور اب دل ہی دل میں خدا سے دُعا مانگ رہا تھا کہ ان کا پیغام کالیا تک پہنچ گیا ہو۔

ایمبولینس اُن لوگوں نے کالیا کے گھر کے بالکل سامنے کھڑی کی تھی۔ کالیا ایک شاندار بنگلے کا مالک تھا اور خاصے ماڈرن اور مہنگے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔

عارف نے ہاتھ میں پستول تھام کر اس حملے کی قیادت کرنی تھی۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدانخواستہ لڑکیاں گھر میں موجود ہوئیں تو وہ بہر صورت ان کو بچائے گا بھلے اُسے ان سب کو مارنا ہی کیوں نہ پڑے۔

تین نوجوان اُن کے ساتھ تھے۔

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُن میں سے ایک کو دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو کر مین گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔

بلی کی سی پھرتی سے اُن میں سے ایک نے دیوار پھلانگی اور اندر داخل ہو کر مین گیٹ کھول دیا۔

اس ماڈرن آبادی کے مکینوں کے پاس اتنا وقت ہرگز نہیں تھا کہ اپنی ناک سے آگے بھی کسی کی فکر کرتے۔ اوّل تو اُسے کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو اُس کو پولیس کو فون کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ان لوگوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ ایسی وارداتوں کے پس پردہ کس کا ہاتھ ہے۔

وہ اس خفیہ ہاتھ کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان پر لانے کی قیمت چکانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

تینوں اندر داخل ہو گئے۔

عمارت کی ویرانی نے عارف میاں کے دل کو قدرے حوصلہ دیا اور انہیں اُمید ہونے لگی کہ ان کی محنت ثمر آور ہوئی۔

''تم ادھر نکلو..... تم دوسری طرف۔'' عارف میاں نے پستول لہراتے ہوئے دونوں ساتھیوں کو عمارت کے دروازے اور پچھلے دروازے سے اندر داخل ہونے کی

ہدایت کی۔

اپنے تیسرے ساتھی کی مدد سے وہ دونوں اس کھڑکی کے راستے ڈرائنگ روم میں کود گئے۔

اگلے ہی لمحے اُسے احساس ہوگیا کہ وہ جھک مار رہے ہیں۔ بنگلے کے تمام کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

سٹور روم اور دوسرے کمروں میں بکھرا سامان اس بات کی نشاندہی کے لئے کافی تھا کہ یہاں کے مکین بڑی افراتفری کے عالم میں اپنے گھر سے فرار ہوئے ہیں۔

وہ کپڑوں کے دو تین بکس مختلف کمروں میں اس طرح پھینک گئے تھے جیسے بہت جلدی میں اُن سے چند جوڑے ہی نکال سکے ہوں۔

''یہاں تو کوئی نہیں۔'' اُن میں سے ایک نے کہا۔

''کہاں مر گئے کمبخت۔'' دوسرے نے کہا۔

''بھاگ گئے۔'' تیسرے نے اپنی رائے دی۔

''لیکن جائیں گے کہاں۔'' انہیں بہرحال آج تلاش کرنا ہے۔ بابا صاحب کا حکم ہے کہ دونوں لڑکیاں آج اُن کے سامنے پیش ہونی چاہئیں۔'' عارف کا بظاہر پارہ آسمان کو چھوتا نظر آ رہا تھا۔

لیکن.....!

اُس کے دل کو جیسے قرار سا آ گیا تھا۔ اس کی محنت ثمر آور ہوئی تھی اور قدرت نے اُسے ایک بڑے امتحان سے بچا لیا تھا۔

''کہاں جا سکتے ہیں یہ لوگ۔''

اس نے غصے سے جھنجھلانے کی اداکاری کی۔

''عارف! چلتے ہیں اب یہاں کیا دھرا ہے۔'' اُس کے ایک ساتھی نے رائے دی۔

''ٹھیک ہے.....چلو!''

وہ لوگ بے نیل و مرام واپس ''آستانہ'' پر پہنچ گئے۔

●

بابا صاحب کے لئے یہ اطلاع کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی جو اُن کے سر کے بالکل اُوپر پھٹا تھا۔

''ہوں!'' انہوں نے بڑی لمبی سانس لی تھی۔

''لیکن یہ ہوا کیسے۔'' انہوں نے رخسانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

عارف نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع رخسانہ کو دی تھی کیونکہ سارا دن وہ اس کے ساتھ گزار چکا تھا اس لئے رخسانہ کو اس بات کا شک نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ کام اس نے دکھایا ہے۔

''بابا صاحب! کالیا بڑا چالاک آدمی ہے۔ اس نے آپ کی اور دوستوں کی خصوصی تربیت حاصل کی ہے۔ گدھا نہیں ہے وہ۔ اسے علم تھا کہ اس کے اس اقدام کے بعد اس کے گھر والوں کو کس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میرا خیال ہے اس نے بنے بھائی کے ہاں جانے کے بعد پہلا کام ہی یہ کیا ہوگا کہ اپنے گھر والوں کو یہاں سے نکالے۔

رخسانہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک لمحے کے لئے بھی بابا صاحب کے ذہن میں عارف سے متعلق معمولی سا شک پیدا ہو۔

''لیکن ہماری اطلاع کے مطابق صبح وہ لوگ وہاں تھے۔'' بابا صاحب کی جھنجھلاہٹ دیدنی تھی۔

''آپ کی اطلاع بالکل صحیح ہوگی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس اطلاع کے فوراً بعد وہ نکل گئے ہوں۔ کیا معلوم کہ کالیا کا اپنے گھر سے رابطہ ہی صبح قائم ہوا ہو۔'' رخسانہ نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''رخسانہ! اس واردات کی اطلاع ملتے ہی اس کے گھر کا فون ہم نے ٹیپ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے گھر فون نہیں کیا..... وہ اپنے گھر نہیں آیا پھر۔''

''بابا صاحب کالیا کسی گدھے کا نام نہیں۔ وہ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ اُسے اس بات کا احساس رہا ہوگا کہ اس کے گھر کا فون ٹیپ ہو رہا ہے۔ یہ پیغام اس نے کسی اور ذریعہ سے بھیجا ہوگا۔ اپنے کسی آدمی کے ذریعے..... ہمسایوں کے ذریعے..... آپ میری بات کی تصدیق کروالیں۔ یقیناً اس کے گھر والوں کے ہمسایوں کے ہاں فون آیا ہوگا..... میرا دل کہتا ہے ایسا ضرور ہوگا ہوگا۔

رخسانہ نے بابا صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اُس کی بات بابا صاحب کے دل کو لگی تھی اور انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی کالیا نے اپنے گھر والوں کو خبردار کر دیا ہوگا۔

اگر اس کے علاوہ کوئی بات ہوئی تھی تو یہ کسی آستین کے سانپ کا کام تھا جو بابا صاحب کی صفوں میں گھس آیا ہے۔

بابا صاحب بڑا گھاگ بھیڑیا تھا۔

اُس کا ذہن بار بار عارف کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں رخسانہ کو اچھی طرح کریدلیا تھا اور اسے علم ہو چکا تھا کہ اس نے سارا دن رخسانہ کے ساتھ ہی گزارا ہے اور یہیں سے اُٹھ کر اپنے مشن پر گیا تھا۔ کم از کم وہ یہاں سے فون کر کے کسی کو خبردار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بابا صاحب کے سامنے کالیا کے گھر کے فون کی ریکارڈنگ ٹیپ موجود تھی۔ اس میں کوئی بھی فون انہیں خبردار کرنے والا نہیں تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ کالیا نے اطلاع دینے کے لئے اس فون کی بجائے یا تو کوئی دوسرا فون یا کوئی دوسرا ذریعہ استعمال کیا تھا۔

لیکن کالیا کو کس نے مطلع کیا۔

یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان پانچوں میں سے کوئی.....!

اچانک ہی اس سوچ نے بابا صاحب کا بلڈ پریشر بڑھا دیا تھا۔ ان کا جنونی دماغ جب کسی طرف لگ جاتا تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ بابا صاحب کے ذہن نے جو مفروضہ قائم کر لیا تھا اب وہ مسلسل اس پر سوچے جا رہے تھے۔

رخسانہ کی بات اُن کے لئے گارنٹی تھی..... ان کی سیکرٹری بابا صاحب کے اور بابا صاحب اپنی سیکرٹری کے رازوں میں اتنا زیادہ شریک تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

رخسانہ نے کہہ دیا تھا کہ عارف پر شک نہیں کیا جا سکتا تو بابا صاحب نے اس پر شک کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اگر کالیا نے اپنے گھر والوں کو خبردار نہیں کیا تھا تو ضرور اُن پانچ بڑوں میں سے ایک ایجنسی سے ملا ہوا تھا۔

کون تھا وہ؟

بابا صاحب کو اب اس آستین کے سانپ کو تلاش کرنا تھا۔

●

افسرِ اعلیٰ کے سامنے شیر گل مودب بیٹھا تھا اور وہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات اپنے چہرے پر سجائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شیر گل نے بڑا سکوپ مارا تھا۔

یکے بعد دیگرے دو اہم کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ رخسانہ کے فون پر لگی ٹیپ سے انہوں نے اشفاق بھائی کے لئے ''کال'' ٹریس کی تھی۔ اس کال میں اشفاق بھائی کے ذریعے کالیا کو پیغام دیا گیا تھا کہ اس کی ماں اور بہنوں کی جان اور عزت خطرے میں ہے۔ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن بابر کی دوستی کا حوالہ بھی دیا تھا۔

ایجنسی کا کوئی ایسا ''سورس'' نہیں تھا جس کے ذریعے یہ کام کروائے گئے ہوں۔ اس فون کا مطلب یہ تھا کہ لسانی تنظیم کے اندر بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔

انہوں نے اب اس ''باغی'' کو تلاش کرنا تھا جس کی مدد سے بابا صاحب کے کالے کرتوت کی خبریں انہیں مسلسل ملتی رہیں۔

اور جب یہ باغی ایک روز اچانک انسپکٹر شیر گل سے ٹکرایا تو وہ خود چکرا کر رہ گیا۔

●

''میرا نام عارف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے وہ کال ضرور ٹریس کی ہوگی جس میں کالیا کے نام پیغام دیا گیا تھا۔ یہ فون میں نے کیا تھا۔ میں ہی وہ شخص ہوں

جس نے بابا صاحب کے حکم پر آپ کو اغواء کیا۔ ''آستانہ'' پر میرے ہی آدمیوں نے آپ پر تشدد کیا تھا۔''

سانولے رنگ اور پتلے جسم والے پچیس سالہ نوجوان نے جس کے فون پر درخواست کرنے کے بعد شیر گل نے اُس سے ایک کیفے ٹیریا میں ملنے پر رضامندی ظاہر کی تھی اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''میرا فون نمبر تم نے کہاں سے لیا۔'' شیر گل نے اُسے پہچان لیا تھا۔

''میں نے بتایا ناں کہ آپ کو اغواء کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ آپ کے گھر کا ایڈریس اور دونوں فون نمبر میرے پاس محفوظ تھے۔ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ ذاکر بھائی کو اس کے بدترین انجام تک پہنچانے کے لئے آپ نے اہم کردار ادا کیا ہوگا حالانکہ تنظیم کے بڑے اب بھی اسے مخالف تنظیم کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔''

لڑکا خاصا ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔

''مجھ سے تم کیا اُمید رکھتے ہو؟'' شیر گل نے اس سے سیدھا سوال کیا۔

''میں آپ کے ذریعے آپ کے اعلیٰ افسران سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہیں آپ کے بس کی بات نہیں۔ میرے پاس آپ لوگوں کو دینے کے لئے اتنا کچھ ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں چاہتا تو براہِ راست بھی آپ کے افسرِ اعلیٰ تک پہنچ سکتا تھا لیکن میں نے مناسب یہی جانا کہ پہلے کسی مصدقہ محبِ وطن پاکستانی سے مل لوں۔

معاف کرنا دوست دراصل میں نے اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ اب سرکار دربار پر سے میرا اعتقاد اٹھ چکا ہے۔ مجھے ہر بڑے عہدیدار پر یہی شک رہتا ہے کہیں وہ بابا صاحب سے ملا ہوا نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ میں جس شخص سے ملتا وہ میرا بازو پکڑ کر سیدھا بابا صاحب کے پاس لے جاتا..... کم از کم تمہارے متعلق میں یہ گمان نہیں کر سکتا..... میں نے تمہیں ابھی اپنا مختصر تعارف کروایا ہے۔ میرا مکمل تعارف سن کر شاید تم اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکو..... میں ایک بات تمہیں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارے ذریعے میری کسی بھی اعلیٰ افسر سے ملاقات سے ہی آپ کی اگلے عہدے میں ترقی ہو جائے گی اور مجھے اس بات کی ضمانت مل سکے گی کہ تم مجھے غلط ہاتھوں میں نہیں دھکیل رہے۔''

شیر گل کے لئے ابھی کوئی اندازہ قائم کرنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نوجوان کے متعلق کیا فیصلہ کرے۔ یہ اس کا مجرم بھی تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اسے اغواء کر کے ''آستانے'' میں پہنچایا۔

لیکن.....!

کیا اپنی ذاتی دشمنی کو وہ ملکی مفاد کی بھینٹ چڑھا دے۔

یہ تھا وہ اہم سوال جس نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ ایک طرف تو اس کا جی چاہتا تھا کہ اس نوجوان کو باہر لے جائے اور مناسب موقع دیکھ کر گولی مار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ اس کے پاس بڑا معقول جواز موجود تھا۔ یہ نوجوان بھارتی انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ تھا..... اس کی بیوی "را" کی ایجنٹ تھی۔ اس نے خود نجانے تنظیم کے حکم پر کتنے کتنے گھناؤنے جرم کیے تھے۔

لیکن.....!

شیر گل نے اُسے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا اس نوجوان کے ضمیر نے اگر اُسے نیکی کی راہ دکھا ہی دی ہے تو کیوں نہ اس کی صلاحیتوں کو ملک و قوم کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے پاس بتانے کو اتنا کچھ تھا کہ واقعی شیر گل کے لئے اسے اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اُسے عارف کی صورت میں بابا صاحب کی سیاسی اور سماجی موت نظر آ رہی تھی۔ اب یہ فیصلہ اس کے اعلیٰ افسران نے کرنا تھا کہ انہیں ملک کی سلامتی مقصود ہے یا نہیں۔

"کچھ بھی ہو۔" اس نے سوچا..... اگر اس کے اعلیٰ افسران نے مصلحت کوشی کا مظاہرہ کیا تو وہ خود اس نوجوان کی مدد سے اس سسٹم ہی سے ٹکرا جائے گا۔ اپنی بہن کی موت کے بعد سے اُس کے خیالات میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے اب سسٹم کے بجائے انصاف پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا..... وہ جان گیا تھا کہ کھوکھلے نعروں کی آڑ میں سیاست کا کتنا مکروہ اور گھناؤنا کھیل اس ملک میں کھیلا جا رہا ہے۔

اس نے خفیہ محکمے میں رہتے ہوئے ایسے متعدد سرکاری افسروں کو دیکھا تھا جو دن دہاڑے ملکی سلامتی کا سودا کرتے تھے اور کوئی ان پر اُنگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ خود اس نے لسانی تنظیم کی وطن دشمنی سے متعلق ایسے اہم ثبوت حاصل کیے تھے جن کی بناء پر اس تنظیم پر فوراً پابندی عائد کی جا سکتی تھی لیکن پابندیاں عائد کرنے والے تو خود بابا صاحب کی خوشنودی کے لئے اُس کے آستانے کے باہر ایڑیاں رگڑا کرتے تھے۔

جب چور اور کتیا اکٹھے ہو جائیں تو پھر گاؤں کے کمینوں کا خدا ہی حافظ تھا۔

"دیکھو عارف میں بھی ایک کمزور انسان ہوں۔ یقیناً میرے دل میں بھی تمہارے لئے انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی لیکن میں اپنی ذاتی دشمنی کو ملکی مفاد پر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ہمیں حکومت کا تعاون نہ ملا تو بھی یہ جنگ ختم نہیں ہوگی۔ میں خود تمہارے ساتھ شانہ بشانہ اس سسٹم سے ٹکراؤں گا..... اب یا تو ہم ختم ہوں گے یا غداروں کو جہنم رسید کر دیں گے۔"

اس نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں عارف سے کہا۔

دونوں نے اگلے روز ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ عارف کا اصرار تھا کہ اس کی اور ایجنسی کے افسرِ اعلیٰ کی ملاقات کسی پرائیویٹ ٹھکانے پر ہونی چاہئے۔ شیر گل نے یکے بعد دیگرے تین چار ایسی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ جنہوں نے مقامی افسرِ اعلیٰ کی مرکزی دفتر میں خاصی عزت افزائی کی تھی جس کے بعد سے وہ اس نوجوان

آفیسر کے لئے اپنے دل میں بڑے احترام کے جذبات رکھنے لگا تھا۔
افسرِ اعلیٰ نے ملاقات پر آمادگی ظاہر کردی۔

●

اس وقت تینوں شیر گل کے ایک رشتہ دار کے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ اس گھر کو لگا تالا شیر گل نے ہی کھولا تھا۔
عارف کو یہی تاثر دیا گیا تھا کہ یہ شیر گل کے کسی دوست کا گھر ہے لیکن اصل میں یہ ایجنسی کا ''سیف ہاؤس'' تھا۔
عارف کے منہ سے ہونے والے انکشافات نے ایک لمحے کے لئے تو افسرِ اعلیٰ کو گڑبڑا کر ہی رکھ دیا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس نے اپنا جال کتنی کامیابی سے بُنا تھا اور جانے کتنے سادہ لوح نوجوان تھے جنہیں بابا صاحب نے بڑی معصومیت سے ''را'' کے ایجنٹ بنا کر ساری زندگی کے لئے غداروں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔
وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ اس میں کسی نوجوان کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو اگر وہ ایک مرتبہ بھارت کے کسی کیمپ میں پہنچ جائے اس کے بعد وہ تنظیم کی گرفت میں اتنی مضبوطی سے جکڑا جاتا تھا کہ اس کے بعد اس کا اپنی مرضی سے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔
اگر کسی نوجوان کا ضمیر بیدار ہو بھی جائے تو وہ اس بری طرح ان وحشیوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو چکا ہوتا تھا کہ اس کی جان بچتی نظر نہیں آتی۔
اس شہر سے ہر سال ہزاروں نوجوانوں کا بھارت کے مختلف شہروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ خدا جانے ان میں سے کتنے ایسے تھے جو ''را'' کے ایجنٹ بن کر لوٹتے تھے۔
''را'' نے مینا کشی کی طرح نجانے اور کتنی فاحشاؤں کو پاکستان کے مختلف شہروں میں پہنچا دیا ہے اور وہ کتنی کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہیں۔
عارف نے بڑے لرزا دینے والے انکشافات کئے تھے۔ افسرِ اعلیٰ محسوس کر رہے تھے کہ واقعی یہ ملاقات ضروری تھی۔ انہوں نے ملاقات کے خاتمے پر دونوں کا شکریہ ادا کیا۔
انہوں نے عارف کو یقین دلایا کہ قومی مقاصد کی بجا آوری کے لئے وہ خود پر عائد ناروا پابندیوں کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے اور ملک دشمنوں کی تباہی کے اس مشن میں اُسے ہر ممکن تعاون مہیا کریں گے۔
انہوں نے عارف کو چند ذمہ داریاں سونپی تھیں اور اس بات کی بطور خاص ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی خود ساختہ بیوی مینا کشی کے ساتھ اپنا رویہ بالکل نہ بدلے اور معمول کے مطابق زندگی گزارتا رہے۔ اگر ممکن ہو تو اس کے ملاقاتیوں کی تفصیل اور اس کے معمولات پر نظر رکھے۔ اسی نوعیت کی ہدایات انہوں نے رخسانہ کے متعلق دی تھیں۔
''ایک بات جو بہت ضروری ہے اور جس کی اُمید میں تم سے ضرور کروں گا کہ احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ تمہارے ذریعے ہم نے ایک بڑے مشن کا

آغاز کیا ہے۔اس کو انجام تک پہنچانے میں ہمیں قدم قدم پر تمہارا تعاون درکار ہوگا۔ ہمارے لئے تمہاری جان کی سلامتی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خدا پر بھروسہ کر کے آج سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر دو، لیکن اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھنا کہ تمہارے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنا چاہئے..... تمہارے کسی بھی عمل سے ہرگز کسی تبدیلی کا احساس نہ ہو۔ بابا صاحب کے قریبی حلقے میں گھس جاؤ۔ ہمیں ان سفارت کاروں کی تفصیل اور اگر ممکن ہو تو دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ریکارڈ چاہئے جن سے یہ موذی ملاقاتیں کرتا رہتا ہے۔

میں بار بار اس بات پر زور دوں گا کہ محتاط رہنا۔ جتنا چوکس رہو گے ملک و قوم کے لئے اتنے ہی کارآمد ثابت ہو گے۔ اس بات کا خیال رہے کہ تنظیم کے مرکز میں خصوصاً ''را'' نے اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ تمہاری معمولی سی مشتبہ حرکت سارا کھیل بگاڑ دے گی۔ ہم تمہیں بڑے محفوظ ٹیلی فون نمبر دیں گے میں تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بابا صاحب کی سیکورٹی کے معاملات ''را'' طے کرتی ہے۔ یہ بڑا مکار آدمی ہے اور تنظیم کے اکثر اہم ٹیلی فون نمبر خود بھی وقتاً فوقتاً بگ کرواتا رہتا ہے۔ اس کے اتنے ذرائع ہیں کہ جب بھی چاہے اپنے اثر و رسوخ سے اپنے کسی بھی کارکن کا ٹیلی فون نمبر بگ کروا سکتا ہے تاکہ اس کے دلی جذبات سے باخبر رہ سکے۔ ہم تمہیں ایک ایسا آلہ دیں گے جو اس بات کی نشاندہی کرتا رہے گا کہ تمہارا ٹیلی فون بگ تو نہیں ہو رہا..... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورت میں تمہیں کیا کرنا ہے..... کوئی اہم فون کبھی رخسانہ کے کسی فون سے کرنے کی غلطی نہ دہرانا..... اہم پیغام پہنچانے کے لئے ہم تمہیں دوسرے طریقے بھی بتا دیں گے..... نارمل رہو۔ اعتماد کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر آگے بڑھو۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جہنم کا ایندھن بننے سے بچا لیا۔''

افسرِ اعلیٰ صاحب نے اُسے بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔

''مطمئن رہئے سر! میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے نہیں مروں گا۔''

عارف کے لہجے میں اس ملاقات کے بعد سے ایک اعتماد سا سمٹ آیا تھا۔

افسرِ اعلیٰ صاحب تو وہیں رہ گئے جب کہ شیر گل اُس کے ساتھ باہر آ گیا۔ وہ عارف کو کچھ دُور تک چھوڑنے کے بعد واپس آ گیا۔

اب انہیں زیادہ مستعدی کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔

●●●

شکار اور شکاری

اپنی دانست میں وہ نوجوان میناکشی سے اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے ٹکرایا تھا کہ اس کی حرکت پر میناکشی کو شک ہی نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن.....!

یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

میناکشی جانتی تھی کہ اس کے پاس حُسن اور جنس کا جو خزانہ ہے وہ بڑے بڑے پارساؤں کو لڑکھڑا دیتا ہے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس ملک کے فرسٹریٹڈ نوجوان کسی خوبصورت لڑکی سے تعلق خاطر قائم کرنے کے لئے پہلی ملاقات کا کوئی نہ کوئی جواز ضرور تلاش کرتے ہیں۔

لڑکیوں سے تعارف کے لئے یہ لوگ کیا کیا ڈرامے رچا سکتے ہیں۔ اس بات کو وہ بخوبی جانتی اور سمجھتی تھی۔ یہ نوجوان بھی بہرحال پاکستانی تھا اور میناکشی کے حُسن سے متاثر ہوئے بغیر یہاں سے گزر جانا کسی بھی دل والے کے لئے ممکن نہیں تھا۔

''معاف کیجئے..... آپ کو زحمت ہوئی۔'' نوجوان نے کھڑے ہوتے ہوئے معذرت کی۔

اس کے بالوں کی کٹنگ کا مخصوص انداز، لباس، چال ڈھال اور چہرے کی سنجیدگی اس امر کی دلالت کر رہی تھی کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ ایسے لوگوں کا شکار کھیلنے کے لئے تو میناکشی یہاں آئی تھی۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔ میں خود بہت کنفیوژ ہو جاتی ہوں کبھی کبھی۔'' اس نے اپنے شکار کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول کر اس کی قیمت لگاتے ہوئے کہا۔

میرا نام ملک ہے..... اختر ملک۔'' اس نے روایتی انداز میں کہا۔

''جی مجھے پروین کہتے ہیں۔'' میناکشی نے ہونٹوں پر مسکراہٹ جماتے ہوئے کہا۔

''مجھے کہنا تو نہیں چاہئے کیونکہ روایتی بات ہو جائے گی لیکن میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' اختر ملک نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ میں نفسیات کی طالب علم رہی ہوں۔ بلکہ اب بھی ہوں۔'' میناکشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ارے واہ کمال ہے گویا آپ کے کچھ شوق بھی میرے ساتھ مشترک ہیں۔ میں بھی نفسیات کا سٹوڈنٹ ہوں..... لیکن کیا ہم کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہیں گے۔ آیئے ناں ایک ایک کافی کا کپ ہو جائے۔ یوں بھی اب تک ہمیں اتنے لوگ گھور گھور کر دیکھ چکے ہیں کہ اب کم از کم مجھے تھوڑی دیر کے بعد شرم آنے لگے گی۔''

اختر ملک کا انداز گفتگو بے ساختہ اور بے تکلفانہ تھا۔

''چلئے صاحب آپ بھی کیا یاد کریں گے حالانکہ اجنبیوں کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنا مناسب نہیں ہوتا۔'' مینا کشی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''کم از کم اب تو ہم اجنبی نہیں رہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے نام معلوم ہو چکے ہیں۔ نفسیات ہم دونوں کا موضوع ہے اور..... اور میرے خیال سے ایک دوسرے کے ساتھ کافی کا ایک کپ شیئر کرنے کے لئے اتنا تعارف کافی نہیں۔'' ملک اختر کی بات پر مینا کشی بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے نزدیکی ہوٹل تک آ گئے تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اکا دُکا میزیں ہی بھری نظر آتی تھیں وگرنہ تو سارا ہال خالی تھا۔ دونوں نے کونے میں دھری ایک خالی میز سنبھال لی تھی۔ ملک اختر نے ایک مؤدب بیرے کو کافی لانے کا آرڈر دیا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس شہر میں کسی سے تعارف تو ہوا۔ دراصل میں نے حال ہی میں سینٹرسول سروس جوائن کی ہے اور میری پوسٹنگ بھی اس بڑے شہر میں ہوگئی ہے۔ میں نے ابھی تک آفس جوائن نہیں کیا۔

اختر ملک بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''ملک صاحب اس شہر میں کیا بلکہ اس دنیا میں ہر ذی شعور انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہی تنہائی ہے۔ آپ تو اس شہر میں نئے ہیں، میں تو نہیں، لیکن میں بھی ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ جب کوئی ہم خیال ہی میسر نہ ہو تو آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ بھلے وہ لاکھوں کے مجمع میں موجود ہو..... ویسے بائی دی وے اب آپ یہ بھی بتا ہی دیں کہ آپ کون سے ڈیپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں۔''

مینا کشی کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

''شاید آپ کو اچھا نہ لگے..... بہر حال پولیس سمجھ لیجئے..... ارے صاحب سفید پوش پولیس۔'' اختر ملک نے ہنستے ہوئے مینا کشی کے چہرے کے بدلتے روپ بھی دیکھ لئے تھے۔

''ونڈرفل۔'' مینا کشی نے بے ساختہ کہا۔ ''تب تو ہماری دوستی خوب نبھے گی..... میں بھی سنجیدگی سے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے مینا کشی نے اپنا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ضرور..... کیوں نہیں۔'' اختر ملک نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

●

ملک اختر پھولے نہیں سما رہا تھا۔

گزشتہ سات آٹھ روز سے وہ مسلسل اس شاپنگ پلازہ کے چکر کاٹ رہا تھا یہ اس کی لڑکپن کی عادت تھی۔ اُس نے کالج کیسے پاس کیا؟ اعلیٰ سول سروس کا معرکہ کس طرح سر کر لیا؟ یہ ایسے سربستہ راز تھے جن پر ملک میں ہونے والے بہت سے دوسرے گھپلوں کی طرح پردہ ہی پڑا رہا۔

اس کا باپ اور اس سے پہلے دادا پردادا بھی اعلیٰ آفیسر رہے تھے۔ انگریزوں کے بعد کالے انگریزوں کی غلامی نسل در نسل انہیں منتقل ہوتی آئی تھی۔ اس کے والد نے میٹرک کے بعد کبھی اُسے دلجمعی سے پڑھنے ہی نہیں دیا تھا۔ ہر امتحانی مرکز پر پہلے سے اُس کے خیر مقدم کے لئے اُس کے والد کے محکمے کے ملازمین موجود ہوتے۔ انہوں نے اختر ملک کو میٹرک سے اعلیٰ سروس کے امتحان تک ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی دلائی۔

ملک کی ہر کمزور، شریف اور غریب لڑکی پر وہ بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھتا تھا اور متعدد مرتبہ اس سلسلے میں اُسے تھانے کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔

لیکن.....!

ہر دفعہ معاملہ تھانے میں ہی ختم ہو جاتا۔ کبھی کورٹ کچہری تک نہ گیا۔ اُسے ایمان کی حد تک اس بات کا یقین تھا کہ اس ملک میں رشوت اور کرپشن کے ذریعے ہر ناممکن بات کو ممکن بنایا جا سکتا ہے جس کی زندہ مثال وہ خود تھا۔

اس بڑے شہر میں اس کی پوسٹنگ سے اُسے صرف اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں اُسے زیادہ حرام کاری کے مواقع ملیں گے اور اُس کی روز بروز بڑھتی ہوئی جنسی بے راہروی کے لئے بھی یہاں تسکین کا زیادہ سامان موجود ہے۔

سانولے رنگ کی اس عورت کو جسے قدرت نے کسی سانچے میں ڈھال کر اس دنیا میں اُتارا تھا وہ گزشتہ چار پانچ روز سے دیکھ رہا تھا۔

اس کی شکاری آنکھوں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اس لڑکی کے پاس اُسے دینے کے لئے بہت کچھ ہے اور اس کی چال ڈھال اور اندازِ نشست و برخاست اس امر کا غماز تھا کہ اُسے بھی ملک اختر جیسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔

پروین سے پہلی ملاقات نے ہی اُسے کامیابی کا یقین دلا دیا تھا۔ تین چار ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے اور ایک روز وہ بھی آیا جب پروین نے اختر ملک کی جنسی ہوس کو تسکین بہم پہنچا دی۔ اس روز کے بعد تو ملک اختر اس کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا تھا۔

اس کا تعلق خفیہ پولیس کے جس محکمے سے تھا اس کا کام غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر قیامِ پاکستان کے دوران نظر رکھنا اور بھارت میں موجود پاکستان ہائی کمیشن میں ویزا کی درخواست دینے والوں کے کیسوں پر نظر ثانی کرنا تھا۔ دہلی کا پاکستانی سفارت خانہ بیشتر ویزے اختر ملک کے محکمے کی سفارشات کے بعد ہی بھارتی باشندوں کو جاری کرتا تھا۔

ایسا گدھا مینا کشی کے ہاتھ کیا لگا اس کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

اس نے ''را'' کے لئے بڑا معرکہ سر کیا تھا۔

وہ دو تین ماہ میں اختر ملک جیسے جنسی مریض کے دل و دماغ پر قبضہ جما چکی تھی..... اس نے اختر ملک کے لئے اپنا وجود ناگزیر بنا لیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اختر ملک کو شدت سے جسمانی ہوس کی تسکین کے لئے اس کی طلب محسوس ہوتی تھی۔

اختر ملک کو زمانہ طالب علمی سے شراب نوشی کا چسکا لگ گیا تھا۔ اس شوق مے نوشی کو مزید ہوا پروین کی ملاقاتوں نے دی۔ پہلے وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ شراب پیتا تھا اب ہفتے میں دو تین مرتبہ پینے لگا۔

●

میناکشی نے پروین کا روپ دھار کر ''را'' کے لئے یوں تو بہت سے کام کئے تھے لیکن اختر ملک کو تسخیر کر کے وہ سب پر بازی لے گئی تھی۔ اس نے اختر ملک کو پہلے جسمانی ملاپ کے بعد ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے خاندان کے صرف دو تین افراد ہی یہاں رہتے ہیں باقی بھارت کے شہری ہیں اور اب تک وہ پانچ چھ ایسے ''بھارتی شہریوں'' کے لئے اختر ملک کی مدد سے مناسب سہولتیں بھی حاصل کر چکی تھی۔

پاکستان میں غیر قانونی طور پر قیام پذیر اپنے ''دو بھائیوں'' کے قیام کو قانونی شکل دے چکی تھی۔

اس کام کے لئے اُس نے اپنے ان ''بھائیوں'' کے ذریعے ایک خطیر رقم بطور رشوت ملک اختر تک پہنچائی تھی۔

''محبت اپنی جگہ اور بزنس اپنی جگہ۔'' اس نے ملک اختر کی بانہوں میں جھولتے ہوئے کہا جب اس نے میناکشی سے کہا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔

''میں جانتی ہوں ملک صاحب کہ آپ کو بھی اوپر والوں کا منہ بند کرنا ہوتا ہے۔ دراصل ہم سب ایک بڑے سیٹ اَپ کے درمیانی پرزے ہیں۔ ہماری حیثیت ہی کیا ہے؟ جب اوپر والے بھی کھا رہے ہیں، نیچے والے بھی کھا رہے ہیں تو درمیان والوں کو کون پوچھتا ہے۔'' میناکشی نے کہا۔

''ٹھیک ہے پروین لیکن میں اپنی ضرورتیں اور کئی جگہ سے پوری کر سکتا ہوں۔ کم از کم تمہارے حوالے سے کوئی کام کرتے ہوئے مجھے.....''

''ملک جی آپ کن چکروں میں پڑ گئے۔'' میناکشی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جن لوگوں کا آپ نے کام کیا ہے وہ بھی کوئی صوفی نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے میرے رشتہ دار ہیں لیکن وہ بھی ہزاروں دیگر لوگوں کی طرح سمگلنگ کے دھندے سے لگے ہیں۔ انہوں نے بھی لاکھوں کمائے ہیں۔ ان میں سے چند لاکھ آپ کو مل جائیں تو کیا قیامت آ جائے گی۔''

جاری ہے...

میناکشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی تربیت کے مطابق ہوا میں تیر چلایا تھا لیکن خلاف توقع عین نشانے پر۔

ملک اختر کی رال ٹپک پڑی۔

پیسہ اس کی خاندانی کمزوری تھی۔ وہ تو نجانے کب سے کسی ایسے گروہ کے چکر میں تھا جس سے ڈیل کر کے وہ ایک ہی مرتبہ اپنا مستقبل محفوظ کر لے۔ بیس پچاس ہزار کی رشوت لینا اب اس کا لیول نہیں رہا تھا۔ اس نے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے اور اس یقین کے ساتھ کہ ان تمام خوابوں کی تعبیر بھی اسی ہیرا پھیری اور بے ایمانی کے ذریعے ممکن ہوتی جس کے ذریعے وہ اس اہم منصب تک پہنچا تھا۔

اس کے باپ نے رشوت سے کروڑوں کی جائیداد بنائی تھی اور کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا تھا۔

کیا وہ ساری زندگی باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہے گا۔

اس نے سوچا اور خود ہی فیصلہ کر لیا کہ اب اُسے خود پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے۔

بے چارے والد صاحب پر آخر کب تک بوجھ بنا رہے گا۔

اس کے دادا نے انگریزوں کی ''ٹاؤٹی'' سے جو دولت کمائی تھی اس میں دس گنا اضافہ اس کے باپ نے کیا تھا۔ وہ تو تیسری نسل تھا اُس نے سوچا کہ اُسے تو سوگنا اضافہ کرنا چاہئے۔ افراطِ زر بھی تو اسی رفتار سے ہوا تھا۔ مہنگائی بھی تو اسی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔

پروین کی صورت میں تو جیسے الہٰ دین کا چراغ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس کے ذریعے اختر ملک کو کیا کیا تسکین کے سامان میسر نہیں آئے تھے۔ ایک نشہ سا اس کے حواس پر مسلسل چھایا رہتا تھا۔ اس کی صحبت کی خماری نے اختر ملک کو مخمور کر رکھا تھا اور اب وہ اس کے لئے دولت کے انبار بھی اکٹھے کرنے جا رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اپنی اس عظیم الشان محبوبہ کو اس کے شایانِ شان ''ٹریبوٹ'' کس طرح پیش کرے۔

''پروین تم واقعی میرے لئے کسی آسمانی تحفے سے کم نہیں ہو۔'' اس نے اپنے بازوؤں کا حلقہ ''را'' کی حرافہ کے گرد تنگ کرتے ہوئے کہا۔

''اور تم میرے لئے۔'' تربیت یافتہ میناکشی نے اس سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میناکشی نے تب ہی اندازہ کر لیا تھا کہ ملک اختر اس کے جال سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

اب اُسے ملک اختر کو اپنا بندہ بے دام بنانا تھا اور اسے کسی ایسے جال میں پھنسانا تھا جس سے باہر نکلنا پھر جیتے جی ملک اختر کے لئے ممکن نہ رہے۔ اور اس نے یہ سنہرا جال بھی ایک روز اختر ملک پر پھینک ہی دیا۔

●

اس روز اختر ملک شراب اور شباب کے نشے میں دھت اس کے پہلو سے چمٹا ہوا تھا جب اچانک ہی میناکشی نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں علم ہے میرے جس کزن کی تم نے سفارش کی تھی، وہی جس سے ہم نے دولاکھ روپے لئے تھے۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ہاں! ہاں! کیا ہوا اُسے.....'' ملک اختر نے بے چینی سے پوچھا۔

''دیکھو ملک! میں نے بھی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں تمہاری طرح..... جب سے ہم دونوں ملے ہیں میرا دل کہنے لگا ہے کہ ہمیں ان خوابوں کی تعبیر ضرور مل جائے گی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ لوگ کیا بزنس کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا ہے کہ اگر ہم دونوں چاہیں تو وہ لوگ ہمیں دنوں میں کروڑ پتی بنا سکتے ہیں..... اختر! تم جانتے ہو گے اس شہر میں اسلحہ کی سمگلنگ کا دھندا عام چل رہا ہے۔ وہ جو ہے ناں، وہ تنظیم کا جنرل سیکرٹری شاید وہ اس گروہ کا سرغنہ ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ تمہارے کون کون سے افسر اُن سے ملے ہوئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تین چار ایسے افسروں کے نام لے دیئے کہ ملک اختر کو اپنا نشہ ہرن ہوتا محسوس ہوا۔

اُسے اس بات کا تو علم تھا کہ ڈرگ مافیا اسلحہ کے سمگلروں کا دھندہ اس کے محکمے کے تعاون کے بغیر نہیں چلتا، لیکن جن افسروں کے نام پروین نے لئے تھے۔

کیا وہ بھی.....؟

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ ایک بات کا تو اُسے علم تھا کہ اس تنخواہ سے جو انہیں دی جا رہی ہے کوئی بھی بال بچے دار شخص صرف اپنی سفید پوشی ہی قائم رکھ سکتا تھا۔ یہ آئے روز غیر ملکی تفریحی دورے اور وہ بھی اپنے اہل وعیال کے سمیت دنیا کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں قیام اور عیاشیاں۔

ایسی باتوں کا تو تصور بھی کوئی تنخواہ دار شخص نہیں کر سکتا تھا۔

ان لوگوں کی عیاشیوں اور بداعمالیوں کا علم اعلیٰ حکام کو رہتا تھا۔

لیکن.....!

کوئی انہیں نہیں پوچھتا تھا۔ معاشرے میں انہیں معزز مقام حاصل تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اُن کی طرف انگلی اٹھا کر کوئی بات ہی کر سکے۔

تنظیم سے متعلق اُسے کوئی خوش فہمی اس سروس میں آنے سے پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود اُن لوگوں کے حکومت وقت سے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔

''دراصل وہ لوگ تمہارے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ تم نے ''آؤٹ آف دی وے'' اُن کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بہت خطرہ مول لے کر کام کیا ہے..... اب وہ لوگ بھی تمہیں Oblidge کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی ان لوگوں کو ''اچھے دوستوں'' کی تلاش رہتی ہے۔ مینا کشی نے بھرپور جنسیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار کہیں مروا نہ دینا۔'' ملک اختر نے یہ فقرہ اتمام حجت کے لئے ہی کہا تھا۔

''اب تو جئیں گے بھی اکٹھے اور مریں گے بھی اکٹھے۔'' مینا کشی نے اپنا سارا بوجھ اُس پر لادتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے..... سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔''

ملک اختر پر دیوانگی طاری ہونے لگی تھی۔

پروین نے اگلی شام اس سے دوستوں کی ملاقات کے لئے طے کی تھی۔ وہ رات اس نے ملک اختر کے فلیٹ پر ہی بسر کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگلے روز شام تک ملک اختر سے سائے کی طرح چمٹی رہے۔

وہ ملک اختر کو سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ایک مرتبہ اس کے ''دوستوں'' سے ملک کی ملاقات ہو جائے گی تو پانچوں گھی میں ہو جائیں گی۔ اس کے بعد ملک اختر زندگی بھر اس کی ڈگڈگی پر بندر کی طرح ناچتا رہے گا اور کبھی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔

●

رات کو ملک اختر کو شراب اور شباب کی ایسی خماری چڑھی کہ وہ صبح دیر گئے تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔

بے چارے ملک اختر کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ پروین کے بڑے سے ہینڈ بیگ میں موجود چھوٹے سے کیمرے نے اس کی کتنی تصویریں عالمِ خواب میں اُتار لی ہیں۔ اس کا کپڑوں سے بے نیاز جسم بڑی ہوشیاری سے پروین نے سلولائیڈ کی فلم پر اُتار لیا تھا۔

''بیڈ ٹی'' اُسے پروین نے ہی بنا کر دی۔

''بہت دیر ہو گئی آج۔'' ملک اختر نے اپنے سرہانے رکھی گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہ کام ہی ایسا ہے۔ اس میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔'' پروین نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''خیر! بیرے کو ناشتے کے لئے کہہ دیا؟''

''کون سا بیرا؟ میں کس لئے ہوں آپ کی خادم ملک صاحب۔'' اس نے جھکتے ہوئے ملک اختر سے کہا۔

''ارے تم کیوں تکلیف کرتی ہو بھئی۔'' ملک نے اُٹھ کر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

مینا کشی نے اس کا جواب ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے دیا اور کچن میں جا گھسی۔

ملک اختر کے لئے اُس نے میز پر ناشتہ سجاتے ہوئے اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ آج اُسے دفتر میں کم سے کم بیٹھنے کا موقع ملے اور شام کی متوقع ملاقات سے پہلے وہ عقل و خرد سے بالکل بیگانہ رہے۔

''میرے خیال سے چند منٹ کے لئے دفتر میں شکل دکھا آؤں۔'' ملک اختر نے کہا۔

''لیکن صرف چند منٹ۔'' پروین نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دوپہر کا کھانا میں آپ کے لئے خود تیار کروں گی۔''

''کیا بات ہے آج بڑی مہربان ہو رہی ہیں۔'' ملک اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا..... آج سے کیا مراد آپ کی۔ میں تو ملک صاحب پہلے ہی روز سے آپ کی اطاعت گزار ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' ملک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ملک اختر نے دفتر میں واقعی اپنی شکل ہی دکھائی تھی۔

معمول کی مختصر سی کارروائی اور چند فائلوں پر دستخط۔ دو تین فون اپنے ہیڈ کوارٹر میں کیے۔ تین چار پیغامات ہیڈ کوارٹر کی طرف سے وصول کیے۔ ان پیغامات میں مختلف نوعیت کی فرمائشیں کی گئی تھیں۔ چونکہ یہ فرمائشیں افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے ہوئی تھیں۔ اس لئے ملک اختر کے لئے یہ حکم کا درجہ رکھتی تھیں۔ یوں بھی اس نے نوکری کا مطلب ہمیشہ اعلیٰ افسران کو خوش رکھنا ہی سمجھا تھا۔ یہی اس کے باپ دادا کی تربیت تھی جو اُس کے کام آ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر وہ بے ساختہ اپنی محبوبہ سے لپٹ گیا۔ جس نے اپنا تن من ہی اس پر نچھاور نہیں کیا تھا۔ ایسے اسباب مہیا کر دیئے تھے کہ اب اس کی سفلی خواہشات حقیقت کا روپ دھارنے لگی تھیں۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے اکٹھا کھایا۔

مینا کشی بڑی منجھی ہوئی ایجنٹ تھی۔ اُس نے بطور خاص ملک اختر کے فریج سے وائین کی بوتل نکال کر میز پر سجائی تھی۔

اس کا اندازِ مہمان نوازی ملک اختر کے لئے جان لیوا ہوتا جا رہا تھا۔ مینا کشی اس بُری طرح اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوئی تھی کہ اگر وہ ملک کو اس لمحے کان پکڑنے کا حکم بھی دیتی تو وہ بلا چوں و چراں اس کی تعمیل کرتا۔

شام تک وہ سائے کی طرح ملک اختر سے چمٹی اسے جنسی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی رہی اور اب دونوں شہر کے ماڈرن علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ کار ملک اختر خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی بجائے پرائیویٹ کار پر سفر مناسب جانا تھا۔

''اُن لوگوں نے ہوٹل میں کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن میں نے مناسب نہیں جانا۔ میرے خیال سے ہم یہاں زیادہ اطمینان سے بات کر سکیں گے۔''

''بہت مناسب فیصلہ تھا تمہارا۔'' ملک اختر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

گاڑی اب شہر کے انتہائی ماڈرن علاقے میں داخل ہو رہی تھی اور یہاں کے سب سے مہنگے بلاک کے کونے میں بنی کوٹھی کے دروازے کے سامنے رُک گئی۔

کوٹھی کے دروازے پر موجود مسلح پہریدار نے ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی دروازہ کھول دیا۔ کار سمیت دونوں اندر چلے گئے۔

ملک اختر کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ جس طرح اس کی ''ایجنسی'' نے شہر کے مختلف حصوں میں اپنے ''مہمانوں'' کے لئے ''سیف ہاؤس'' بنا رکھے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک ''سیف ہاؤس'' تھا جسے تنظیم نے اس جیسے گدھوں کو پھانسنے کے لئے بطور خاص تیار کروایا تھا۔

تنظیم کے اس سیف ہاؤس کے ہر کمرے میں خفیہ کیمروں اور ریکارڈنگ سسٹم کے ذریعے یہاں ہونے والی گفتگو اور حرکات ریکارڈ کر لی جاتی تھیں۔ جنہیں پھر یہ لوگ موقع محل کی مناسبت سے اپنے حق میں استعمال کیا کرتے تھے۔

ملک اختر یہاں آنے والا پہلا قربانی کا بکرا نہیں تھا۔

اس سے پہلے کئی بکرے یہاں ذبح ہو چکے تھے۔ بہت سے سرکاری عمال یہاں آئے اور پھر تنظیم کے بندہ بے دام بن کر رہ گئے۔ انہیں گفتگو کے ایسے جال میں اُلجھایا جاتا تھا کہ مہمان ''لوز ٹاک'' پر مجبور ہو جاتا۔ اگر وہ ان لوگوں کی خواہش کے مطابق پھنستا بھی نہیں تھا تو بھی خفیہ کیمرے سے تیار کردہ فلم کی اس صفائی سے ایڈیٹنگ کی جاتی کہ وہ مجرم بن کر رہ جاتا اور ان لوگوں کے احکامات کی تعمیل اس پر لازم ہو جاتی تھی۔

اِلا یہ کہ وہ خودکشی کر لے..... اور ایسے کئی واقعات ہو بھی چکے تھے کہ نادانستگی میں ان شیطانوں کے ہاتھوں پھنسنے والے غیرت مند اور محبِ وطن افسران نے بالآخر خودکشی کو ہی مناسب جانا تھا۔ اُن میں اتنی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے ساتھ گزرنے والی اس قیامت کا احوال ہی اپنے اعلیٰ افسران تک پہنچا جائیں۔ انہیں مرتے وقت بھی خوف لاحق رہتا تھا کہ مبادا یہ مواد ان کی نسل ہی کو برباد کر کے نہ رکھ دے۔

شاندار اور جدید ترین سامان آرائش سے مزین اس کوٹھی کے پارکنگ ایریا میں جس شخص نے ان کا استقبال کیا وہ مقامی ایم پی اے پرویز بھائی تھا۔

ملک اختر نے اُس کا نام تو سُن رکھا تھا لیکن بالمشافہ ملاقات آج پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ملک اختر کو بطور خاص اس آرام دہ صوفہ پر بٹھایا گیا تھا جس پر بیٹھنے والے کی معمولی حرکت بھی کیمرے کی آنکھ سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔

کمرے میں پہلے سے موجود مینا کشی کے دونوں ''بھائیوں'' نے پرویز بھائی سے بھی زیادہ گرمجوشی دکھائی تھی۔

ملک اختر کے بیٹھتے ہی پرویز بھائی نے اپنی چرب زبانی کے کمالات دکھانے شروع کیے اور چند منٹ کی گفتگو ہی میں ملک اختر کو بھی کھلنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے ہی لمحے مینا کشی جیسی ایک اور خوبصورت اور نیم برہنہ حرافہ شراب کی مختلف بوتلوں سے سجی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ملک اختر کو خاص فرشی سلام کیا تھا۔

ملک اختر سے اس کی چوائس پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی گئی۔ شاید مینا کشی نے انہیں پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے یہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھوں میں شراب کے جام منتقل ہو چکے تھے۔

یہ کاک ٹیل بطور خاص تیار کی جاتی تھی اور ملک اختر کو ''خاص مہمان'' کی حیثیت میں اس جام سے سرفراز کیا گیا جس کے چند گھونٹ حلق میں اُترتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اگلے ہی لمحے اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اوّل تو اس کے دل و دماغ میں دُور دُور تک کہیں احساسِ گناہ یا احساسِ ندامت نہیں تھا کیونکہ ضمیر نام کی چڑیا اس کے والد گرامی کی خصوصیت تربیت کے سبب اس کے بدن کو چھوڑ کر لڑکپن میں ہی اُڑ گئی تھی۔ اگر کوئی ایسی خلش دُور دُور تک تھی بھی تو اب وہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔

''ملک صاحب اس حمام میں سب ننگے ہیں۔'' پرویز بھائی نے سلسلہ گفتگو مطلب کی طرف لاتے ہوئے اس کے محکمے کے دو تین اعلیٰ افسروں کے نام لے دیئے۔

''ان لوگوں کو کون نہیں جانتا۔ آپ سے زیادہ باخبر کون ہے لیکن آپ نے دیکھا کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ارے بھئی کیوں کریں گے۔ یہاں ہر شخص ضرورت مند ہے۔ زندگی نے اور سب سے بڑھ کر حالات نے ہمارے لئے اتنے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے ہیں کہ ہم میں سے کسی کے لئے بھی زندگی آسان نہیں رہ گئی۔

ایک لمحے کے لئے رُک کر اُس نے گھاگ قصائیوں کی طرح بکرے کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر خود ہی گردن ہلا دی۔ اس درمیان ملک اختر کے لئے دوسرا پیگ تیار ہو چکا تھا۔

''ملک صاحب! ہم سیاسی لوگ ہیں۔ اس شہر میں اپنے تحفظ کے لئے ہمیں بھی ہر وقت گولہ بارود کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن اور دوست دونوں طرف بارود کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف امن آشتی کا پرچار کرتے رہیں تو یہ اپنے ہاتھوں اپنی سیاسی قبر کھودنے والی بات ہوگی۔''

ملک ہمہ تن گوش تھا۔

''ہمارا کام تو جیسا تیسا چل ہی رہا ہے۔'' پرویز بھائی نے گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''اس شہر میں تو کسی مائی کے لال کی جرأت نہیں کہ ہمارے مال کو چھو کر دیکھے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ''انٹری پورٹس'' پر کوئی ایک ایجنسی تو ہے نہیں کہ جس سے ڈیل کر لی جائے۔ کئی ایجنسیوں نے اپنے ڈیسک سجا رکھے ہیں۔ ان میں آپ کے لوگ بطور خاص زیادہ سرگرم ہیں۔ ہم نے ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق سلوک کو اپنی روایت بنا رکھا ہے۔ آپ کے لوگ بھی ہمارے ساتھ تعاون تو کر ہی رہے ہیں لیکن ہم اس سلسلے میں براہِ راست آپ سے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں..... آپ نے جس طرح پروین کے دوست کی حیثیت سے ہمارے ساتھیوں کی مدد کی ہے اُس نے ہمیں تو بہت متاثر کیا ہے۔ اب ہم بھی کوئی ایسے گئے گزرے نہیں کہ اپنے دوستوں کا خیال نہ رکھیں۔ اس لئے آج سے آپ کی اور ہماری یاری پکی۔''

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ مینا کشی کے ''بھائیوں'' میں سے ایک نے اپنے پہلو میں رکھا بریف کیس پرویز بھائی کی طرف بڑھا دیا جس نے بریف کیس کھول کر ملک اختر کی طرف بڑھا دیا۔

''دس لاکھ..... ہماری دوستی کی پہلی قسط.....'' اس نے بریف کیس ملک اختر کی آنکھوں کے سامنے دھری میز پر رکھ دیا۔ جس میں موجود نوٹوں پر نظر پڑتے ہی اختر

ملک کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

''شکریہ!'' اس نے ندیدے بچوں کی طرح بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''ملک صاحب آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ بس ہماری طرف سے آنکھیں بند رکھنی ہیں۔ ہم آپ کو صرف ایک بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ کبھی کوئی ہنگامی صورتِ حال بن گئی تو ہمارے کارکن مرجائیں گے لیکن آپ کے خلاف ان کی زبان کوئی نہیں کھلوا سکتا..... ہم اپنے دوستوں کو کبھی آزمائش میں نہیں ڈالتے لیکن ان سے یہ اُمید ضرور رکھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑیں گے اور ضرور ہماری مدد کو آئیں گے۔ جہاں آپ کی عزت کا سوال ہوگا وہاں ہم مال کی پرواہ کرنے والے لوگ نہیں ہیں، لیکن ہماری اور آپ کی عزت بھی ساجھی ہونی چاہئے۔

پرویز بھائی نے سگریٹ سلگا کر اس کے دھوئیں کے مرغولے بنائے۔

''پرویز بھائی آپ مجھے کبھی پیچھے نہیں پائیں گے صرف رازداری شرط ہے۔'' ملک اختر نے اپنی چونچ کھولی۔

''ملک صاحب اس بات کا احساس ہم سے زیادہ اور کس کو ہوگا۔ سوائے ہم دونوں کے یا پھر پرویز بھائی اور کوئی کبھی آپ کو نہ فون کرے گا نہ اپنی شکل دکھائے گا بلکہ ہم بھی پروین کو درمیانی رابطے کے لئے استعمال کریں گے۔ اور بس۔''

اس مرتبہ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔

''لیکن میں اپنا حصہ برابر لوں گی بھائی جان۔''

پروین نے کہا اور تمام شیطان کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔ سب آپ کا ہی تو ہے۔'' ملک اختر نے اس کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا انہوں نے یہیں کھایا تھا۔ اس درمیان پرویز بھائی نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ ان کا ''کوڈ نام'' کیا ہوگا اور ان کے علاوہ اور کون اُن سے رابطہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے اس ملاقات میں ملک کے ایک ساحلی علاقے کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک اختر سے کہا تھا کہ وہاں تیسرے روز رات گئے ایک لانچ آئے گی اور وہ اپنے ملازمین کو موقع واردات سے ہٹا لے تاکہ یہ درندے آسانی سے اپنا کام کر لیں۔

ملک اختر نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

وہ رات بھی مینا کشی نے ملک اختر کے ساتھ گزاری۔ اس درمیان اُس نے ملک اختر کو اگلی زندگی کے ایسے ایسے خواب دکھائے تھے کہ اب اُس کی طرف سے معمولی مزاحمت کی توقع بھی ختم ہو چکی تھی۔

اس نے ملک اختر سے کہا تھا کہ دنیا کے جس ملک میں اور جس کرنسی میں بھی وہ چاہے یہ لوگ ادائیگی کر دیں گے۔ اس نے ملک اختر کو مشورہ دیا تھا کہ اب وہ فوری

طور پر کسی غیر ملک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے اور رقم بھی اسی بنک میں جمع کروایا کرے۔

اس تجویز کو ملک اختر نے دل و جان سے پسند کیا تھا اور اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ پروین سے زیادہ وفا شعار عورت روئے زمین پر اس کے بعد شاید کبھی نہ دکھائے دی۔ وہ اس کے ایک اشارے پر گردن کٹوانے کو بھی تیار نظر آنے لگا تھا۔

●

وہ دن عارف کے لئے بڑا چونکا دینے والا تھا۔ صبح جب پروین گھر میں داخل ہوئی تو سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

''میرے خیال میں اب ہمیں الگ ہو جانا چاہئے۔'' اُس نے عارف کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''کیوں؟'' عارف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اس کا جواب تو تمہیں دہلی والے ہی دے سکتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں اُن کے حکم سے ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔''

مینا کشی نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس طرح.....''

''کس چکر میں پڑ گئے ہو تم عارف.....'' اُس نے عارف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر کرو تمہیں مجھ سے نجات مل رہی ہے۔ اب تم کم از کم اپنی مرضی سے یہاں شادی تو کر سکو گے۔ بھئی تم تو جانتے ہو ہماری شادی ایک بزنس تھا۔ بزنس..... اور یوں بھی اب تم کم از کم میرے جسم کے محتاج نہیں رہے..... ویسے ایک دوست ہونے کے ناطے تم جب بھی چاہو ہم ماضی کی یادیں تازہ کر سکیں گے۔'' مینا کشی نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''مینا کشی! ٹھیک ہے میں مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں لیکن کم از کم اس بات کا تو خیال کرو کہ میں اپنے والدین کو.....''

''جہنم میں جاؤ تم اور تمہارے والدین۔ میرے منہ نہ لگو۔ تم جانتے ہو اس بزنس میں معمولی سے انکار پر بھی کتنی بھیانک سزا مل سکتی ہے..... اگر میرے رویے سے بھی ان لوگوں پر تمہاری طرف سے سرتابی حکم کا احساس ہو گیا تو جانتے ہو..... تمہیں تمہارے والدین سمیت کتے کی موت مار دیا جائے گا..... جانتے ہو تم کن کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔ کن لوگوں نے تمہیں اس قابل بنایا ہے۔ مجھے فوراً بلکہ اسی وقت ایک سفید کاغذ پر طلاق لکھ دو اور اس کی ایک نقل کونسلر کو بھی پہنچا دینا۔''

''کیا کیا پاکھنڈ پھیلا رکھے ہیں تم لوگوں نے..... ہونہہ.....'' اس نے نفرت سے ناک سکوڑی۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔'' عارف کی گھگی بندھ گئی تھی۔

یوں بھی آج کل وہ غیر معمولی حالات کا شکار تھا۔ اب اچانک مینا کشی نے اُس کے سر پر ہتھوڑا چلا دیا تھا۔ عارف کو حیرانگی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ نجانے کب

سے اس گندی اور گھٹیا قسم کی ازدواجی زندگی سے نجات کی دعائیں مانگ رہا تھا اور اب جب اُسے نجات ملنے لگی تھی تو وہ گھبرا گیا تھا۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو..... تم نے اس سے پہلے میرا کچھ نہیں دیکھا۔ گدھے کہیں کے۔''

''جاؤ اور جیسے میں نے کہا ہے فوراً کرو، اور ہاں خبردار اگر کسی سے اس بات کا تذکرہ بھی کیا..... ٹھیک ہے تم لوگوں کو پوچھنے پر بتا دینا کہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے لیکن اب میں کہاں ہوں اس کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا علم نہیں..... اپنے تنظیم کے ساتھیوں میں یہ افواہ پھیلا دینا کہ میں بھارت واپس چلی گئی ہوں۔''

مینا کشی نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس کا رویہ اتنا اچانک اور بوکھلا دینے والا تھا کہ اگر عارف کو اس سے ذرا سی بھی محبت رہی ہوتی تو اُن کا شاید ہارٹ ہی فیل ہو جاتا۔

عارف نے اس کے حکم کی تعمیل وہیں کھڑے کھڑے کر دی اور اب وہ مینا کشی ہی کے حکم پر اس کی گھر میں موجود تمام تصویریں اکٹھی کر کے اس کے سامنے ڈھیر لگا رہا تھا۔ اس بات کا تو اُسے بھی علم تھا کہ مینا کشی نے ان تصاویر کے نیگیٹو زاپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھے۔

اس نے جان بوجھ کر بڑی ہوشیاری سے تین چار تصویریں غائب کر لی تھیں۔ جن کا علم شاید مینا کشی کو بھی نہ رہا ہو۔

''دیکھو اگر تمہارے گھر سے میری کوئی تصویر برآمد ہو گئی تو خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔ اس لئے احتیاط کرنا..... اگر میرے جانے کے بعد کوئی تصویر نظر آ جائے تو اُسے جلا دینا۔''

مینا کشی نے اُسے حکم دیا۔

●

گھر کے دوسرے کمروں میں موجود اُس کے والدین کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو سکی کہ ان کی بہورانی نے کیا گل کھلائے ہیں۔ انہیں صرف اس بات کا علم تھا کہ پروین کی ایک دُور کی رشتہ دار اس شہر میں رہتی تھی جس کے ہاں کبھی کبھی وہ رات گزار لیا کرتی تھی۔ چونکہ بے چاری کے ننھیال انڈیا میں تھے اور جب کبھی ان کی یاد اُسے ستاتی تو اپنا دل ہلکا کرنے کے لئے اپنی خالہ اماں کے ہاں چلی جاتی تھی اس لئے کسی نے بھی کبھی اس پر اعتراض نہ کیا۔

آج بھی اُن کی بہورانی دو دن اپنی خالہ اماں کے ہاں گزار کر گھر آئی تھیں۔ انہوں نے حسب سابق اس کی اور خالہ کی خیریت دریافت کی جس کا جواب بہو بیگم نے ہوں ہاں میں دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

عارف چوہدری چونکہ اُن کے ''کماؤ پوت'' تھے اور انہوں نے اس گھر کیا سارے خاندان ہی کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے کوئی بھی ان کے سامنے زبان نہیں کھولتا تھا نہ ہی اس کے کسی فیصلے پر اعتراض کرتا تھا۔

وہ لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ پروین کے لچھن کچھ ایسے اچھے نہیں تھے کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ اس کا بن ٹھن کر بازاروں میں گھومنا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن جب دو تین مرتبہ انہوں نے عارف کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہی تو انہوں نے اس بری طرح گھر والوں کو ڈانٹا کہ پھر کسی کو اُن کی ناراضگی مول لینے کا حوصلہ ہی نہ پڑا۔

اُن لوگوں نے بادلِ نخواستہ سب کچھ جانتے بوجھتے اور دیکھتے بھالتے بھی خاموش رہنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی اور کوئی پروین کے منہ نہیں لگتا تھا۔

عارف اپنی سابقہ زوجہ محترمہ کے حکم پر اُس کے لئے ایک ٹیکسی بھی لے آیا تھا اور اب اُس کے تیار کردہ دونوں اٹیچی کیس اُٹھا کر ٹیکسی میں رکھ رہا تھا۔ عارف کے سامنے مینا کشی نے جان بوجھ کر ٹیکسی والے کو غلط ایڈریس بتایا تھا اور اُسے لے کر سیدھی ایئرپورٹ آ گئی تھی۔

ایئرپورٹ سے اُس نے ٹیکسی تبدیل کی اور اپنی نئی منزل کی طرف چل دی۔ اُس نے اپنے رہنے کا بندوبست فی الحال ایک ہوسٹل میں کیا تھا۔ اس ہوسٹل میں زیادہ تر غیر ملکی لڑکیاں قیام پذیر تھیں۔

اسے اپنی قیادت کی طرف سے کل ہی حکم مل گیا تھا کہ اب شادی والا پاکھنڈ برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابھی تک اس نے ملک اختر کو اپنی قیام گاہ سے آگاہ نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

لیکن.....!

اب کسی بھی لمحے اُسے کسی بھی طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا تھا۔ یوں بھی اس نے پہلے ہی ملک اختر کو بتا دیا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اگر اچانک اس پر اپنے کسی نام نہاد خاوند کا انکشاف کر دیتی تو شاید وہ پسند نہ کرتا۔

''کیا ہوا بیٹا..... پروین پھر چلی گئی۔'' عارف کی والدہ نے ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی پوچھا۔

''ہاں اماں بی..... اب ہمیشہ کے لئے دفع ہو گئی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں نے اُسے طلاق دے دی اماں بی۔''

''طلاق..... تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں اماں بی..... میرا دماغ ٹھیک ہی اب ہوا ہے۔ اس سے پہلے واقعی میرا دماغ خراب تھا جو اس کی ہر غلط حرکت کو بے غیرتی سے برداشت کرتا رہا۔ میں آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری وجہ سے اتنی دیر تک اس کا وجود برداشت کیا۔''

اُس نے سکھ کا لمبا سانس لے کر کہا۔

''لیکن بیٹا! آخر ہم برادری والے ہیں..... رشتہ داروں کی زبانوں کو کیسے لگام دیں گے..... وہ لوگ تو پہلے ہی ہم سے بہت حسد کرتے ہیں۔''

''اماں بی..... انہیں بکنے دیجئے۔ آپ آرام سے زندگی گزاریں۔ میں نے اُسے طلاق دے دی ہے۔ اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی۔ شاید آج کل میں وہ واپس انڈیا چلی جائے..... اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس اچانک صورتحال نے اُسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

''کہیں ان لوگوں کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا۔''

یہ تھا وہ سوال جو بار بار اُسے کچوکے دے رہا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اپنی دانست میں ابھی تک اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اُسے ''بابا صاحب'' کے نزدیک بھی کوئی نہ پھٹکنے دیتا۔ نہ ہی رخسانہ کبھی اس پر مہربان ہوتی۔

تنظیم کے بڑے لوگوں میں شامل ہونا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ وہ کلیئر ہے اور اس پر کوئی شک نہیں کیا جا رہا۔ بابا صاحب کی نگرانی اور اُن کے نزدیکی حلقوں پر نظر رکھنے کا کام ''را'' کرتی تھی اور اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ ''را'' کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی بابا صاحب کا قرب حاصل کر لے۔

شاید مینا کشی کو دوسری کوئی مہم سونپی گئی ہو گی۔ اس نے سوچا۔

یوں بھی جس مقصد کے لئے مینا کشی کے مالکوں نے یہ شادی کا ڈرامہ رچایا تھا، وہ تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے یہ سارا کھڑاگ اُسے پاکستان میں قانونی حیثیت دینے کے لئے پھیلایا تھا جو اُسے مل چکی تھی۔ ایک مرتبہ پاکستان میں آ جانے کے بعد اُسے جو کام کرنے تھے اس کے لئے جو معاشرتی حیثیت درکار تھی وہ بھی اُسے حاصل ہو گئی تھی۔

یوں بھی جن حلقوں میں اُسے کام کرنا تھا وہاں اُس کا شادی شدہ ہونا شاید کسی مرحلے پر اُسے ''ڈس کریڈٹ'' کر دیتا۔ اب وہ ایک کنواری ''حسینہ'' کی حیثیت میں زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکتی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ''را'' عارف کو جہاں تک لے جانا چاہتی تھی وہاں تک لے گئی ہو اب وہ کسی رہنمائی کے بغیر خود ہی اپنا کام کر سکتا تھا۔ شاید اس لئے اس پر کوئی نگران رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

اس نے اپنے گھر والوں کو سمجھا دیا تھا کہ اُنہیں پروین سے متعلق لوگوں کے سوالات کے کیا جوابات دینے ہیں۔ طلاق نامے کی نقل اُس نے کونسلر کو پہنچا دی تھی اور خاصا مطمئن بھی تھا۔

●

''اسے تلاش کرو..... اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔'' شیر گل نے عارف سے کہا۔

شیر گل سے ملاقات سے پانچ چھ روز پہلے ہی مینا کشی نے اُسے خیر باد کہا تھا۔ اُس نے اپنی کہانی جو شیر گل کو سنائی تھی اس کے بعد شیر گل کے لئے تفصیلی گفتگو تو ممکن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ کوئی قدم اُس کی اجازت کے بغیر اُٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔

اب جو ملاقات ہوئی تو اس نے پہلا سوال ہی پروین سے متعلق کیا تھا۔

''میں نے اس کی دو تصویریں کسی طرح بچالی ہیں۔'' اُس نے یہ کہتے ہوئے تین تصویریں شیر گل کو تھما دیں۔

''ہوں.....''

شیر گل نے تصاویر پر ایک نظر ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اُس نے اپنی منزل بھی مجھے نہیں بتائی۔ جو منزل ٹیکسی والے کو بتائی تھی۔ ظاہر ہے وہ غلط ہوگی اور اس کا ٹھکانہ کوئی اور ہوگا..... ہاں اس بات کی اُمید مجھے ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گی..... میں نے اس سے اپنا رابطہ نمبر دینے کی درخواست کی تھی لیکن اس نے ڈانٹ دیا۔''

عارف نے شیر گل کو ساری واردات سمجھا دی۔

''ٹھیک ہے..... کچھ کرنا ہوگا۔ خدا کرے ان تصویروں سے ہی کام چل جائے۔ تم کوشش کرنا کہ پرویز بھائی کے ذریعے اُس تک پہنچ جاؤ۔ آج کل انڈیا انٹیلی جنس والا ڈیسک اس نے سنبھال لیا ہے۔ بڑے بھائی کے بعد پرویز بھائی نے اُس کی جگہ لی ہے..... اور ہاں رخسانہ کے نزدیک رہ کر بھی محتاط رہنا۔ اگر کبھی وہ تمہیں ٹٹولنے کے لئے کوئی ڈھونگ بھی رچائے تو بھی محتاط رہنا۔ یہ عورت بہت خطرناک ہے، تمہاری توقع سے بھی بڑھ کر خطرناک۔''

شیر گل نے اُسے تلقین کی۔''

''میں جانتا ہوں شیر گل صاحب..... لیکن میں نے بھی اب گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آپ مطمئن رہئے۔ میں بہر حال انڈین لابی میں زیادہ قریب ہو کر مینا کشی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''یہ میگنٹ اپنے پاس رکھ لو۔ آج تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ شام کو کسی وقت بھی تمہارے ''باباصاحب'' سے موومنٹ کے لوگ ملاقات کرنے آئیں گے۔ یہ بہت خفیہ ملاقات ہے کیونکہ بظاہر دونوں کی دشمنی چل رہی ہے۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو رخسانہ کے ٹیلی فون پر یہ چھوٹا سا پرزہ فٹ کر دینا۔ اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔ کریڈل کی بولنے والی سمت کو کھولو اور اُسے اندر رکھ کر بند کر دو۔ اس میں موجود میگنٹ خود اپنی جگہ جما رہے گا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ جب تم یہ پرزہ فٹ کرو۔ رخسانہ کو یہ علم نہ ہو کہ اس درمیان تم وہاں موجود رہے ہو..... میرا مطلب سمجھ گئے ناں کہ اگر تم نے اپنی موجودگی کا ثبوت دے دیا اور نظر بچا کر یہ پرزہ نصب بھی کر دیا تو فوری انکشاف ہونے پر اُن تمام مشتبہ افراد کو لسٹ میں شامل کر لیا جائے گا اور اس کے باوجود کہ تم پر شک کے امکانات کم ہیں پھر بھی تم ''باباصاحب'' کے ساتھیوں کی بدخصلتی سے آگاہ نہیں۔ وہ اپنے طور پر تمہاری انکوائری ضرور کریں گے۔ تم سے سائے کی طرح چمٹ جائیں گے اور عین ممکن ہے

کہ.....''

''میں کام ہی دوسرا کروں گا.....'' اس نے شیر گل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا.....؟'' شیر گل نے بے چینی سے پوچھا۔

''کسی بھی نزدیکی ساتھی کو پھنسا دوں گا..... آپ بے فکر رہئے۔ کام ہوشیاری سے ہوگا اور اگر کبھی اس کا انکشاف ہو بھی گیا تو اُن کا کوئی اور ساتھی اس شک کا شکار ہوگا..... اس طرح ان لوگوں میں مشتبہ کی تعداد اور بڑھ جائے گی۔''

''ویل ڈن.....'' شیر گل نے اُسے داد دی۔ ''اور ہاں ابھی کالیا وغیرہ سے خود رابطہ نہ کرنا۔ جو پیغام تمہیں کسی بھی ایسے دوست تک پہنچانا ہے اس کے لئے میں حاضر ہوں..... عارف! تم بہت سی ایسی باتیں جانتے ہو جن کا علم میرے متعلق خدا کی ذات کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں..... ہمارے بزنس میں کوئی ایسا شخص جو ہمارے ایسے رازوں سے واقف ہو جائے جن کا انکشاف ہماری ذات یا ادارے کے لئے تباہ کن ہو، اس کی کم از کم سزا موت ہے۔ میں انصاف پر یقین رکھنے لگا ہوں۔ گو کہ میرے یا تمہارے پاس ایسی کوئی صوابدیدی طاقت نہیں، نہ ہی معاشرے نے ہمیں اُس مقام پر متمکن کیا ہے کہ ہم فیصلہ اور عمل کا اختیار رکھتے ہوں۔ اس کے باوجود کم از کم میں اپنی آنکھوں کے سامنے اس ملک کو، جس کی بنیادوں میں میرے بزرگوں کا خون اور ہڈیاں دفن ہیں، تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں خدا کی عدالت میں جب روزِ محشر اپنا کیس پیش کروں گا تو مجھ پر سوائے دنیاوی قوانین کی خلاف ورزی کے اور کوئی الزام نہیں ہوگا..... عارف! مجھے اپنی بہن سے اتنی ہی محبت تھی جتنی ہمارے معاشرے کے بھائیوں کو اپنی بہنوں سے ہو سکتی ہے لیکن جس روز اُسے قتل کیا گیا اس روز مجھے احساس ہوا کہ اس راستے کی وہ اکیلی مسافر نہیں تھی۔ اس سے پہلے جانے کتنی بہنوں کی پاکبازی کا خون کرنے کے بعد ان درندوں نے انہیں خون میں نہلایا ہوگا..... اگر ذاکر جیسے لوگ زندہ رہیں گے تو معاشرے میں شر پھیلے گا۔ وہ لوگ جو ''خیر'' کے راستے پر سفر کر رہے ہیں وہ مایوس ہوں گے اور جب شر کا قلع قمع ہوگا تو خیر کی راہ کے مسافروں کو امان ملے گی..... اُن کے حوصلے بڑھیں گے..... اور ہمارا مشن آگے بڑھے گا۔''

شیر گل نے اُسے سمجھایا۔

''میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔ کم از کم اب ضرور سمجھ سکتا ہوں۔ جب مجھے ٹھوکر لگنے کے بعد میری آنکھیں کھلی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ان زیادتیوں کے عینی شاہد ہونے کا موقع نہیں ملا، جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں جن کا میں گواہ ہوں۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں نے وہ سب کچھ برداشت کیسے کر لیا..... آپ نہیں جانتے بھارتی انٹیلی جنس کے کیمپوں میں جو نوجوان تربیت حاصل کرتے ہیں اُن کے ذہنوں میں کتنا خطرناک زہر انڈیلا جا رہا ہے۔ یہ لاوا اگر پھٹ گیا تو اپنے ہی گھر کو جلا کر راکھ کر دے گا اور ہمیں اس آتش کدے کو ابھی سے ٹھنڈا کرنا ہے۔''

دونوں دیر تک اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے جس کے بعد شیر گل نے اُسے رخصت کر دیا۔

بے چارہ

شیر گل سے الگ ہو کر وہ سیدھا رخسانہ کی طرف آیا تھا۔

اس کی خصوصی حیثیت کے پیش نظر اب کوئی اس سے شناخت طلب نہیں کرتا تھا ورنہ بابا صاحب کے ''آستانے'' کے دُور دُور تک کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ سیدھا رخسانہ کے کمرے کی طرف آیا تھا۔

رخسانہ شاید ملحقہ کمرے میں کسی کام سے گئی تھی کیونکہ ''گشتی فون'' جوں کا توں میز پر رکھا تھا۔

فون کی طرف دیکھ کر اس کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑکا۔

لیکن.....!

اپنا دل کڑا کر کے اُس نے بالآخر یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اپنی جیب میں موجود چھوٹے سے میگنٹ کو ٹٹول کر اُس نے موجودگی کی تصدیق کی اور دوسرے ہی لمحے اس نے فون کا کریڈل اتار کر پھرتی سے مائیک والا حصہ کھول لیا..... میگنٹ نما آلے کو وہاں نصب کرنے کے بعد اُس نے بجلی کی سی پھرتی سے دوبارہ اُسے بند کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کو تڑپنے لگا تھا۔

عارف نے رخسانہ کے کمرے میں جانے کے لئے وہ راستہ اختیار کیا تھا۔ جس پر صرف وی آئی پی ہی جا سکتے تھے۔ عام کارکنوں کو اس طرف سے سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے باتھ روم کا ارادہ کیا تھا اور اس وقت تک باتھ روم میں بند رہا جب تک اُس نے دروازہ کھلنے کی تصدیق نہیں کر لی۔

دو مرتبہ دروازہ کھلا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ یہاں دو شخص باری باری داخل ہوئے ہیں۔ عارف نے باتھ روم کا وہ دروازہ استعمال نہیں کیا جو رخسانہ کے کمرے میں کھلتا تھا بلکہ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

اب وہ چکر کاٹ کر رخسانہ کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ جہاں مقامی ایم پی اے نفیس میاں پہلے سے براجمان تھے۔ اب اُسے سمجھ آ گئی کہ اس سے پہلے نفیس میاں ہی یہاں آئے ہوں گے اور دوسری مرتبہ جب اُس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی تو یہ رخسانہ کی آمد تھی۔

نفیس میاں کا شمار بہر حال تنظیم کے اس گروپ میں ہوتا تھا جس کے لوگ اجازت حاصل کئے بغیر رخسانہ کے کمرے میں آ سکتے تھے۔ اس نے اچانک کمرے میں

داخل ہو کر رخسانہ کو یہی تاثر دیا تھا جیسے وہ ابھی ابھی آیا ہے۔

جس فون میں اُس نے شیر گل کا فراہم کردہ آلہ نصب کیا تھا وہ ہمیشہ رخسانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ وائرلیس نما فون تھا اور عموماً اس وقت زیر استعمال ہوتا جب وہ گاڑی میں سفر کرتی تھی۔

شیر گل نے اس فون میں آلہ نصب کرنے کی ہدایت کی تھی۔ شاید اس فون کی کسی اور طرح ''بگنگ'' ممکن نہیں رہی تھی۔

''کیسے ہو بھئی..... کہاں غائب ہو کل سے..... سنا ہے تمہاری چڑیا اُڑ گئی۔ رخسانہ نے اُسے اپنے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اچانک تین چار باتیں کہہ دیں۔

نفیس میاں حیرانی سے اس کی عارف میاں کے ساتھ بے تکلفی کا نظارہ کر رہے تھے۔

رخسانہ کا اس پر اس حد تک مہربان ہونا اس کی سمجھ سے باہر تھا کیونکہ وہ اپنی بدزبانی اور بدتمیزی کے لئے تنظیم میں ایک خاص شہرت رکھتی تھی۔

''چڑیا کو بہرحال اپنے گھونسلے میں واپس جانا تھا اور پھر آپ سے ملاقات کے بعد سے اب ہمارے لئے تو کسی اور طرف دیکھنا بھی گناہ کے مترادف ہے۔'' اس نے نفیس میاں سے نظریں بچا کر رخسانہ کو آنکھ ماردی۔

''جی نفیس بھائی..... آپ فرمائیں۔'' رخسانہ نے شاید نفیس میاں کی اپنی گفتگو میں دلچسپی کا نوٹس لے لیا تھا۔

''بس میں تو ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ کو دیکھے کئی روز ہو گئے سلام ہی کرتا چلوں..... کیسی ہیں آپ.....'' ڈھلتی عمر کے نفیس میاں جنہوں نے اپنا سر خضاب سے اپنے دل کی طرح سیاہ کر رکھا تھا دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولے۔

''ایک تو لوگوں کو نجانے کیوں میری صحت کی بڑی فکر لگی رہتی ہے۔ میرے خیال سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ میں بفضل تعالیٰ خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ اب اگر کوئی اور کام نہ ہو تو آپ تشریف لے جائیں۔ آئندہ تشریف آوری سے پہلے مطلع فرمادیا کریں تاکہ آپ کے شایان شان استقبال کا اہتمام کرلیا کروں۔''

رخسانہ نے ایم پی اے کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ بے شرموں کی طرح دانت نکالتا رہا۔

''آداب عرض ہے۔ آداب عرض ہے۔ ارے صاحب وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے کہ گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا خوب لگتی ہیں دلی یا کوئی اور.....'' انہوں نے کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنا چاہا۔

''اچھا خدا حافظ۔'' رخسانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس نے اپنا چہرہ کرسی سمیت عارف میاں کی طرف گھما دیا تھا۔

''خدا حافظ۔'' کہتے ہوئے نفیس میاں نے راہ لی۔

''بڑے سینئر آدمی ہیں۔ایسے لوگوں کو اس طرح تو نہ دھتکارا کیجئے۔'' عارف میاں نے کہا۔

''جی ہاں! ان کی طرف سے شادی کی پیش کش قبول کرتی رہا کروں۔موصوف میرے ساتھ شادی کے خواہشمند ہیں۔'' رخسانہ نے مسکراتے ہوئے گھنٹی بجائی۔

''کیا مضائقہ ہے۔ایسا فرمانبردار شوہر آپ کو اور کہاں ملے گا۔''

''لعنت بھیجو..... کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ایسے جانے کتنے روزانہ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔''

رخسانہ نے گھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے چپراسی سے کافی لانے کو کہا تھا۔

''لیکن محترمہ یہ معمولی ہستی نہیں۔کالیا کے ساتھ اس کے قریبی مراسم رہے ہیں۔اس بات کا علم مجھ سے زیادہ اور کسے ہوگا..... محترمہ! ہم نے ''را'' کی شاگردی میں چند دن گزارے ہیں اور ایسے شریف زادوں کو بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔جو بظاہر بابا صاحب کے نام کی مالا جپتے رہتے ہیں لیکن اصل میں تنظیم کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

محترمہ! میں نے زندگی میں کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ کالیا بھی غداری کرسکتا ہے، لیکن آپ نے دیکھا..... ذرا محتاط ہی رہا کیجئے۔''

اُس نے خدا کا نام لے کر تشکیک کا بیج ڈال دیا۔

رخسانہ نے ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سوائے سادگی اور جانثاری کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اس حادثے کے بعد سے تم کچھ زیادہ ہی سیریس ہوگئے ہو حالانکہ کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

''اجی صاحب! آپ کے جانثاروں پر کبھی گھبراہٹ طاری ہو، ایسا ممکن ہی نہیں۔میں تو یونہی بات برائے بات کر رہا ہوں۔''

اس نے رخسانہ کا کمرہ خالی دیکھ کر معمولی سی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا جسے رخسانہ نے خوش دلی سے قبول کرلیا۔

''اچھا مجھے بھول نہ جائے۔آج تمہیں کچھ خصوصی مہمانوں کو ریسیو کرنا ہے۔ان لوگوں کو بڑی رازداری سے ''ایف۔بی'' میں پہنچا دو..... اپنی مرضی کے لوگ ساتھ لے لو۔''

اُن لوگوں نے بابا صاحب سے میٹنگ کرنی ہے جس کے بعد یہ چلے جائیں گے۔کسی کو مہمانوں کی آمد اور بابا صاحب سے میٹنگ کا علم نہیں ہونا چاہئے۔

''ایف۔بی'' کا چارج تم خود سنبھالنا..... میں تمہاری معاونت کے لئے وہاں موجود رہوں گی۔'' اس نے یہ بات رازداری کے انداز میں کہی تھی۔

لیکن.....!

عارف کے لئے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔وہ نجانے کتنی شدت سے اس واقعے کا عینی شاہد بننا چاہتا تھا۔

''بابا صاحب سے ملو گے؟''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' عارف نے انکساری سے کہا۔

''مل لو..... باباصاحب سے جب بھی موقع ملے ضرور مل لیا کرو۔ تم جانتے ہو بڑے بڑے جانثاران کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترس جاتے ہیں۔ تم نہیں جانتے خصوصاً تمہارے لئے تنظیم کے لوگوں میں یہ تاثر بنائے رکھنا ضروری ہے کہ تم باباصاحب کے نزدیک ہو۔ اس طرح یہ لوگ دب کر رہیں گے..... بصورت دیگر جس طرح تم نے تیزی سے عروج حاصل کیا ہے اور تنظیم میں اپنی جگہ بنائی ہے اس سے تمہارے بے شمار حاسد پیدا ہو گئے ہیں..... عارف!

تم بہت سمجھدار ہو لیکن ہم بھی تمہارے ہمدرد ہیں۔ یاد رکھنا کبھی تمہیں ضرور احساس ہوگا۔ تم ابھی تنظیم کے بہت سے رازوں کو نہیں جانتے۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ ہمارے اکثر لوگ اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں محض ''معاصرانہ چشمک'' میں مارے جاتے ہیں اور اُن کا الزام ایجنسی یا مخالف تنظیم پر ڈال کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔''

رخسانہ نے رازداری سے کہا۔

''اس عورت سے محتاط رہنا..... بہت مکار ہے۔ تمہاری توقعات سے بڑھ کر چالاک۔''

اس کے لاشعور میں ابھی تک شیر گل کی وارننگ گونج رہی تھی۔

''لیکن باباصاحب کو تو ایسی باتوں کا علم رہا ہوگا۔'' اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر کہا۔

''باباصاحب سے کچھ پوشیدہ نہیں رہ سکتا..... میں تمہیں حلفاً کہتی ہوں کہ اُن کے پاس کوئی ایسی پُراسرار قوت موجود ہے جو انہیں معاملات سے باخبر رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کوئی بات باباصاحب سے پوشیدہ ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ بہت کچھ برداشت کرتے ہیں۔'' رخسانہ کافی جذباتی ہو رہی تھی۔

''باباصاحب واقعی عظیم ہیں۔'' عارف نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔

اُس نے اپنی کوئی رائے نہیں دی تھی۔ وہ اب بہت محتاط ہو گیا تھا۔ جس خطرناک راستے پر وہ چل رہا تھا وہاں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہی بہترین حکمت عملی تھی۔

رخسانہ نے کچھ دیر بعد ہی اسے اپنی معیت میں باباصاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

''آج کے میزبان عارف چوہدری ہوں گے..... بڑا سمجھدار نوجوان لگتا ہے۔''

باباصاحب نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''آپ کی نظرِ کرم درکار ہے باباصاحب! ہماری جان آپ کے کام آ جائے یہی زندگی کا مقصد ہے۔'' عارف نے چاپلوسی کا مظاہرہ کیا۔

اُسے علم ہو گیا تھا کہ بابا صاحب کو اپنی تعریف سننے کا جنون کی حد تک شوق ہے اور اُسے اُمید تھی کہ یہی شوق انہیں کسی روز جہنم واصل کر دے گا۔
بابا صاحب نے اُسے بطور خاص چند ہدایات دے کر رُخصت کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخسانہ کا شکریہ ادا کر کے ''آستانے'' کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سے اُسے مہمانوں کے استقبال اور آج کی تقریب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے اعتماد کے ورکرز حاصل کرنے تھے۔

●

وڈیرہ سہیل اپنے تین ساتھیوں سمیت اپنی پجیرو پر اُن کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کی شکلوں ہی سے اُن کی اصلیت دکھائی دیتی تھی۔ ان کے چہروں سے برستی لعنت اس امر پر دلالت کرتی تھی کہ یہ وحشی جو انسانوں کے روپ میں یہاں گھوم رہے ہیں، جنگلوں میں رہنے والے جانوروں سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر اُن کا بس چلے تو یہ ملک کے تمام شہروں کو جنگلوں میں تبدیل کر کے رکھ دیں کیونکہ اُن کے نزدیک جنگل کا قانون ہی دراصل صحیح قانون ہے۔
ان لوگوں کو دیکھتے ہی چند لمحوں کے لئے عارف میاں حیران ضرور ہوئے تھے۔ کیونکہ ملک بھر کے اخبارات میں دونوں تنظیموں کی دشمنی کے واقعات کا تانتا بندھا رہتا تھا اور اخباری طور پر دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر دن رات غداری کے الزامات لگاتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ظالم اور خود کو مظلوم بتاتے تھے۔
لیکن.....!
اصل میں دونوں مل کر اس ملک کے بدقسمت اور سیدھے سادے عوام کو بیوقوف بنا رہے تھے اور اُنہیں احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ اُن کے ساتھ کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔
طے شدہ پلان کے مطابق عارف میاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُن لوگوں کو اپنی گاڑیوں کے جلوس میں تنظیم کے مخصوص ٹھکانے ''ایف۔ بی'' تک لے آیا جہاں بابا صاحب، پرویز بھائی اور اُن کے چیدہ چیدہ ساتھی ان لوگوں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔
عارف حیران تھا کہ یہ کیسے ملک دُشمن، غدار، قاتل اور خونی ہیں جن کا استقبال کرنے کے لئے بابا صاحب بہ نفس نفیس باہر آئے تھے۔ عام حالات میں وہ کبھی کسی کے استقبال کے لئے اپنے آستانے سے نہیں اُٹھا کرتے تھے اور لوگ اُن کی قدم بوسی کے لئے اُن کے در دولت پر خود آیا کرتے تھے۔

●

تھوڑی دیر بعد شیطانوں کی مجلس جم گئی تھی۔
''بابا صاحب'' کی تنظیم کی تربیت یافتہ فاحشاؤں نے حاضرین کے سامنے شراب اور شباب سجا دیئے تھے اور اب وہ آپس میں مذاکرات کرتے جا رہے تھے۔
''بابا صاحب! ہماری اور آپ کی لڑائی ایک ہے۔ دشمن ایک ہے۔ دوست ایک ہے، پھر آخر آپ کیا کر رہے ہیں۔'' سندھو موومنٹ کے وڈیرہ سہیل نے سلسلہ

گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہی تو میں کہتا ہوں۔ یہی تو بتانے کے لئے آپ کو زحمت دی ہے کہ جب ہم دونوں الگ الگ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آپ کو بھی اپنا علاقہ اس ملک کی فوج سے چھڑانا ہے اور ہمیں بھی۔ ہمیں تو مستقبل میں اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ ہمارے تو مفادات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہمارے دہلی والے دوست اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔''

بابا صاحب نے زہر فشانی کی۔

''لیکن اس کی ابتداء ہمیشہ آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔'' وڈیرہ سیفل کے ساتھی نے کہا۔

''نہیں یہ غلط الزام ہے۔'' پرویز بھائی بولا..... آپ اطمینان سے میری بات سن لیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جن لوگوں کی لسٹ فراہم کی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے شہر سے کسی کو اغواء کر کے تاوان طلب نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے اس اصول کی دھجیاں اُڑا دیں۔ مانڈوالا کو اغواء کر لیا جبکہ وہ ہمارا دوست ہے۔ آپ کو علم تھا..... ہمیں مجبوراً پیر بادشاہ سے مدد لینی پڑی۔''

''بابا! اگر کسی لڑکے بالے نے غلطی کر لی تھی تو آپ مجھے حکم دیتے، میں آپ کا بندہ خود لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، لیکن سائیں آپ نے اس معاملے میں جی ایچ کیو کے بندوں کو گھسیٹا۔ یہ غلط بات ہے۔ اس طرح جب ہم تیسری پارٹی کو درمیان میں لائیں گے تو ہمارے دہلی والے دوست ناراض ہوں گے ناں۔'' وڈیرہ سیفل نے بڑی دھیمی آواز میں، جس سے مکاری صاف جھلک رہی تھی، جواب دیا۔

''وڈیرہ سیفل! میں ماضی کی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا..... لیکن آپ کو تین بندے واپس کرنے ہوں گے۔ جن کے نام آپ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جو ہمیں دوبارہ اکٹھے کر سکتا ہے.....'' بابا صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر حتمی بات کر دی۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب! ٹھیک ہے..... لیکن آپ تو ان جنگلی لوگوں کو جانتے ہیں..... اب یہ واقعی ڈاکو بن چکے ہیں۔ اب انہیں ہر کام کا معاوضہ چاہئے۔ کروڑ پتی پارٹیوں کو شیر کے منہ سے واپس نکالنا بھی تو بچوں کا کھیل نہیں..... سائیں! اُن کا منہ بھی تو بند کرنا پڑے گا ناں۔''

وڈیرہ سیفل نے بابا صاحب کی طرف مکارانہ مسکراہٹ اُچھالی۔

''یہ آپ کا معاملہ ہے۔ آپ خود نمٹیں اس سے۔'' پرویز بھائی بولے۔

''ایک تو آپ نے اپنے بندوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ جہاں بات نہ کرنی ہو وہاں بھی بات کر دیتے ہیں۔''

وڈیرہ سیفل کی آنکھوں کا رنگ پرویز بھائی کی مداخلت سے بدلنے لگا۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ خاموشی!''

بابا صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ان کے ساتھی بابا صاحب کے چہرے کی بدلتی کیفیت سے جان لیا کرتے تھے۔ اب وہ کیا چاہتے ہیں کیا مجال جو کسی نے زبان بھی کھولی ہو۔

''سائیں آپ جانتے ہو کہ ہمارے مالی حالات آج کل ٹھیک نہیں ہیں..... ہم تین کروڑ روپیہ نہیں دے سکتے۔ صاف بات ہے ہمارے پاس اتنے وافر فنڈز نہیں ہیں۔ ہمیں سب کچھ دوستوں سے نہیں ملتا۔ کچھ مارکیٹ سے بھی خریدنا پڑتا ہے آپ جانتے ہیں۔'' بابا صاحب نے اُسے بتایا۔

''بابا صاحب ہماری اور تمہاری مجبوری کو یہ ڈاکو لوگ نہیں سمجھتے۔ آپ کی تو بہت بڑی تنظیم ہے۔ اسمبلی میں سیٹیں ہیں آپ کی۔ وزارتیں ہیں آپ کے پاس۔ ہم تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ جب آپ کے پاس فنڈز نہیں رہے تو ہمارے پاس کہاں رہیں گے..... بابا ہماری مجبوری کو بھی سمجھو۔''

وڈیرہ سہفل بھی پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔

''ایک بات آتی ہے ذہن میں اس طرح ہمارا اور آپ کا مسئلہ اکٹھے حل ہو جائے گا..... اور مالک بھی خوش ہو جائیں گے..... وڈیرہ سہفل نے کہا۔

''کیا تجویز ہے.....'' بابا صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

''اُدھر انڈیا میں معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ یہ آرمی والوں نے نچا کر رکھ دیا ہے۔ انہیں کشمیر، آسام، پنجاب اور اب تو دہلی میں بھی بڑے دھماکے ہوئے ہیں۔ کل مجھ سے بات کی تھی انڈین قونصلیٹ نے، وہ لوگ کوئی بڑا کام چاہتے ہیں..... تین کروڑ کی آفر ہے..... ایک کروڑ آپ کا اور دو کروڑ ہمارا۔ اس بات کا خیال رہے کہ ہم نے اپنے بندے بھی واپس لینے ہیں ڈاکوؤں سے..... اُن کا منہ بھی بند کرنا ہوگا۔'' وڈیرہ سہفل نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، دوست ہیں ہمارے لئے انہوں نے کیا نہیں کیا..... اب ہمیں بھی حق نمک ادا کرنا چاہئے۔'' بابا صاحب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''لیکن رقم ڈگنی کرواؤ۔''

جاری ہے...

بابا صاحب جانتا تھا کہ وڈیرہ سیفل جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کام کے اس نے کم از کم دس کروڑ روپے وصول کئے ہوں گے اور وہ لوگ بھارتیوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے اکثر ایک دوسرے سے تعاون کر لیا کرتے تھے۔

''بابا صاحب آپ فکر نہ کریں بابا! لین دین ہوتا رہے گا..... آپ علاقے کی نشاندہی تو کریں۔ ہم کہہ دیں گے آپ کے تعاون کا..... آپ کو اُدھر سے بھی دلا دیں گے۔''

وڈیرہ سیفل نے آنکھ دبائی۔

''اُدھر کی فکر نہ کریں..... وہ ہمارا اور اُن کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہم اپنا حصہ وہاں سے خود لیں گے۔ آپ اپنی بات کریں۔'' بابا صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

بڑی ردوقد کے بعد بالآخر یہ رقم ڈبل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اب انہیں اپنا گھناؤنا کھیل کھیلنے کے علاقہ درکار تھا جہاں وہ بے فکر ہو کر شکار کھیلیں اور اپنے بھارتی آقاؤں کو خوش کر سکیں۔

''وہ کیا نام ہے اس کا چنڈی والا۔'' بابا صاحب نے پرویز بھائی کی طرف دیکھا۔

''جنجوعہ!''

''ہاں! ہاں..... وہی، وہی..... وڈیرہ سیفل تم وہاں حملہ کرو۔ سب سالوں کو مار ڈالو۔ ہمیں اپنی تنظیم کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے ابھی بہت شہیدوں کا خون درکار ہے۔ ہمیں شہید مل جائیں گے اور تمہیں شکار کھیلنے کے لئے میدان۔''

تمام درندوں نے شیطانی قہقہے لگا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔

''لیکن بابا صاحب وہ تو اپنے لوگ.....'' نفیس میاں نے دبی دبی آواز میں کہنا چاہا۔

''اے سالے، بڈھے! تیرا دماغ سٹھیا گیا ہے کیا..... ابے حرام کے پلے سیاست میں کوئی اپنا نہیں ہوتا اور سب اپنے ہوتے ہیں۔ یہ جو وڈیرہ سیفل ہے یہ ہمارا دشمن ہے لیکن ہم اس وقت ایک دوسرے کے لئے کتنے عزیز اور ناگزیر ہیں۔ ابے ہیں ناں۔ سالے تیرے دماغ کو بخار ہو گیا ہے۔ اے پرویز بھائی! ذرا اس کا بخار اُتار دے ناں۔''

بابا صاحب نے شیطانی قہقہہ لگا کر پرویز بھائی کی طرف دیکھا۔

''ابے کتے کے پلے۔ بابا صاحب کی روٹیوں پر پلنے والے۔ سالے تیرے دماغ میں یہ بات آئی ہی کیسے۔ تجھے کیسے ہمت ہوئی بابا صاحب کے فیصلے پر ریمارکس دینے کی۔ ابے جس کا کھاتا ہے اسی کے سامنے زبان کھولتا ہے۔ دھت تیرے کی۔'' کہتے ہوئے پرویز بھائی نے اچانک اتنے زور سے نفیس میاں کی کمر میں

لات ماری کہ وہ منہ کے بل بابا صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔

''مارو۔ مارو سالے کو..... خوب مارو..... خوب مارو۔'' بابا صاحب پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

یہ دورہ ان پر مہینے میں ایک آدھ مرتبہ پڑتا تھا لیکن بڑا خطرناک ہوتا تھا۔

ساری محفل پر جنون طاری ہوگیا تھا۔

وڈیرہ سففل اور اس کے ساتھیوں سمیت تمام لوگ اُس کو ٹھوکریں مار رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان وحشی درندوں کے ہاتھ کوئی کھلونا لگ گیا ہو۔ دوسری طرف نفیس میاں بابا جی کے قدموں کو بار بار چھو کر اُن سے معافی مانگتا لیکن بابا صاحب اُس کے منہ پر ٹھوکر مار کر پرے کر دیتے۔

''بس کرو..... بس کرو..... اے پرویز بھائی اسے معاف کر دو۔ بے چارے نے بہت خدمت کی ہے ہماری۔''

بابا صاحب نے اچانک ہی انہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔

پرویز بھائی نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور پلک جھپکنے میں وہاں عارف میاں اور اُن کے مسلح ساتھی موجود تھے۔

''اسے ''آستانے'' پر لے جاؤ..... پھر معاف کر دینا۔'' پرویز بھائی نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نفیس میاں جنونیوں کی طرح ''بابا صاحب معاف کر دو..... بابا صاحب معاف کر دو۔'' کی گردان کر رہا تھا۔

لیکن.....!

جواب میں شیطانی قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔

''سالا کتے کا پلا۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں..... وڈیرہ سففل سائیں! کل ہی نظارہ دکھا دو۔ ہاہا ہے ہے۔''

وحشیوں نے آپس میں جام ٹکرائے اور شب بسری کے لئے اُن لڑکیوں کی طرف لپکے جو پرویز بھائی کے یہاں سے ہٹنے کے بعد اندر آ گئی تھیں اور انہیں بطور خاص ان مواقع کے لئے رکھا گیا تھا۔

شیطانوں کا رقص اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔

درندگی کا ننگا ناچ جاری تھا۔

انسانیت اپنا منہ چھپائے پھرتی تھی۔

اگلے روز پنڈی کے ایک علاقے میں جہاں تنظیم کے دفاتر موجود تھے مومنٹ کے غنڈوں نے حملہ کر دیا۔

انہوں نے آگ اور خون کا ایک سمندر یہاں بہا دیا..... بے کس، بے بس، بے خبر اور بابا صاحب کی ذلالتوں کے شکار معصوم بچے، مرد، عورتیں گاجر مولی کی طرح

کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ اس حملے میں جتھوعہ بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ اُسے گھر میں مکینوں سمیت زندہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔

موومنٹ نے ''را'' کا حق نمک ادا کر دیا تھا۔

تنظیم نے کالی ماتا کے حضور اپنے بے گناہوں کی بلی چڑھا دی تھی۔

دونوں نے سیاسی فوائد حاصل کر لئے تھے۔

تنظیم مظلوم بن گئی تھی۔

موومنٹ معتوب ہو کر مظلومیت کا پرچار کر رہی تھی۔

بابا صاحب نے حسبِ روایت اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار مخالف تنظیم اور ایجنسیوں کی ملی بھگت کو قرار دیا۔

شہرِ بے مثال میں موجود بھارتی قونصلیٹ میں وہ شام ایک یادگار قرار پائی۔ اس روز یہاں کوئی تقریب منائی جا رہی تھی جس میں مختلف سیاسی تنظیموں کے ذمہ دار بھی مدعو تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وقت آنے پر اپنی غیرت کا سودا اپنے ہاتھوں کر سکتے تھے۔ بھارتی قونصلیٹ کے چہرے پر لمبے عرصے بعد ایک گہری مسکراہٹ جاگی تھی۔

●●●

سیکورٹی والے

نفیس میاں کا جسم دُکھتا ہوا پھوڑا بن چکا تھا۔

زخموں سے زیادہ بے عزتی اور ذلت کا احساس انہیں مارے ڈالتا تھا۔ اذیت کے جن لمحات سے وہ گزر رہے تھے کبھی وہ دن بھی تھے جب وہ اپنے مخالفین کو ایسی ہی ذلت، اذیت اور پھر گمنام موت سے دوچار کیا کرتے تھے۔

انہوں نے پارٹی میں یہ مقام یونہی نہیں حاصل کر لیا تھا۔ اس کے پیچھے برسوں کی محنت، قربانیاں اور جدوجہد موجود تھی۔ وہ گزشتہ دس سالوں سے حلقے کی مقامی سیاست پر بلاشرکت غیرے قابض تھے اور اکثر بلا مقابلہ کونسلر منتخب ہوا کرتے تھے۔ انہیں تنظیم کے سہارے کی ضرورت کبھی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ تنظیم میں شامل نہ بھی ہوتے تو بھی اُن کے حلقے کے ووٹر انہیں کم از کم کونسلر کا الیکشن نہ ہارنے دیتے اور اس سے آگے انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کیونکہ کونسلر کی حیثیت سے ہی وہ دو تین مرتبہ منتخب ہو کر ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر چکے تھے۔

بُرا ہو اس وقت کا جب انہوں نے قناعت ترک کی اور اسمبلی میں جانے کی سُوجھی جس کے لئے انہیں اس شہر میں کم از کم تنظیم کا کور ضرور حاصل کرنا تھا۔

لیکن.....!

اس سب کچھ کے باوجود نفیس میاں نے تنظیم کو جو کچھ دیا اتنا کچھ اُس سے حاصل نہیں کیا بس یہ ضرور تھا کہ اُنہیں لڑکپن ہی سے جو علت لگ گئی تھی۔ اس کے لئے یہاں وافر سامان میسر تھا اور وہ جب بھی چاہتے بلا خوف و خطر اپنی عیاشی کا سامان حاصل کر لیتے۔

لیکن.....!

اس کی اتنی زیادہ قیمت!

نفیس میاں کا جسمانی اور روحانی تکلیف سے دل و دماغ پھٹ رہا تھا۔

''اچھا بابا صاحب! زندہ تو تم مجھے چھوڑو گے نہیں لیکن اپنی قسمت سے اگر میں اس مرتبہ تمہارے شکنجے سے بچ نکلا تو میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ جائے گا..... اور وہ ہوگا تمہاری بربادی..... ہاں بابا صاحب! میں تمہیں اس طرح سسکا سسکا کر ماروں گا جس طرح تم نے مجھے زندہ درگور کیا ہے۔''

نفیس میاں نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

انہیں اپنے زخموں کی تکلیف قدرے کم ہوتے محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس تکلیف پر نفرت اور انتقام کا جذبہ غالب آنے لگا تھا۔

عارف اور اس کے تین ساتھیوں نے نفیس میاں کو تنظیم کی ایمبولینس میں موجود سٹریچر پر مریضوں کی طرح لٹا کر ان کے جسم کو سٹریچر سے منسلک پٹیوں سے کس کر باندھ دیا تھا۔ انہیں ''آستانے'' کی طرف لے جایا جا رہا تھا تا کہ نفیس میاں کے مناسب علاج کا بندوبست ہو سکے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ نفیس میاں کے منہ سے اچانک مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔ وہ اپنا جسم تو ہلا نہیں سکتے تھے زبان البتہ ضرور ہلا سکتے تھے۔ کیونکہ اس کے منہ پر کوئی بند نہیں باندھا گیا تھا۔

نفیس میاں دیوانگی کے عالم میں ایمبولینس میں اپنے سرہانے کھڑے عارف اور ان کے ساتھیوں کو گالیاں بکتے ہوئے انہیں وارننگ دے رہے تھے کہ ایک روز وہ دونوں بھی اسی طرح اسی سٹریچر پر بے بسی سے بندھے پڑے ہوں گے کیونکہ بابا صاحب ایسا سانپ ہے جو اپنے بچوں کا خون پی کر ہی اپنی زندگی کے دن بڑھا رہا ہے۔

''سالے کا دماغ چل گیا ہے..... مرنے سے پہلے اس کا دماغی توازن بگڑنے لگا ہے۔'' عارف نے اپنے ساتھی سے کہا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

''ابے چپ کر بڈھے..... کیوں اپنی زندگی کے چند گھنٹوں کو مزید چھوٹا کر رہا ہے۔'' اس کے ساتھی نے کہا۔

''اگر اب آواز نکالی تو حلق میں روئی دے کر منہ باندھ دوں گا۔'' عارف میاں نے اس طرح سختی سے نفیس میاں کو ڈانٹا کہ ان کی گھگی بندھ گئی۔

وہ سہم کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے اچانک سانپ سونگھ گیا ہو۔

پرویز بھائی کے حکم پر وہ نفیس میاں کو ''آستانہ'' پر لے جا رہے تھے۔ پرویز بھائی نے عارف کو ہدایت کی تھی کہ آج رات ہی نفیس میاں کی خاطر مدارات کے بعد اُن کی لاش ٹھکانے لگا دی جائے۔

اپنے ملزمان کی منتقلی کے لئے یہ لوگ یہی طریقہ استعمال کیا کرتے تھے۔

●

شیر گل خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ ناکے پر مستعد تھا۔

گو کہ اس علاقے میں پولیس کی گشتی گاڑیاں موجود تھیں۔ سڑک کے مختلف چوکوں میں پولیس نے مورچہ بندیاں بھی کر رکھی تھیں۔

لیکن.....!

اُسے ان میں سے کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

وہ جانتا تھا ان میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں کہ تنظیم کی کسی ایمبولینس کو روک کر اس کی تلاشی لے سکیں جبکہ انہیں بہر صورت یہ کام کرنا تھا۔

عارف نے اپنے دستی ٹیلیفون پر موقعہ پاتے ہی اسے صورتحال سے مطلع کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ لوگ نفیس کو ''آستانہ'' تک پہنچانے کے لئے فلاں نمبر کی ایمبولینس کے ذریعے فلاں راستے سے گزریں گے۔

نفیس میاں کا زندہ رہنا ملک وقوم کے لئے ناگزیر تھا۔اس کے پاس بابا صاحب کے بہت سے راز تھے۔کئی تخریب کاری کے منصوبوں میں وہ بابا صاحب کا دست راست رہا تھا۔

یوں بھی تنظیم کے باغی گروپ کی سیاسی قوت بڑھانے کے لئے نفیس میاں آسمانی تحفہ ثابت ہو سکتے تھے۔ایسے بزرگ سیاستدان کا باغی گروپ میں شامل ہونا تنظیم کی بنیادیں ہلا سکتا تھا۔

شیر گل نے اس منصوبے میں سوائے افسرِ اعلیٰ کے اور کسی کو راز دار نہیں بنایا تھا۔

عارف نے بڑی ہوشیاری سے موبائل فون کے ذریعے یہ اطلاع اُس تک پہنچائی تھی جسے اپنے نئے افسرِ اعلیٰ کی طرف سے خصوصی پشت پناہی حاصل تھی۔شیر گل نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا نیا افسرِ اعلیٰ جو حال ہی میں اعلیٰ سروسز کا امتحان پاس کر کے آیا تھا ابھی تک بیوروکریسی کے گندے اثرات سے محفوظ تھا اور اس نوجوان افسرِ اعلیٰ کی صورت میں ڈیپارٹمنٹ کو تو ایک ہونہار آفیسر میسر آیا تھا، ملک کو بھی ایک محبِ وطن سپاہی مل گیا تھا۔

افسرِ اعلیٰ نے شیر گل سے ملاقات کرنے سے پہلے اس کی فائل پڑھ لی تھی اور اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اُس نے اور بھی بہت کچھ جان لیا تھا۔اس نے شیر گل کی زبانی ماضی کے تمام واقعات سننے کے بعد اسے کہا تھا۔

''میری پہلی وابستگی اپنے ملک اور اس کی سلامتی سے ہے اور اس ایشو پر میں زندگی بھر کسی سودے بازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔جہاں میں نے محسوس کیا کہ میرے افسران کے مفادات میری اس کمٹمنٹ سے ٹکرا رہے ہیں تو میں اُسی روز استعفیٰ دے کر گھر چلا جاؤں گا..... میرا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے اور میں اپنے ملک کی سلامتی کے خلاف کسی سازش میں حصہ دار بننے سے ٹریکٹر چلا کر رزق کمانا زیادہ افضل جانتا ہوں۔''

اس مختصری بات نے شیر گل کے دل و دماغ کو مسحور کر لیا تھا اور اُس نے یوں جانا جیسے اس کے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔اس روز سے شیر گل کو اپنا آپ بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

اُس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو نیند سے جگا کر عارف کی طرف سے ملنے والی اس تازہ ترین اطلاع سے مطلع کیا اور اپنا منصوبہ بتا کر اس پر عمل پیرا ہونے کی اجازت طلب کی تھی۔

مہربان اور محبِ وطن افسرِ اعلیٰ نے اُسے نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ رات کے جس پہر میں وہ چاہے اسے نیند سے جگا کر کوئی بھی ہنگامی مدد یا مشورہ طلب کر سکتا تھا۔

شیر گل نے اس سب کچھ کو تائید غیبی جانا تھا۔

وہ اپنے محکمے کی جیپ اور مسلح گارڈ کے ساتھ اس ناکے پر موجود تھا جہاں سے موڑ کاٹ کر ایمبولینس کو آگے جانا تھا۔یہاں موجود ریلوے لائن پر لگے پھاٹک کو اُن

لوگوں نے بند کر کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔
تھوڑی دیر بعد ہی انہیں ایمبولینس کی چھت پر گھومتی لائٹ دکھائی دے گئی۔ سب لوگ مستعد ہو کر اپنی جگہ ڈٹ گئے۔
منصوبے کے مطابق اُن سے کچھ فاصلے پر موجود ایک ساتھی نے سرخ رنگ کی لالٹین سڑک پر رکھ کر ایمبولینس کو رُکنے کا سگنل دیا۔
ایمبولینس کے ڈرائیور نے اپنی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پولیس کی وردی پہنے دو سپاہیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے ایمبولینس روک دی۔

●

وہ جانتا تھا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے۔
''کیا بات ہے..... بریک کیوں لگا رہے ہو.....'' عارف نے جان بوجھ کر ایمبولینس کے پچھلے حصے سے ڈرائیور کو پوچھا تھا۔
''کچھ نہیں عارف بھائی شاید کوئی نئے گدھے ہیں..... سالوں کو شوق پورا کر لینے دو..... ہماری شکل پر نظر پڑتے ہی معافی مانگ لیں گے۔''
ڈرائیور نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
جیسے ہی ایمبولینس رُکی ایک کونے پر کھڑی جیپ سے بجلی کی سی پھرتی سے شیر گل اور اس کے ساتھی برآمد ہوئے۔
شیر گل نے ڈرائیور کو ایک لمحے کی مہلت دیئے بغیر اُس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اُسے ایمبولینس سے باہر آنے کا حکم دیا۔
''کہ کہ کون ہو تم..... کیا بات ہے ہم تنظیم کے رضا کار ہیں۔'' اچانک ٹوٹ پڑنے والی قیامت نے ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔
''زیادہ بک بک نہ کرو اور باہر آؤ.....'' کہتے ہوئے شیر گل نے اُس کے گریبان کو جھٹکا دے کر اُسے باہر پھینک دیا تھا۔
اگلے ہی لمحے اس کے ساتھیوں نے ایمبولینس کا دروازہ کھول کر اُس میں موجود عارف اور اس کے ساتھی کو ہاتھ کھڑے کروا کر باہر نکال لیا تھا۔
''یہ کون ہے؟'' شیر گل نے سٹریچر سے بندھے نفیس میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔
''مریض ہے۔'' عارف نے کہا۔
''بکواس کرتے ہیں یہ..... مجھے اغواء کر کے قتل کرنے کے لئے لے جا رہے تھے..... پکڑ لو ان درندوں کو یہ بابا صاحب کے خونخوار ساتھی ہیں۔''
نفیس میاں کی زبان پوری قوت سے چل رہی تھی۔
''کھولو اسے۔'' شیر گل نے عارف اور اس کے ساتھی کو حکم دیا۔
''دیکھو تم لوگ ہمیں نہیں جانتے شاید اس شہر میں نئے آئے ہو۔ تم مارے جاؤ گے۔ ہمارے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ پولیس چیف صاحب سے فون پر ہماری بات کروا دو۔ ورنہ تم سب نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

عارف نے اپنی دانست میں اُنہیں ڈانٹ پلائی۔

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے شیر گل نے اُس کی اس بات کا جواب اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے دیا۔

تھپڑ مارنے کا انداز تو بڑا جارحانہ تھا لیکن عارف کو بہت کم چوٹ محسوس ہوئی۔

''زیادہ بکواس کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔'' اُس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''تم بہت پچھتاؤ گے..... بابا صاحب تمہارے جسم سے ماس علیحدہ کروا سکتے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے۔''

عارف کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

''اسے باہر لے جاؤ، تم کھولو اسے۔'' شیر گل نے اپنے ساتھیوں کو عارف کو باہر ڈرائیور کے پاس لے جانے اور اس کے ساتھی کو نفیس میاں کی رسیاں کھولنے کا حکم دیا۔ اگلے ہی لمحے نفیس میاں آزاد تھے۔

شیر گل کا ایک ساتھی اُنہیں جیپ کی طرف لے گیا۔ عارف اور اس کے دونوں ساتھی ہاتھ اوپر کئے ایک طرف کھڑے تھے۔ جب سڑک پر اُنہیں ایک ٹرک اس طرف آتا دکھائی دیا۔

''بھاگو۔'' اچانک ہی عارف چلایا۔

اس کے ساتھ ہی عارف نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر وہ بھی اس کے تعاقب میں سڑک عبور کر گئے۔

منصوبے کے مطابق پہلے شیر گل اور اس کے ساتھی اُنہیں ''رک جاؤ..... رُک جاؤ۔'' للکارتے رہے جب وہ پستولوں کی رینج سے باہر ہو گئے تو انہوں نے تینوں کے تعاقب میں ہوائی فائرنگ شروع کر دی پھر اُن کا تعاقب بھی شروع ہو گیا۔

لیکن.....!

رات کے اندھیرے میں عارف اور اُن کے ساتھی سیکورٹی والوں کو جُل دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

●

بابا صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

چیل کے منہ سے کوئی شکار چھین کر لے جائے تو بھی اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو حالت اس وقت بابا صاحب کی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اُنہیں اور بہت سے سانحوں کا سامنا تو رہا تھا۔

لیکن.....!

یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ایسا بکرا جسے ذبح کرنے کے لئے انہوں نے زمین پر گرا رکھا ہوا اور تکبیر پڑھ کر اس پر چھری پھیرنے کی تیاری کر رہے ہوں لیکن اسے کوئی دوسرا چھین کر لے جائے۔

یہ حرکت جس نے بھی کی تھی اس کے متعلق بابا صاحب غلط فہمی کا شکار نہیں رہے تھے۔ اس سیکورٹی ایجنسی کے افسرِ اعلیٰ کے اُن کے شہر میں تقرر سے پہلے ہی اس کی حبُ الوطنی کی کہانیاں اُس کے خاندانی پس منظر سمیت بابا صاحب کو پہنچ چکی تھیں۔

انہوں نے اپنی دانست میں اسے معمولی بات جانا تھا۔ اس شہر میں نجانے کتنے محبِ الوطن اس سے پہلے آئے تھے۔ جو اَب اُن کے ٹکڑوں پر پلتے اور اُن کے اشاروں پر بندروں کی طرح ناچ رہے تھے۔

انہوں نے تو یہی سوچا تھا کہ یہ افسرِ اعلیٰ کس باغ کی مولی ہے اس کے بڑے اُن کی چوکھٹ پر سجدہ ریز رہتے ہیں۔

لیکن.....!

یہ شخص اچانک اُنہیں اس طرح دھچکا لگا دے گا؟

یہ تو بابا صاحب نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔ ان کے شیطانی ذہن نے اس کی کئی تاویلیں تلاش کی تھیں بالآخر ان کے شیطانی ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ ضرور یہ شخص اپنی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہے کیونکہ اُس کی اس شہر میں تعیناتی کے بعد سے انہوں نے اس کے ساتھ کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ نہیں کیا تھا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے فون اُٹھایا اور اپنی سیکرٹری کو حکم دیا کہ منی جان سے فوراً ملاقات کا اہتمام کیا جائے۔

دو گھنٹے بعد منی جان اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔

اُسے بطورِ خاص اس کمرے میں بٹھایا گیا تھا جہاں بابا صاحب کے ساتھ ملنے والوں کے متعلق اگر کسی کو غلطی سے بھی علم ہو جاتا تو اُس کی آنکھیں نکال کر اُس کی زبان کاٹ دی جاتی تھی۔

اس شہر میں بمشکل چار پانچ ایسے لوگ تھے جو بابا صاحب کے ساتھ بطورِ خاص اس کمرے میں ملا کرتے تھے۔

''کیسی ہو منی جان!'' بابا صاحب نے کمرے میں گھستے ہی اپنی ہونٹوں پر ندیدے بچوں کی طرح زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مہربانیوں کے صدقے جی رہے ہیں بابا صاحب۔''

منی جان نے جو اس شہر کی سب سے بڑی طوائف تھی جواب میں گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

منی جان تھی تو طوائف لیکن بڑی بڑی شریف زادیاں اور شریف زادے اُس کا پانی بھرتے تھے۔ جس طرح سیاست میں بابا صاحب کو مقام حاصل تھا اسی طرح سرکار دربار میں منی جان کو رسائی حاصل تھی۔ بڑے بڑے افسر تو محض اس کا حوالہ دینے پر ہی رام ہو جایا کرتے تھے۔ کئی وزراء اور شرفاء تو اس کے محض ایک دیدار

کی تمنا میں ہی اُس کے ہر جائز ناجائز کام کرنے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے چکر میں رہتے تھے۔

کون سا ایسا سرکاری اور غیر سرکاری حلقہ تھا جہاں تک منی جان کو رسائی حاصل نہیں تھی۔ کئی غیر ملکی سفارت خانوں میں اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ امیر زادوں کے بگڑے ہوئے بچے اُسے لاکھوں روپے رشوت دے کر غیر ممالک کے ویزے لگوایا کرتے تھے۔

لیکن.....!

ایک بابا صاحب کی شخصیت ایسی تھی جس کے سامنے منی جان کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے اپنے طور پر اس شہر میں بابا صاحب کی تنظیم کا جال توڑ کر اپنا لوہا منوانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن.....!

اس کا حاصل سوائے ذلت، پشیمانی اور مستقل خوف کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی اس شہر میں بابا صاحب کی اجازت کے بغیر ہوا بھی اپنا رخ نہیں بدل سکتی۔ بابا صاحب کے ہر جائز ناجائز حکم پر وہ کاروں میں سجی پلاسٹک کی گڑیوں کی طرح سر ہلاتی رہتی تھی۔

اس کی قوت اس شہر کے اعلیٰ خاندانوں کی وہ لڑکیاں تھیں جو کسی نہ کسی چکر میں اُس کے جال میں پھنس کر اب کٹھ پتلیوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچا کرتی تھیں۔ اُن کی ہر جائز ناجائز خواہش منی جان پوری کرتی تھی اور منی جان کی خواہش اُن کے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

جس مگرمچھ کو رام کرنا ہوتا اس کی حیثیت کے مطابق منی جان اپنی فاحشاؤں کی فوج سے کسی ایک فاحشہ کو اس افسر پر چھوڑ دیا کرتی تھی۔ آج تک اُس نے ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اپنے اس بزنس میں وہ یکتائے روزگار تھی۔

اس شہر میں آنے والے کسی بھی سرکاری محکمے کے اعلیٰ ترین افسر سے تعلقات قائم کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور اب تو اُس نے بڑے سائنٹیفک انداز میں اپنا کام شروع کر رکھا تھا۔ وہ اس شہر میں آنے والے کسی بھی اعلیٰ افسر سے اُس کی آمد کے چند دنوں کے اندر ہی اندر اپنی کسی فاحشہ کے ذریعے تعلقات گانٹھ لیا کرتی تھی پھر اس افسر سے متعلق گاہکوں کی تلاش میں لگ جاتی تھی۔

لیکن.....!

چند روز پہلے ہی اُسے زندگی کی سب سے اہم ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ جب اس نے سیکورٹی ایجنسی کے حال ہی میں چارج سنبھالنے والے افسرِ اعلیٰ پر اپنی ایک تیز طرار لڑکی کے ذریعے جس کا تعلق اس شہر کے بہت بڑے خاندان سے تھا، سنہری جال پھینکا تو نہ صرف اُس لڑکی کو منہ پر طمانچہ کھانا پڑا بلکہ اس افسرِ اعلیٰ نے کم از کم اپنی حد تک اس کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا تھا۔

منی جان نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے اور خود سرکار دربار میں حاضری دے کر اپنی پرانی اور موجودہ خدمات کی دہائی دیتے ہوئے انصاف چاہا۔

لیکن.....!

ہر جگہ اسے ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ ایک وزیر صاحب جس سے منی جان کے ذاتی مراسم اس وقت سے قائم تھے جب وہ محض ایک ڈرگ سمگلر ہوا کرتے تھے اور جن کے ذریعے اُس نے بڑے بڑے ناممکن کام ممکن کر دکھائے تھے جب اس نے مدد کی اپیل کی اور اُنہیں بتایا کہ یہ اس کے لئے زندگی موت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ زندگی میں اس نوعیت کی ذلت تو اُس نے اُن دنوں میں نہیں اُٹھائی تھی جب وہ خود اس شہر کی عام سی جسم فروش عورت تھی اب تو اُس کا مقام ہی کچھ اور تھا۔

ساری رُوداد سُننے کے بعد وزیر موصوف نے فوراً مرکز سے رابطہ کیا اور چاہا کہ اس نوجوان افسر کا جغرافیہ معلوم کرے۔ دوسری طرف سے اُسے جو کچھ کہا گیا اس کا اندازہ ٹیلی فون سُنتے ہوئے اس کے چہرے سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

منی جان کو اپنے قدموں تلے زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔

وزیر موصوف نے ٹیلی فون کریڈل پر رکھنے کے بعد سب سے پہلے اپنے میز کی دراز میں رکھی گولیوں کی شیشی سے ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی اور قدرے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔

''منی جان تم کہاں جا پھنسیں..... یہ معاملہ اپنے کیا بلکہ اس شہر میں کسی کے بس کا نہیں۔ یہ نوجوان کوئی عام سا افسر نہیں ہے جانتی ہو یہ کس کا بیٹا ہے۔''

جواب میں جس شخصیت کا نام اُس نے لیا اُسے سننے کے فوراً بعد منی جان کو احساس ہو گیا کہ اُس نے غلطی سے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا ہے اب اُس کی انگلیاں مکمل رہ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد سے اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا کہ آئندہ کبھی بھول کر اس واقعے کو یاد بھی نہیں کرے گی۔ اب جو اچانک بابا صاحب نے کہا۔

''بھئی کون ہے یہ لونڈا..... یہ سیکورٹی ایجنسی والا..... نیا آیا ہے بڑے پر پُرزے نکال رہا ہے۔''

منی جان کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے دل پر زور سے گھونسا مارا ہو۔

''بابا صاحب! میں اُس کے ہاتھ دیکھ چکی ہوں۔ منی جان نے زندگی میں کبھی ہار تسلیم نہیں کی لیکن یہ بڑی بلا ہے۔ اس کمبخت نے تو مجھے بھی نچا کر رکھ دیا ہے۔ بابا صاحب میں آپ کی کنیز ہوں آج تک آپ کے کسی حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کیا آپ کے ایک اشارے پر اپنی گردن کٹوا سکتی ہوں لیکن اس معاملے میں بہت مجبور ہوں۔''

اس نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

بابا صاحب کو علم تھا کہ ان کے کسی حکم کے سامنے منی جان کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ آج تک اس کے منہ سے انہوں نے ''ناں'' کا لفظ نہیں سنا تھا۔ اب جو منی جان بھی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اُن کا مقابلہ کسی عام سے افسرِ اعلیٰ سے نہیں ہے۔

''منی جان..... کیا یہ واقعی تم بول رہی ہو..... تم بھی.....'' بابا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بابا صاحب.....!'' کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ ایک حادثے کی وجہ سے جب میری ایک لڑکی اس سے ٹکرائی تو مجھے کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا۔ بابا صاحب آپ جانتے ہیں منی جان نے کبھی خود کو مجبور نہیں جانا..... کبھی نہیں، لیکن حیرت ہے۔ خود مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس ملک میں..... یہاں تو کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ خدا جانے.....''

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''ٹھیک ہے منی جان اب ہمیں خود ہی معاملات کو دیکھنا ہوگا۔'' بابا صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''بابا صاحب! اگر میری بات مانیں تو جتنی جلد ممکن ہے اُسے خلاص ہی کروا دیں..... جتنی جلدی ممکن ہو۔''

منی جان کی تشویش کا اندازہ بابا صاحب کے لئے کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

''ارے چھوڑو منی جان لعنت بھیجو دیکھ لیں گے اسے بھی، تم سناؤ آج کل کوئی نیا مال آیا ہے یا نہیں۔''

بابا صاحب انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر مزید بات کر کے منی جان کو اپنی کمزوری کا احساس دلائے۔

''آپ حکم دیجئے بابا صاحب۔'' منی جان نے آنکھ دبائی۔

''اری حکم کیا..... بس آج ہی کوئی اچھا سا مال بھیج دو ناں۔''

اتنا کہہ کر بابا صاحب کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آج اُسے اتنی ہی بات کرنی تھی۔ منی جان نے کھڑی ہو کر اُسے فرشی سلام کیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

بابا صاحب اَب کچھ اور سوچ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اُن کے آستانے پر پرویز بھائی اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

''اُسے مار ڈالو..... ابھی سے مار ڈالو..... سانپ کا پھن اٹھانے سے پہلے ہی سر کچل دیا جائے تو ہی بہتر رہتا ہے اور یہ تو پھن اُٹھا ہی چکا ہے۔''

اس نے دیوانہ وار قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر بابا صاحب..... اس کے متعلق ہمارے پاس بھی کوئی اچھی رپورٹس نہیں ہیں۔''

پرویز بھائی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''لیکن اس بات کا خیال رہے کہ میں اس سلسلے میں سرکار کی طرف سے کسی بک بک جھک جھک کا سامنا نہیں کرنا چاہتا..... مجھے تمہاری بات بات پر صفائیاں پیش

کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

بابا صاحب نے کہا۔

''آپ مطمئن رہئے بابا صاحب اس سلسلے میں ہم اپنے دوستوں کی مدد لیں گے۔ آخر انہیں کس دن کے لئے رکھا ہے۔'' پرویز بھائی نے کہا۔

''پرویز بھائی ذرا خیال سے..... میں کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

دونوں شیطان منصوبہ بندی کرتے رہے جس کے بعد انہوں نے اپنے تین چار اور شیطان جمع کئے جس کے بعد بابا صاحب کی طرف سے پریس کے لئے بیان جاری کیا گیا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ اُن کی ایک ایمبولینس پر مسلح حملہ آوروں نے روک کر حملہ کیا۔ تنظیم کے رضا کار بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حملہ آوروں نے انہیں دھمکی دی ہے کہ وہ تنظیم کے میڈیکل یونٹ کی ایمبولینس نہیں چلنے دیں گے۔

بابا صاحب نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ ایسے سماج دشمن عناصر جو اُن کی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہیں، سے حکومت آہنی ہاتھوں سے نمٹے اور تنظیم کی ویلفیئر سرگرمیوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔

اس بیان میں کہیں بھی نفیس میاں کا ذکر نہیں تھا۔

یہ بابا صاحب کی سیاسی زندگی کا پہلا دن تھا جس میں انہوں نے سیکورٹی ایجنسی یا مخالف تنظیم پر کوئی الزام نہیں لگایا تھا۔

نفیس میاں کے متعلق بیان اُسی روز شام کو اُن کے گھر والوں کی طرف سے جاری ہوا۔ اس پریس کانفرنس کا انعقاد بڑی ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا تھا۔

پرویز بھائی نے خود فون کر کے اخبار نویسوں کو طلب کیا تھا۔

پریس کانفرنس میں مسز نفیس نے بھرائی ہوئی آواز میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ اُن کے شوہر گزشتہ تین روز سے غائب ہیں اور آج اُن کی طرف سے پیغام ملا ہے کہ اُنہیں اغواء کر لیا گیا ہے۔

''اغواء کرنے والوں نے اپنی کوئی شناخت یا ڈیمانڈ بتائی ہے۔'' ایک اخبار نویس نے سوال کیا۔

''بدقسمتی تو یہی ہے کہ نفیس میاں کو ڈاکوؤں یا مخالفین نے نہیں بلکہ سیکورٹی ایجنسی کے لوگوں نے اغواء کیا ہے۔'' اس سوال کا جواب مسز نفیس کے بجائے پرویز بھائی نے دیا تھا۔

مسز نفیس تو ڈبڈباتی آنکھوں سے ٹکر ٹکر کبھی اخبار نویسوں اور کبھی تنظیم کے ان کارکنوں کی طرف دیکھتی رہیں جو موت کے فرشتوں کی طرح ان کے سر پر مسلط تھے۔

انہیں آج صبح ہی بابا صاحب کی طرف سے حکم ملا تھا کہ ان کے لئے جس پریس کانفرنس کا اہتمام کیا جا رہا ہے اس کا مقصد دراصل کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی پرویز بھائی اور رخسانہ بطور خاص اُن سے ملنے آئے تھے ایک لکھا ہوا بیان اُنہیں تھماتے ہوئے ہدایت کی کہ انہیں یہ بیان پریس کانفرنس میں پڑھنا ہے اور

اخبار نویسوں کی طرف سے اوّل تو کسی کی جرأت نہیں کہ اُن سے کوئی سوال ہی کرے۔ ایک آدھ سوال جو ہوگا اُس کا جواب انہیں نہیں دینا اور وہ بھی انہیں سمجھا دیا گیا تھا۔

''مسز نفیس آپ خود سمجھدار خاتون ہیں۔ میں ایک عورت ہونے کے ناطے آپ کو یہی مشورہ دوں گی کہ فی الوقت آپ وہی کریں جس کی ہدایت تنظیم کی طرف سے آپ کو ملے۔ اسی میں آپ کی بقا ہے۔ میں آپ کو بابا صاحب کی طرف سے یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ نے بابا صاحب کے احکامات پر عمل کیا تو نفیس میاں جلد ہی بخیر و عافیت گھر واپس لوٹ آئیں گے۔ بصورتِ دیگر ہم اُن کی سلامتی کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔''

مسز نفیس سیدھی سادی عورت.....!

اُسے تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اس کے ہونہار میاں نے کیا کیا گل کھلا رکھے ہیں۔ اپنے خاوند کی بری عادتوں کا تجربہ اُسے شادی کے چند سال بعد ہی ہو گیا تھا۔

وہ کوئی زیادہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔

لیکن.....!

اپنے خاوند کے کرتوت اُس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ جس تنظیم سے اس کے خاوند کا تعلق ہے۔ ماضی میں تو شاید وہ کوئی سیاسی تنظیم رہی ہو لیکن اب وہ ایک مافیا کی شکل اختیار کر چکی ہے اور مافیا کے اپنے اصول ہوتے ہیں..... یہاں لوگ آتے تو اپنی مرضی سے ہیں لیکن جانا ان کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتا۔

اُسے ابھی تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے خاوند کو کس نے اغواء کیا ہے۔ بس یہ اندازہ ضرور تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اب اُسے آنکھیں بند کر کے اس وقت تک بابا صاحب کے احکامات پر عمل کرنا تھا جب تک کہ اُسے اپنے خاوند کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی مزید ہدایت نہ مل جاتی کیونکہ فی الوقت یہی لوگ اس کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔

پریس کانفرنس میں کوئی ایسا سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جو تنظیم کے بڑوں کی طبع نازک میں گراں گزرتا ہو۔

پریس کانفرنس ختم ہو گئی اور نفیس میاں کے گھر والوں کی حفاظت کے لئے تنظیم کے رضا کاروں نے یہاں ڈیرے جما لئے۔

●●●

قدرت کے کھیل

بجوار شاہ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج اس کے دوستوں نے واقعی اُسے خوش کر دیا تھا۔ ''را'' کی طرف سے اُسے ایسے تحائف اکثر ملتے رہتے تھے۔

لیکن.....!

اس سے پہلے وہ زندگی میں کبھی کسی عورت سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا جتنا اس سندرنی نے اُسے کیا تھا۔ سندرنی کا تعلق کس ملک سے تھا؟ کس شہر سے تھا؟ بجوار شاہ کو اس سے کوئی بحث نہیں تھی نہ ہی اُس نے کبھی کچھ پوچھنے یا جاننے کی کوشش کی۔ وہ زندگی کی ہر ساعت کو رنگین بنانا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا خواہ اُس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

جب کبھی ایسا خاص مہمان اس کے لئے لایا جاتا تو بجوار شاہ بطور خاص اپنی خصوصی حویلی میں جشن عیش و عشرت منعقد کیا کرتا تھا۔ یہ حویلی گوٹھ کے ایک کونے پر قلعے کی صورت قائم تھی۔ جس کی دیواروں اور فصیلوں پر ہر وقت مسلح پہریدار موجود رہتے تھے۔

بجوار شاہ کے خصوصی مہمانوں کے لئے ہی اس حویلی کے دروازے کھلتے تھے اور جب بجوار شاہ یہاں ہوتا تھا تو کسی کو حویلی کے نزدیک پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

لیکن.....!

اس روز عجیب حادثہ ہوا۔

منشی حویلی کے باہر والے حصے میں بیٹھا تھا جب پہریداروں نے اچانک ہی بہاول کی آمد کی اطلاع دی۔

''یہ کہاں آ گیا؟'' منشی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''سائیں! اس کے چار بندے بھی ساتھ ہیں اور وہ رُکنے والا نہیں لگتا۔'' پہریدار نے کہا۔

منشی کے لئے بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ ان حالات میں اس کے لئے بجوار شاہ سے بہاول ڈاکو کی ملاقات کروانا ناممکن تھا۔

لیکن.....!

یہ بلا ٹلنے والی نہیں تھی۔

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس طرح اچانک بہاول اُن سے ملنے آ گیا ہو۔ ضرور کوئی خاص بات ہی ہوگی۔ اس نے سوچا لیکن وہ ڈرے بجوار شاہ کو کس طرح یہ

اطلاع پہنچائے۔ اُس کی مصروفیات میں مخل ہونے کا مطلب بھی موت کو آواز دینا تھا۔ جبکہ بہاول کو انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

منشی کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ بن گیا تھا۔

ابھی وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے جب اچانک سامنے والا دروازہ کھلا اور بہاول اپنے چار مسلح ساتھیوں سمیت اندر گھس آیا۔

''سلام سائیں بہاول! کیسے ہو؟ بابا خیر تو ہے کیسے آئے ہو اچانک..... نہ کوئی خبر نہ کوئی اطلاع۔'' منشی نے چرب زبانی سے خود کو سنبھالنا چاہا۔

''منشی صاحب بابا! وڈیرے بجوار شاہ کو فوراً اطلاع دو میرا اس وقت ملنا بہت ضروری ہے۔''

آج بہاول بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''بابا بہاول! بیٹھو سائیں! آرام کرو۔ بندوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں صبح ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' منشی نے چاہا کہ کم از کم یہ وقت تو ٹال دے۔

''مجھے صبح واپس ڈیرے پر پہنچنا ہے..... وہاں تمہارے باپ آ چکے ہیں..... فوج آ گئی ہے۔ وڈیرے شاہ صاحب کو بلاؤ ورنہ ہم خود ملتے ہیں۔''

بہاول کی آواز کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات بھی بدلنے لگے تھے۔

''بابا بہاول تم ہوش میں تو ہو..... کس سے بات کر رہے ہو کچھ خبر ہے کیا۔''

منشی کے لئے اس کا یہ لہجہ ناقابل برداشت تھا۔

''میں تو ہوش میں ہوں..... البتہ تم نے اگر چند منٹ میں ملاقات نہ کروائی تو شاید تمہارے ہوش و حواس گم ہو جائیں۔''

بہاول نے یہ کہتے ہوئے اپنے کندھے سے لٹکتی کلاشنکوف کو ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

منشی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

ایک زمانہ دیکھا بھالا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سامنے وہ ڈاکو کھڑا ہے جس نے محض ایک وڈیرے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اس کے لئے انسانی جان کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟ یوں بھی آخر وہ حرام موت کیوں مرے؟ اگر اس کا کوئی لین دین تھا تو وڈیرے بجوار شاہ کے ساتھ ہو گا۔ اس کے ساتھ تو نہیں ہے پھر وہ کیوں یہ بلا اپنے سر ڈالے۔

''اچھا بابا..... ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں وڈیرے سے۔ تم جانتے ہو اس حویلی میں سائیں کسی سے نہیں ملتا..... بابا کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔''

منشی نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

منشی کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے..... پاگل ہو گیا ہے۔'' بہاول نے اب بندوق باقاعدہ اس کی طرف سیدھی کر لی تھی۔

''چلتا ہوں سائیں..... چلتا ہوں۔''

منشی بادلِ نخواستہ اُس کمرے کی طرف تو آ گیا تھا جہاں بجوار شاہ مصروفِ عیاشی تھا لیکن اب دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت اُسے نہیں ہو رہی تھی۔

دل کڑا کر کے اُس نے بالآخر دروازہ کھٹکھٹا ہی دیا۔

کمرے میں موجود بجوار شاہ نے دروازے پر آہٹ سن کر یوں محسوس کیا جیسے کسی نے اُس کے دماغ پر ہتھوڑا چلا دیا ہو۔

اُسے اپنے کانوں پر اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک کہ تین چار مرتبہ منشی نے دروازہ نہیں کھٹکھٹا لیا۔

بجوار شاہ غصے میں پاگل ہو کر پلنگ سے اُٹھا اور اسی حالت میں دروازہ کھول دیا۔ لڑکی سہم کر ایک کونے میں دبک گئی تھی۔

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی منشی اس کے قدموں میں گر گیا۔

''سائیں! خدا کے لئے مجھے کچھ نہ کہنا۔ بہاول نے بندوق کی نوک پر مجھے یہاں بھیجا ہے۔ وہ باہر انتظار گاہ میں بیٹھا ہے اپنے بندوں کے ساتھ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے آپ کو اطلاع نہ دی تو مجھے گولی مار دے گا۔ سائیں! اس کے تیور خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ آج تک میں نے اُسے اس حالت میں نہیں دیکھا۔''

''بند کرو بک بک.....'' بجوار شاہ نے منشی کو اتنی زور سے ڈانٹا کہ منشی کا دل ہی نہیں برآمدے کی چھت بھی کانپ اُٹھی۔

''کہاں ہے وہ کتے کا پلا.....'' بجوار شاہ نے پوچھا۔

''سائیں! باہر کھڑا ہے۔ میں بھلا اُسے یہاں آنے کی اجازت دے سکتا تھا۔''

منشی نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

''چلو!''

منشی اور بجوار شاہ جب باہر والی بیٹھک میں پہنچے تو وڈیرے بجوار شاہ کا سارا غصہ ہرن ہو گیا یہاں بہاول اپنے چار ساتھیوں سمیت موجود تھا۔

''سلام سائیں.....'' بہاول نے اُسے سلام تو کیا تھا لیکن اس کے لہجے سے بغاوت کی بُو آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے بابا بہاول اتنی رات گئے کیا مصیبت آ گئی تھی جو اس طرح بغیر اطلاع کے تم منہ اُٹھا کر چلے آئے ہو۔'' بجوار شاہ نے بہرحال اپنی اکڑ برقرار رکھی۔

''سائیں بات ہی ایسی تھی..... یہ مجھ اکیلے کا مسئلہ نہیں اور جہاں تک اطلاع دے کر آنے کی بات ہے تو اب حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ چاروں طرف پکی ملٹری بیٹھی ہے کوئی راستہ محفوظ نہیں رہا۔''

''اچھا! اچھا! بات کرو..... کیا بات ہے۔'' بجوار شاہ نے بے نیازی سے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روک دیا۔

''سائیں! یہ جو میرے ساتھی ہیں انہیں تو تم جانتے ہو ناں..... وڈیرہ سیفل نے شہر سے جو بندے اغواء کرائے تھے اب اُن کو لینے کے لئے اپنا قاصد بھیج دیا ہے۔ سائیں یہ لوگ دوسری گوٹھ کے ہیں۔ ان کے تین ساتھی اب تک مارے جا چکے ہیں۔ اپنی جان پر کھیل کر انہوں نے وڈیرہ سیفل کے کہنے پر بندے اغواء کئے اور پھر انہیں سنبھال کر رکھا۔ آپ تو جانتے ہیں سائیں کہ ہم نے بندوں کی وجہ سے اب تک کتنے ٹھکانے بدلے ہیں لیکن اب وڈیرہ سیفل بغیر کچھ لئے دیئے اپنے بندے واپس مانگ رہا ہے۔ سائیں! یہ تو ظلم کی بات ہے اب اس نے دھمکی بھی دے دی ہے..... سائیں آپ کا خیال نہ ہوتا تو ہم اس کا جواب دینے کے بعد آپ سے رابطہ کرتے لیکن میرے مجبور کرنے پر یہ لوگ ابھی تک رُکے ہوئے ہیں۔''

جیسے جیسے بہاول بات کر رہا تھا وڈیرہ ہجوار شاہ کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ اس کا شیطانی ذہن اچانک ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔ اُسے بھی وڈیرہ سیفل پر بہت غصہ تھا۔ حرام خور سارا مال اکیلا ہڑپ کر جاتا تھا اور بڑے شکار کی بچی کھچی ہڈیاں اُس کے سامنے پھینک دیا کرتا تھا۔

ہجوار شاہ سے زیادہ کسی وڈیرے کے ڈاکوؤں سے روابط نہیں تھے اور اس علاقے کے بڑے بڑے ڈاکو اس کی مٹھی میں تھے۔ اس کی وجہ سے وڈیرہ سیفل بھارتی اٹیلی جنس کو لوٹ رہا تھا۔ ٹھیک ہے وہ علیحدگی کی تحریک کا سرغنہ تھا لیکن اس تحریک میں اُس کے ساتھ کتنے لوگ تھے؟ انگلیوں پر ان کی تعداد گنی جا سکتی تھی۔ اس کا سارا سیاسی گورکھ دھندہ وڈیرہ ہجوار شاہ کے کندھوں پر چل رہا تھا۔ یہ ہجوار شاہ تھا جو اُن کے جلسوں کی رونق بڑھانے کے لئے اپنے مریدوں کو بھیجا کرتا تھا۔

اور.....!

یہ ہجوار شاہ ہی تھا جو اُن کے دشمنوں کو خوفزدہ کرنے، ہنگامہ آرائی، لوٹ مار، قتل و غارت کے لئے اپنے تخریب کار دیا کرتا تھا۔

جب سب کچھ وہ کرتا ہے تو اُسے حصہ برابر کیوں نہیں ملتا؟

ٹھیک ہے ایک تیر سے دو شکار کرتا ہوں۔ اس نے سوچا۔ اُسے بیک وقت وڈیرہ سیفل اور بہاول دونوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ بہاول کی کوئی بھی مجبوری رہی ہو لیکن اس کی یہ حرکت ہجوار شاہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اُس نے منشی کے سامنے جو زبان بولی تھی ایسی زبان سُننے کی عادت ہجوار شاہ خود کو نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی نقل کل کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔

ہجوار شاہ خود کو اس علاقے کا بلاشرکت غیرے مالک اور یہاں کے مکینوں کو اپنا غلام سمجھتا تھا۔ اس کے بزرگ بھی ان لوگوں سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے چلے آ رہے تھے اب صدیوں کی یہ روایت وہ کیوں توڑے۔

وہ فوراً ہی ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

●

''بہاول تم میرے ساتھ آؤ۔ ابھی اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہئے..... اپنے بندوں کو یہاں بٹھاؤ..... منشی ان کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرو..... بیچارے

بہت تھک گئے ہیں۔"

اُس نے بہاول کو اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

بہاول نے اپنے ساتھیوں کو آنکھ کے اشارے سے مستعد رہنے کی تلقین کی اور سجوار شاہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"بیٹھو.....!" سجوار شاہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بہاول بیٹھ گیا۔

یہ اس کی پہلی باقاعدہ بغاوت تھی۔

آج تک اس علاقے کے کسی مکین کی جرأت نہیں تھی کہ وڈیرے سجوار شاہ کے برابر بیٹھ سکے۔ وڈیرا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اُس نے اپنے پاس دھرے موبائل فون پر کوئی نمبر ملایا تھا..... دوسری طرف سے فون اُٹھائے جانے پر اُس نے کہا۔

"وڈیرہ سہفل سائیں کو جگاؤ..... میں سجوار شاہ بول رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وڈیرہ سہفل لائن پر تھا۔

سجوار شاہ نے اس سے کچھ باتیں کیں جن میں زیادہ حوالہ بہاول کا تھا اُس نے فون پر یہ نہیں بتایا کہ بہاول اس کے پاس بیٹھا ہے۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا وہ سنتے ہوئے وڈیرہ سجوار شاہ کبھی کبھی مسکرانے لگتا تھا جس بات کا علم بہاول کو نہ ہو سکا وہ فون پر انگریزی میں ہونے والی گفتگو تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے فون بند کر دیا۔

"بہاول بابا میری بات غور سے سُن لو۔"

"حکم سائیں۔" بہاول کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"بابا! یہ وڈیرہ سہفل کچھ زیادہ ہی اُونچا اڑنے لگا ہے۔ اس نے دو پارٹیوں سے پیسہ لے کر کھا لیا ہے اور اب ہم کو دھوکہ دے رہا ہے۔" اُس نے بہاول کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو غلط بات ہے سائیں۔"

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں بابا..... سجوار شاہ بولا۔

"سائیں! یہ معاملہ مجھ اکیلے کے بس کا نہیں..... اس میں اور بھی لوگ....."

"بابا بہاول! تم چھوڑو ان باتوں کو اور میری بات غور سے سنو..... ابھی یرغمالیوں کو اپنے پاس رکھو..... اور ہاں وڈیرہ سہفل کو اس غداری کا سبق ضرور سکھانا ہے۔

بہاول وڈیرہ سیفل کو قتل کر دو۔"

"اُس کی بات کے آخر میں بہاول کا چونک اُٹھنا بالکل فطری تھا۔

"میں سمجھا نہیں سائیں۔"

"تم نے کیا کوئی اور زبان بولنا شروع کر دی ہے۔ اس میں نہ سمجھنے والی بات کوئی نہیں۔ چاروں یرغمالیوں کو ہمارے بندوں کی حفاظت میں دے دو۔ تمہیں وڈیرہ سیفل کے ٹھکانے تک ہم پہنچا دیں گے۔ تمہیں وہاں سے گوٹھ تک واپس پہنچا جائیں گے۔"

"اور ہاں..... ایک لاکھ روپیہ تم ایڈوانس رکھ لو۔ یرغمالیوں کی رقم میں سے آدھا آدھا کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے سائیں جیسا مرشد کا حکم۔"

بہاول نے کچھ دیر بعد گردن ہلاتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ یہاں آمد پر جس طرح طیش زدہ دکھائی دے رہا تھا اب اتنا ہی تابعدار بنا ہوا تھا۔

●

"منشی..... تم ادھر آؤ....."

بہاول اور اس کے ساتھیوں کی روانگی کے بعد بجوار شاہ نے منشی کو طلب کیا۔

"جی سائیں۔"

"بابا! کل صبح کے بعد میری فورس کمانڈر سے میٹنگ کا بندوبست کر دو اور کل رات کو کیا نام ہے اس کا وہ نکڑی..... بہاول کی بیٹی..... اُسے ڈیرے پر پہنچا دینا اُس کی شادی کا قصہ بھی نمٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔ بہاول بے چارے کو بہت فکر لگی رہتی ہے اس کی..... اس کی زندگی میں نکڑی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو ہی اچھی بات ہے..... ہے ناں۔"

وڈیرہ بجوار شاہ کے ہونٹوں پر وحشیانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اس کی آنکھیں خون پینے والے درندوں کی سی ہو رہی تھیں۔ جنہیں عرصے بعد تازہ خون میسر آیا ہو۔

اُس نے بہاول کو اس گستاخی کی سخت سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جاری ہے...

رات کا باقی حصہ وڈیرہ ہجوار شاہ نے سندرنی کے ساتھ معمول کے مطابق گزارا۔ وہ آنے والے لمحات کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وڈیرہ سیفل کے بعد ساری کمان عملاً اُسے منتقل ہو جاتی اور اس علاقے میں کوئی ایسا ڈاکو نہیں تھا جو اس کے ساتھ کسی یرغمالی کی سودے بازی سے گریز کی جرأت کرتا۔

وڈیرہ سیفل ایک ہی وقت میں بھارتی انٹیلی جنس ''را'' اور مقامی یرغمالیوں کے لواحقین ہی کو دونوں ہاتھوں سے نہیں لوٹ رہا تھا بلکہ ڈاکوؤں سے بھی باقاعدہ حصہ وصول کر رہا تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ سب کچھ ہجوار شاہ کے اختیار میں ہوتا۔

صبح وہ دن چڑھے تک بدمستی کی نیند سوتا رہا۔

دن چڑھے جب وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا تو فشی کی طرف سے اُسے مقامی فورس کمانڈر کے ساتھ دوپہر کے بعد میٹنگ کی اطلاع مل گئی تھی۔ ہجوار شاہ کی پُرزور درخواست پر مقامی فورس کمانڈر نے اس کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

اس علاقے میں امن و امان کی بحالی اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے اُسے بہرحال ہجوار شاہ کا تعاون درکار تھا۔

دوپہر کو جب فورس کمانڈر ہجوار شاہ کے ڈیرے پر پہنچا تو یہاں کے ماحول نے اُسے خاصا متاثر کیا۔

جس بڑے ہال کمرے میں کھانے کی میز سجائی گئی تھی۔ وہاں انواع و اقسام کے کھانوں کے علاوہ دیواروں پر جا بجا قرآنی آیات بھی سجائی ہوئی تھیں۔ جن سے بظاہر ہجوار شاہ کے مذہبی رجحان کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ منافقت میں ہجوار شاہ کو کمال حاصل تھا۔ وہ مقامی سیاست کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور وقتاً فوقتاً ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہتا تھا۔

''جناب والا! ہم تو سائیں اپنی جان مُلکی سلامتی کے لئے دینے کو تیار ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہر کام کا کریڈٹ وڈیرہ ہاشم لے جاتا ہے اور ہم سرکاری کاغذات میں دشمن ہی سمجھے جاتے ہیں..... سائیں! میں نے آپ کو دینے کے لئے دو تین بڑے سرپرائز رکھے ہیں۔ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی..... سائیں! بہاول ڈاکو تک میرے بندوں نے رسائی حاصل کر لی ہے۔ ابھی ہم اس کو کسی چکر سے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے..... شیر کا شکار کچھار سے باہر نکال کر ہی کیا جاتا ہے ناں..... سائیں! بڑا خطرناک ڈاکو ہے۔ دہشت پھیلا رکھی ہے اس نے سارے علاقے میں۔ مجھے آپ کا تعاون اور دوستی درکار ہوگی۔''

اس نے بالآخر فورس کمانڈر کو اعتماد میں لاتے ہوئے کہا۔

''ہجوار شاہ صاحب! اگر آپ ملک و قوم کے لئے امن و امان کی بحالی کے لئے اور ڈاکوؤں کے خاتمے کے لئے ہمارے ساتھ تعاون کریں گے تو ہمیں اپنا دوست ہی پائیں گے۔ ہم یہاں قتل و غارت کے لئے نہیں بلکہ دشمن کی پیدا کردہ ریشہ دوانیوں کے خاتمے اور مقامی آبادی کو تحفظ دینے کے لئے آئے ہیں۔ ہماری طرف سے ہر ڈاکو کے لئے یہ آفر موجود ہے کہ اگر وہ غیر مشروط ہتھیار ڈال دے تو ہم اُسے ماریں گے نہیں بلکہ قانون کے حوالے کر دیں گے۔ ہجوار شاہ صاحب میں آپ

کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پانی اب سر سے اونچا ہو رہا ہے اور ہمیں آہنی ہاتھوں کے ساتھ ڈاکوؤں سے نمٹنے کا حکم ملا ہے لیکن میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ کسی بے گناہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور ہم ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ ہمارے اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں بے گناہ شہری مارے جائیں۔ اگر تم بہاول کو گرفتار کرا دیتے ہو تو میں ذاتی طور پر تمہاری سفارش حکومت سے کروں گا۔"

فورس کمانڈر بڑا دھیمے مزاج کا نوجوان آفیسر تھا۔ اُس نے ہجوار شاہ کی اس پیشکش پر کسی جذباتی پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ قانون کی بالادستی بہرحال قائم رکھنا چاہتا تھا۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق ہجوار شاہ بھی کوئی نیک نام وڈیرہ نہیں تھا اور یہ بات تو فورس کمانڈر کو بھی سمجھ آ رہی تھی کہ ہجوار شاہ ضرور اس چکر میں اپنا بھی کوئی مطلب نکالے گا۔

"سائیں! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ حکومت کو ہمارے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں وہ ختم ہو جائیں۔ بابا! ہم اس علاقے کے رئیس ہیں اور اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم اپنی حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے..... ہجوار شاہ ہم تمہارے ساتھ اس مسئلے پر تعاون کریں گے۔"

فورس کمانڈر باتوں سے زیادہ عمل میں یقین رکھتا تھا۔

"سائیں! بہاول خطرناک آدمی ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ جرائم میں تعاون کے لئے رابطہ کیا ہے اور بڑی اچھی پیش کش بھی کی ہے۔ اس ضمن میں اُسے ہم دھوکہ سے بلائیں گے اور اپنا کام کریں گے..... جہاں اُسے شک گزرا کہ ہم نے فوج کا تعاون لیا ہے وہ خونخوار درندے کی طرح تباہی کا دیوتا بن جائے گا اور ہم بے گناہ لوگوں کو مروانا نہیں چاہتے۔ مجھے اپنے بندوں پر اعتماد ہے کہ وہ خود بہاول کو قابو کر لیں گے۔ اگر زندہ نہ پکڑ سکے تو مار ضرور ڈالیں گے۔ یوں بھی اس کے سر کی قیمت شاید پانچ لاکھ روپے سرکاری طور پر ہے۔ ہم آپ سے رابطہ رکھیں گے اور ضرورت پڑنے پر آپ کا تعاون حاصل کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

فورس کمانڈر کو آم کھانے سے مطلب تھا گٹھلیاں گننے سے نہیں۔ بہاول کا شمار اُن ڈاکوؤں میں ہوتا تھا جن کو مارنے کے خصوصی احکامات انہیں ملے تھے۔ تھوڑی دیر بعد فورس کمانڈر رخصت ہو گئے۔

●

"منشی بابا! آج نکڑی کو پہنچا دینا۔"

وڈیرہ سائیں ہجوار شاہ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"بھلو سائیں..... بھلو۔"

منشی اپنے سائیں کا حکم سمجھ گیا تھا۔ اس کا سائیں بہاول کو ذلت کی موت مارنے پر تُل گیا تھا۔

اس رات جب ایک طرف وڈیرے ہجوار شاہ کا ہرکارہ بہاول کو سیفل کے قتل کا سگنل دینے جا رہا تھا وہاں دوسری طرف منشی اپنے آدمیوں کے ساتھ بہاول کی نوجوان بیٹی نگڑی کو اٹھا کر ہجوار شاہ کے ڈیرے کی طرف لے جا رہا تھا۔

اسے یہی بتایا گیا تھا کہ اُسے اپنے باپ سے ملاقات کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ اکثر وہ اس طرح کبھی اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی اکیلی اپنے ڈاکو باپ سے ملنے جایا کرتی تھی۔ آج بھی وہ بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ اُسے اپنے باپ سے ملانے لے جایا جا رہا ہے۔ منشی اُسے حویلی میں پہنچا کر اب فون پر ہجوار شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے اس کے باپ سے نمٹ لوں پھر اس کے ساتھ جشن مناؤں گا۔''

ہجوار شاہ نے قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

بہاول کے ساتھ ہجوار شاہ کے دو آدمی تھے اور جیپ نزدیکی گوٹھ کی طرف جا رہی تھی جہاں ہجوار شاہ نے وڈیرہ سیفل کو شراب و شباب کی ایک خصوصی محفل میں مدعو کیا تھا۔

ایسی شامیں یہ لوگ اکثر ایک دوسرے کے لئے منعقد کرتے رہتے تھے۔ وڈیرہ سیفل اسے معمول کی کارروائی سمجھ کر ایک باڈی گارڈ کے ساتھ اس طرف آ رہا تھا جیسے ہی اس کی جیپ نے گوٹھ کی طرف جانے والی ذیلی کچی سڑک کا موڑ کاٹا..... جیپ کو زور سے دھچکا لگا۔ اچانک ہی ڈرائیور کے سامنے ایک درخت کی بڑی سی شاخ آ گری تھی۔ یہ درخت اس کچی سڑک کے کنارے موجود تھا جس پر بیٹھا ایک شخص بڑی دیر سے اس جیپ کے آگے کوئی شاخ گرانے کا منتظر بیٹھا تھا۔

جیسے ہی ڈرائیور نے سنبھل کر درخت کی طرف دیکھا اوپر بیٹھے شخص نے ان پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی بہاول اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی بندوقوں سے شعلے اُگلنے شروع کئے اور چند منٹ ہی میں وڈیرہ سیفل اپنے دونوں ساتھیوں سمیت خون میں نہا گیا۔

حملہ آور جس جیپ میں آئے تھے اب اس میں سوار ہو کر واپس جا رہے تھے۔ پندرہ منٹ کے سفر کے بعد انہوں نے سڑک کے کنارے ایک ڈیرے کے نزدیک جیپ کی اور بہاول سے یہاں اُترنے کو کہا۔

''یہ کون سی جگہ ہے۔'' بہاول نے حیرانگی سے پوچھا۔

''نیچے اُترو..... ابھی علم ہو جائے گا۔'' ڈرائیور نے اچانک اس کی طرف پستول تان لیا۔

بہاول نے چاہا کہ اپنی بندوق سنبھالے۔

لیکن.....!

اُس کی بندوق پر بجوار شاہ کا دوسرا آدمی قابض تھا۔ بہاول چکرا کر ہی رہ گیا۔

''دھوکہ!'' اُس کے کانوں اور دماغ میں ایک ہی لفظ بار بار گونج پیدا کرنے لگا تھا۔

''نیچے اُترو۔'' دونوں نے اس کی طرف بندوقیں تان کر کہا۔

بہاول کے لئے فی الوقت اُن کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ نیچے اُتر آیا۔ دونوں اُسے بندوق کی نوک پر ڈیرے کے اندر لے گئے جہاں وڈیرہ بجوار شاہ اُس کا منتظر تھا۔

''سناؤ بہاول بابا کام ہو گیا.....'' اُس نے بندوق برداروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا بہاول..... فوج علاقے میں آ گئی ہے۔ میں نے سوچا تم نے اگر مرنا ہی ہے تو کسی اور کے ہاتھوں کیوں مرو؟ ہمارے ہاتھوں لگائے ہوئے پودے کا پھل کوئی دوسرا کیوں کھائے۔ یہ تو ناانصافی ہوئی ناں۔''

بجوار شاہ نے دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بجوار شاہ! تو کتے کی موت مرے گا۔ میری بات یاد رکھنا اور ہاں تم یہ حسرت ہی دل میں لے کر مر جاؤ گے کہ بہاول تم سے رحم کی بھیک مانگے گا۔ بجوار شاہ میں نے جس روز ہتھیار اٹھائے تھے اُس روز سے ہی موت کو گلے لگائے ہوئے پھر رہا ہوں۔ افسوس میں نے تجھ جیسے ذلیل انسان کو پہچاننے میں غلطی کی۔''

''تو نے ایک اور غلطی بھی کی ہے بہاول جو ناقابل معافی تھی۔ تو نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔''

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ بہاول نے چاہا کہ اچانک اس پر چھلانگ لگائے۔

لیکن.....!

اُس کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ بجوار شاہ کے ساتھی اس سے زیادہ ہوشیار تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر درجنوں گولیاں اس کے جسم سے پار ہو گئیں۔

''تم لوگ جاؤ، یہاں صرف ڈرائیور اور منشی کو چھوڑ دو۔'' بجوار شاہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

اُن لوگوں کی روانگی کے فوراً بعد ہی اُس نے فورس کمانڈر سے ٹیلی فون پر رابطہ کر کے انہیں یہاں آنے کے لئے کہا تھا۔

''سائیں ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا ملزم زندہ آپ کو نہ دے سکے چلئے جو کام کسی اور نے کرنا تھا وہ ہم نے کر دیا۔''

اُس نے فون پر ہی کہا۔

فورس کمانڈر کے وہاں پہنچنے تک مقامی پریس کے نمائندے اور فوٹو گرافر بھی وہاں آ گئے تھے۔ بجوار شاہ نے بڑی کامیابی سے سارا ڈرامہ سٹیج کیا تھا۔

فورس کمانڈر کو اس بات کی سمجھ تو آ گئی تھی کہ بجوار شاہ نے سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت کیا ہے۔ پھر بھی اس کے لئے یہ بات کم از کم قابل اطمینان رہی تھی کہ

ایک شیطان کے ہاتھوں ہی سہی دوسرے شیطان کا خاتمہ تو ہوا۔

اس رات بجوار شاہ نے بہاول کی بیٹی کو بے آبرو کر کے اپنی فتح کا جشن منایا۔ اس نے اپنی درندگی کی تسکین ہر پہلو سے کر لی تھی اور اب مطمئن ہو کر شراب کے نشے میں دُھت بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔

بہاول کی بیٹی دوسرے بستر پر اپنی بے بسی کے آنسو بہا رہی تھی جب اچانک ہی اس پر وحشت کا دورہ پڑا۔

کمرے کی دیوار پر ٹنگی کلہاڑی اُس نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامی اور شیطان کی صورت پر نظر دوڑائی۔

یہ وہ درندہ تھا جس کے لئے اس کے باپ نے اس علاقے کے لوگوں کی زندگی جہنم بنا دی تھی۔ اُس کے ایک اشارے پر نکڑی کا باپ خون کے دریا بہا دیا کرتا تھا۔

اس احسان فراموش وحشی نے آج اپنے محسن کی بیٹی کو بے آبرو کر دیا تھا۔

اُس کے باپ کو مار ڈالا تھا اور بڑے تکبر سے اُسے یہ خبر بھی دے دی تھی۔

''بجوار شاہ! بہاول کی بیٹی اتنی مجبور نہیں ہوئی۔ زندہ تو میں نے اب رہنا نہیں لیکن تو بھی زندہ نہیں بچے گا.....'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

اُس کے دل میں موجود ساری نفرت اس کے ہاتھوں میں قوت بن کر سمٹ آئی تھی۔

اچانک ہی اُس نے کلہاڑا ہوا میں بلند کیا اور پوری قوت سے اس کا پھل بجوار شاہ کی گردن میں اُتار دیا۔

خون فوارے کی طرح اس کی گردن سے یوں اُبلا جیسے ذبح ہونے والے بکرے کی گردن پر چھری چلانے سے بہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی نکڑی پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے چیختے چلاتے ہوئے دیوانہ وار بجوار شاہ کے جسم پر کلہاڑی کے وار کرنے شروع کر دیئے۔ یوں لگتا جیسے وہ اس کے جسم کا قیمہ ہی کر ڈالے گی..... نجانے کب تک وہ اس کے مردہ جسم پر کلہاڑی چلاتی رہی۔

نکڑی کا سانس پھولنے لگا تھا۔

خون میں لت پت وحشی درندے پر نظر ڈال کر اُس نے نفرت سے بجوار شاہ کے مردہ جسم پر تھوک دیا اور اُسی حالت میں بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی۔ حویلی کے دروازے تک کوئی پہریدار اُس کے راستے میں نہیں آیا۔ دروازے پر موجود پہریداروں نے اُسے اس حالت میں دیکھا تو ایک لمحے کے لئے گھبرا گئے۔

بہاول ڈاکو کی بیٹی دروازے سے باہر نکل گئی۔

خوفزدہ پہرے دار جب تک سنبھلتے وہ دُور جا چکی تھی۔ عین اُن لمحات میں جب منشی اور دوسرے ملازمین بجوار شاہ کی ناقابلِ شناخت لاش کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے بہاول کی بیٹی تیزی سے اُس گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جس کا انجن اُسے دور سے آتا دکھائی دینے لگا تھا۔

اُس نے حویلی سے ریلوے لائن تک کا ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ اسی دیوانگی کے عالم میں کیا تھا اور اب باوقار موت کو گلے لگانے جا رہی تھی۔

تیز رفتار گاڑی کے انجن نے چند سیکنڈ میں اُسے زندگی کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔

صبح تک فورس کمانڈر کو ساری کہانی سمجھ آ چکی تھی کیونکہ وڈیرے سفل کی موت کی خبر بھی اُسے رات ہی مل گئی تھی۔ اس نے کڑی سے کڑی ملا کر سارا معمہ حل کر لیا تھا۔

اُس کا ایمان اس بات پر مزید مستحکم ہو گیا تھا کہ خدا اس ملک کی بہر صورت حفاظت کرے گا۔ دونوں غداروں کی موت مکافاتِ عمل ہی کا نتیجہ تھا۔ اگر ان میں کوئی ایک بھی قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے ہاتھوں مارا جاتا تو سندھ موومنٹ کے ورکرز کے جذباتی طوفان کا رُخ ''را'' پاکستانی فوج کی طرف موڑ دیتی اور ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

صبح کے اخبارات نے رات کو ہونے والی چار موتوں کی کہانی کو حقائق کے ساتھ بیان کر دیا۔ سندھ موومنٹ کے دو لیڈروں کا اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں مارے جانا یہاں کے سادہ لوح لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کافی تھا کہ خدا کے نام پر حاصل کردہ اس مملکت کی حفاظت سے اُس کے حکمران تو غافل رہ سکتے ہیں قدرت کبھی غفلت نہیں برت سکتی۔

●●●

اور پھر.....!

رخسانہ نے حسبِ سابق گرمجوشی سے اُس سے معانقہ کر کے عارف کا استقبال کیا تھا۔ ایمبولینس کے باقی دونوں رضا کاروں نے بتایا تھا کہ وہ عارف میاں کی دلیری کی وجہ سے ہی جان بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں ورنہ وہ لوگ انہیں مار ڈالتے۔

''ایمبولینس مل گئی کیا۔'' عارف نے پہلا سوال کیا تھا۔

''ہاں! حیرت کی بات ہے کہ ہماری اطلاعات کی حد تک کسی بھی سرکاری ایجنسی نے اس کارروائی کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے۔'' رخسانہ نے اُسے بتایا۔

''مس رخسانہ آپ تو جانتی ہیں کہ ایسی کارروائیوں کی ذمہ داری کوئی نہیں لیا کرتا۔ میرے خیال کے مطابق اب مرکزی حکومت میں موجود ہمارے ذرائع کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں رہے۔ میرے ساتھی بھی اس بات کی گواہی دیں گے کہ جب نفیس میاں کو اغواء کیا جا رہا تھا تو وہاں سے رینجرز کی گاڑی گزری لیکن اُن لوگوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ہمارے راستے میں جانے کتنے ناکوں پر پولیس موجود رہتی ہے اور خاص طور پر جہاں سے نفیس میاں کو اغواء کیا گیا وہاں سے کسی سویلین گروپ کا کوئی کارروائی کرنا ناممکن ہے۔ یہ سراسر سرکاری کارروائی تھی اور سیکورٹی ایجنسی والوں نے کی ہے..... ان لوگوں کو ہمارے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے..... اور ہاں آپ کو شاید علم رہا ہو کہ ذاکر بھائی والے کیس والا انسپکٹر جو ''آستانے'' سے بھاگ گیا تھا اس سیکورٹی ایجنسی میں افسر لگا ہوا ہے۔ اب آپ جان لیجئے کہ یہ لوگ ہمارے خلاف کیا نہیں کرتے ہوں گے۔''

عارف جانتا تھا کہ رخسانہ کے ذریعے جو بات ''باباصاحب'' تک پہنچے گی وہ زیادہ معتبر خیال کی جائے گی۔ وہ تنظیم کے تمام ذمہ داروں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے برگشتہ کرنے اور آپس میں ٹکرا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا اور اپنی تمام توانائیاں اُس نے اس کے لئے وقف کر دی تھیں۔''

''سب مارے جائیں گے..... باباصاحب کے سب دشمن ایک ایک کر کے مارے جائیں گے۔ یہ بے وقوف لوگ نہیں جانتے انہیں پُراسرار قوتوں کی مدد اور راہنمائی حاصل ہے۔''

رخسانہ جب یہ اول جلول بک رہی تھی تو اس پر عجیب سی دیوانگی طاری تھی۔

عارف بھی پورے جوش و خروش سے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

''ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔''

''کیا؟'' عارف نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے جن لوگوں نے نفیس میاں کو اغواء کیا ہے وہ پہلے سے اُس کی آمد سے باخبر رہے ہوں گے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نفیس میاں نے خود اُنہیں خود پر ٹوٹنے والی قیامت سے مطلع کر کے مدد کی اپیل کی ہے۔ ضرور کسی اور نے یہ کام کیا ہے جس کے بعد اُن لوگوں نے نفیس میاں کو اغواء کیا ہوگا۔''

رخسانہ نے یہ بات گو کہ اُس کی طرف دیکھے بغیر کہی تھی لیکن ایک لمحے کے لئے تو عارف کو اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتے محسوس ہوئی۔ پھر وہ سنبھل گیا۔

شیر گل نے یقیناً اس مفروضے پر نظر رکھی ہوگی۔ اُسے یاد آ گیا کہ اس کا دوست بڑا ذہین آفیسر تھا۔

''پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا مس رخسانہ لیکن بعد میں حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ کارروائی اتفاقیہ تھی۔'' اس نے سنبھل کر کہا۔

''وہ کیسے؟'' رخسانہ نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں کوئی بات بھی اُسے خلافِ معمول دکھائی نہیں دی۔

''وہ یوں کہ اس روز شہر میں مختلف جگہ چار ایمبولینسوں کو روک کر اُن کی تلاشی لی گئی۔ یہ تو حسنِ اتفاق تھا کہ ہمارے والی ایمبولینس میں نفیس میاں موجود تھا اور باقی ایمبولینسوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی ورنہ وہاں بھی وہ کسی نہ کسی کو قابو کر لیتے..... میں تو بڑے غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کارروائی اچانک عمل میں آئی ہے اور کسی طے شدہ منصوبے کا حصہ معلوم نہیں ہوتی۔''

عارف نے بظاہر رخسانہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

لیکن.....!

رخسانہ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے چند لمحوں کے لئے بڑی گہری نظروں سے عارف کا جائزہ لیا اور پھر اچانک اس کا موڈ معمول کے مطابق رومانٹک ہو گیا۔

''بہت ہوشیار ہو گئے ہو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے عارف کو آنکھ ماردی۔

''حالات نے کر دیا ہے۔ ہمارا مشن ہی ایسا ہے کہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کو تو علم ہے کہ کسی کی معمولی سی غلطی سے بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ میں تو اب اپنے ساتھ کسی مشن پر جانے والوں کے متعلق بھی پہلے پوری معلومات حاصل کرتا ہوں۔ میرا تو مشورہ ہے اگر آپ بابا صاحب تک پہنچا سکیں تو تنظیم کے لئے بہت سود مند ہوگا چاہے کسی کو بُرا ہی لگے لیکن اہم ذمہ داریوں پر متمکن عہدیداروں کی مکمل سکریننگ کی جائے اور یہ کام بلا استثنیٰ ہونا چاہئے کسی رورعایت کے بغیر..... میرے خیال سے اب یہ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔''

''میری جان! تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن بابا صاحب کے سامنے کبھی ناصح بننے کی غلطی نہ کرنا۔ اُن کا موڈ بگڑنے لگے تو معمولی سی بات پر بگڑ جاتا ہے۔ خصوصاً اُس وقت جب کوئی اُنہیں مشورہ دینے کی کوشش کرے۔''

یہ بات رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہی تھی لیکن بات کی تہہ میں چھپی دھمکی نما نصیحت کو عارف نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

''میرے خیال میں اُن کی یہ سوچ بالکل بجا ہے۔ رخسانہ صاحبہ ایک بابا صاحب کی ذات ہی تو ہے جس کے دم قدم سے ہماری کمیونٹی کی آج اس ملک میں عزت ہے۔ یہ تنظیم کا سارا ڈھانچہ اُن کی ذاتی سوچ کا مرہونِ منت ہے۔ آج ہم جس مضبوط سیاسی عمارت میں بیٹھے ہیں اُس کی ایک ایک اینٹ کو بابا صاحب نے اپنی ذاتی محنت سے دیواروں میں چُنا تھا۔ کم از کم مجھے تو پوری تنظیم کیا بلکہ سارے ملک میں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آ رہا جو اُنہیں مشورہ دے سکے..... جو بات میں نے کی ہے وہ خدانخواستہ مشورے والی بات نہیں وہ تو بابا صاحب کے لئے ایک ادنیٰ سے جانثار کے ذاتی جذبات ہیں۔''

عارف بھی نہلے پہ دہلا ثابت ہو رہا تھا۔

بات سے بات نکالنے کا فن اُس نے بخوبی سیکھ لیا تھا۔ وہ کم از کم اس تنظیم سے متعلق ماہر نفسیات بن چکا تھا۔ اُسے علم ہو جاتا تھا کہ کس کارکن کے دماغ میں کون سا کیڑا بیٹھا ہے اور اُسے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کے فن میں کمال حاصل ہو گیا تھا۔

رخسانہ کو آج تو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے عارف میاں اُس سے بڑے بابا صاحب کے عاشق اور جانثار ہیں اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی شاید بابا صاحب کے لئے وقت آنے پر جان کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔

اس نے عارف کے لئے چائے اپنے ہاتھوں سے بنا کر پیش کی تھی اور اب دونوں چائے کی پیالیاں ہونٹوں سے لگائے ایک دوسرے کو شہوت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جب اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور بابو بھائی اندر آ گیا۔

بابو بھائی بابا صاحب کا ذاتی باڈی گارڈ تھا اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں احتراماً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''ارے بیٹھو بی بی! ہم بے چارے اس قابل کہاں ہیں اور ہاں کیا حال ہے عارف میاں میں تمہارے کام ہی سے آیا تھا۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے عارف میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت بابو بھائی۔ ہم اس قابل کہاں کہ آپ کی نظروں میں کوئی جا پا سکیں۔''

عارف نے دل کے چور کو بظاہر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''بھئی آج کل تو ہر طرف تمہارے ہی چرچے ہیں میاں صاحبزادے۔ اب جس طرح تم دلیری سے دونوں لونڈوں کو سیکورٹی والوں کے نرغے سے بچا لائے ہو اس کے بعد سے تو ہمارے نزدیک تمہاری حیثیت ہیرو کی سی ہو گئی ہے۔ یوں تو رخسانہ بی بی کو کالیا سے بچا لانا ہی تمہارا بڑا عظیم کارنامہ ہے..... بھئی بہت اونچے اُڑنے لگے ہو۔''

بابو بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بابو بھائی۔ ہم تو بابا صاحب کے ادنیٰ سے جانثار ہیں..... اپنی تو زندگی ہی بابا صاحب کے نام لگی ہے۔'' عارف نے بھی دانت نکال دیئے۔

''اچھا یار میں اہم کام تو بھول ہی گیا تھا۔ بابا صاحب نے کہا تھا کہ رخسانہ بی بی تم سے فوراً رابطہ کریں لیکن تم تو یہیں موجود ہو۔ میں انہیں مطلع کر کے واپس آتا ہوں۔''

بابو بھائی اتنا کہہ کر واپس چلے گئے۔

''بڑے خوش قسمت ہو عارف میاں اب بابا صاحب نے تجھے باقاعدہ یاد کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔''

رخسانہ نے بابو بھائی کے جانے کے بعد اس سے کہا۔

دونوں نے چائے ختم کر کے ابھی پیالیاں میز پر رکھی ہی تھیں کہ دوبارہ بابو بھائی اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ وہاں آ گیا۔

''دونوں کو بابا صاحب نے طلب فرمایا ہے۔'' اُس کے حکم سنانے کے انداز نے ایک مرتبہ تو عارف کو ہلا کر رکھ دیا۔

''چلو بھئی! چلتے ہیں۔''

رخسانہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ عارف میاں کے لئے سوائے اس حکم کی تعمیل کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

دونوں بابو بھائی اور اس کے ساتھی کے تعاقب میں چلتے جب بابا صاحب کے کمرے میں پہنچے تو یہاں شیطانوں کی پوری منڈلی موجود تھی۔ پرویز بھائی تنظیم کے تین چار خونخوار درندوں کے ساتھ بابا صاحب کے نزدیک بیٹھا تھا۔

عارف ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا پھر سنبھل گیا۔ اس نے بالکل نارمل انداز میں سب کو تعظیم دی اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

''دروازہ بند کر دو۔''

بابا صاحب نے بابو بھائی سے کہا۔ جو دروازہ بند کر کے باہر پہرے پر کھڑا ہو گیا۔

''کیسی ہو مس رخسانہ!'' اچانک پرویز بھائی نے اپنا رُخ اُس کی طرف بدلا۔ یہ اُس کی ہمت تھی جو بابا صاحب کے سامنے اُسے اتنی بے تکلفی سے بلا رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اُس نے پرویز بھائی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس کے جواب دینے کے انداز میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا۔

''ذرا اپنی گاڑی کی چابی تو دینا۔'' اس مرتبہ بابا صاحب نے خود اُسے مخاطب کیا شاید وہ اب پرویز بھائی کو موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

رخسانہ نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر اپنے پرس سے چابیاں نکال کر بابا صاحب کو تھما دیں۔

''دراصل پرویز بھائی کو شک ہو گیا ہے۔ شاید انٹیلی جنس والوں نے کوئی چکر چلایا ہے۔ ہم اپنے اطمینان کے لئے حفظ ماتقدم کے لئے کچھ تو کریں۔''

یہ کہتے ہوئے بابا صاحب نے چابیوں کا گچھا اپنے پہلو میں بیٹھے پرویز بھائی کو تھما دیا۔

''منے تم جاؤ اور مس رخسانہ کی گاڑی میں موجود انسٹا فون اُٹھالاؤ۔''

پرویز بھائی نے اپنے ایک ساتھی کو چابیاں تھماتے ہوئے براہِ راست عارف کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

عارف کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس نے کمال ضبط سے اپنے اوسان بحال رکھے ہوئے تھے۔

''بہت محتاط رہنا ہوگا تم لوگوں کو۔ یہ سیکورٹی والوں کا افسرِ اعلیٰ بڑا سخت آدمی لگتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔''

بابا صاحب نے اُن سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

منا تھوڑی دیر بعد رخسانہ کی گاڑی سے انسٹا فون لے آیا جو اس نے پرویز بھائی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

پرویز بھائی نے سب کے سامنے ایک پیچ کس کی مدد سے فون کھولا اور چھوٹا سا گیجٹ جو عارف نے اس میں نصب کیا تھا نکال کر بابا صاحب کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

عارف کو اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

●●●

انکشاف اور.....

''یہ کیا ہے؟'' بابا صاحب نے حیرانگی سے پوچھا۔

''اس فون پر ہونے والی تمام گفتگو انٹیلی جنس والوں کے علم میں ہوتی ہے۔ بابا صاحب! اور آپ جانتے ہیں کہ اس فون پر کس نوعیت کی بات چیت ہوتی ہوگی۔ رخسانہ سے عام ورکر تو بات کرنے کی ہمت ہی نہیں کر پاتا۔ اب آپ کو علم ہو گیا ہوگا کہ ہمارے راز کس طرح افشا ہو رہے ہیں اور کارروائی سے پہلے ہی پولیس ہمارے کارکنوں پر کس طرح گرفت حاصل کر لیتی ہے۔ بابا صاحب! ابھی اس ملک کی پولیس اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو کارروائی کرنے سے پہلے ہی پکڑ لے۔ نہ ہی ہماری تربیت کا معیار اتنا گھٹیا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے ہی پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں۔ یہ تو کوئی گھر کا بھیدی ہے جو ہماری لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔''

پرویز بھائی نے دورانِ گفتگو ایک مرتبہ بھی عارف کی طرف نہیں دیکھا تھا اور اس بات سے اُسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے بڑی ہمت سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا تھا۔

اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ پرویز بھائی اور رخسانہ ایک دوسرے کے لئے نیک جذبات نہیں رکھتے جہاں پرویز بھائی کو اس بات کا غصہ رہتا تھا کہ رخسانہ نے بابا صاحب کا قرب حاصل کر رکھا ہے اور ان کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ وہاں رخسانہ کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ تنظیم کے نام پر آئے روز لاکھوں روپے بزورِ طاقت بڑے بڑے سیٹھوں سے حاصل کر کے پرویز بھائی اکیلا ہی ہڑپ کر جاتا تھا اور ایک دو مرتبہ اس نے اشارے کنایے سے بابا صاحب کے کانوں تک یہ شکایت پہنچانے کی کوشش بھی کی تھی، بابا صاحب نے اس کا کچھ خاص اثر قبول نہیں کیا تھا۔

کیا یہ شخص اتنا بااثر ہے کہ بابا صاحب بھی اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرنے لگا ہے۔

چند روز پہلے ہی اُس نے عارف کے ساتھ دورانِ گفتگو یہ عندیہ ظاہر کیا تھا۔

عارف کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ پرویز بھائی نے اس کے اندازوں کے برعکس ابھی تک اُسے مشتبہ نہیں گردانا تھا۔ شاید اس نے یہ ڈرامہ ہی رخسانہ کو ذلیل کرنے کے لئے رچایا تھا۔

ان دونوں کو ہی آپس میں کیوں نہ ٹکرا دیا جائے۔

اس نے سوچا اور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

''پرویز بھائی میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتا کہ آپ سے کوئی سوال کرنے کی ہمت کروں لیکن معاملہ چونکہ تنظیم کا ہے جس کی بقا کے لئے ہماری جان بھی حاضر ہے

اور میں نہیں سمجھتا کہ اس مسئلے کو ہم اپنی انا کا مسئلہ بنالیں۔ مجھے آپ سے پہلی بات تو یہی پوچھنا ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات کب آئی؟''

اس نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے ہوا میں پہلا تیر چلایا۔

''دو تین روز پہلے..... ہمارے ایک خصوصی سورس نے بتایا کہ انٹیلی جنس والے تنظیم کی بڑی اہم گفتگو ریکارڈ کر رہے ہیں۔''

پرویز بھائی نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

عارف کے لئے یہاں صرف اس بات کی اہمیت تھی کہ کہیں بابا صاحب نے اُس کی بات کا بُرا نہیں مانا اور اس نے بابا صاحب کے چہرے سے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ انہوں نے اس کی حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

''ظاہر ہے آپ نے دو تین روز یہی جاننے کی کوشش کی ہوگی کہ ہمارے ہاں کس طرح سے یہ راز باہر جا رہے ہیں۔''

اس نے اگلا سوال داغا۔

''ہاں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انٹیلی جنس والوں نے ضرور مس رخسانہ کے فون میں کوئی خفیہ آلہ نصب کر دیا ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے ٹیلیفونوں کی اس نوعیت کی چیکنگ اپنے ذرائع سے مہینے میں ایک دو مرتبہ کرواتے رہتے ہیں کہ ہمارے فون ''بگ'' تو نہیں ہو رہے۔'' پرویز بھائی نے چڑ کر جواب دیا۔

''پرویز بھائی اگر آپ بُرا نہ مانیں اور میری نیت پر شک نہ کریں تو میں پھر یہی بات پوچھوں گا کہ آپ نے مس رخسانہ پر ہی کیوں شک کیا؟ آپ نے مجھ پر یا کسی اور پر شک کیوں نہ کیا..... ہم لوگ بھی اپنے فون کبھی چیک نہیں کرواتے۔''

اس نے دیکھا تھا کہ اس سوال پر رخسانہ کے چہرے پر زندگی دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

''میں بتاتی ہوں..... کیونکہ پرویز بھائی ایک عرصے سے مجھے بابا صاحب کی نظروں میں گرانے پر تلے ہوئے تھے اور اپنے اس مقصد میں انہیں اب بھی کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔''

اُس نے پرویز بھائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھئے بابا صاحب! مس رخسانہ زیادتی کر رہی ہیں..... میں نے ان پر کوئی الزام نہیں لگایا۔''

''پرویز بھائی یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ مہربانی میرے فون پر آپ ہی نے فرمائی ہو۔''

اُس نے پرویز بھائی کی بات کاٹتے ہوئے دوبارہ طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس بات کا علم سب ہی کو تھا کہ بابا صاحب کے سامنے اس قسم کی گفتگو اتنی بے باکی سے صرف رخسانہ ہی کر سکتی ہے۔

پرویز بھائی کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مس رخسانہ کا گلا ہی دبا دے۔

''بابا صاحب آپ دیکھ رہے ہیں اس نے میری.....''

''بھئی تم لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے..... تمہیں اس سنگینی کا احساس نہیں ہو رہا جو بیوقوفوں کی طرح آپس میں اُلجھنے لگے ہو..... یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ پرویز بھائی ڈھونڈو اُسے جس نے یہ حرکت کی ہے۔ اُس کا کھوج لگاؤ اور زمین کی ساتویں تہہ میں بھی چھپا ہے تو اُسے باہر نکالو۔ میں خود اس کے جسم سے چمڑی الگ کروں گا..... ہاں میں خود کروں گا..... اور ایک بات اور کان کھول کر سن لو۔ مجھے دو تین روز میں اس بات کا علم ہو جائے کہ ہماری آستین میں کونسا سانپ چھپا ہے پھر اس کے لئے سزا کا تعین بھی میں خود کروں گا..... پرویز بھائی تم تحریک کے تمام عہدیداروں کے فون چیک کراؤ..... فوراً..... آج شام سے پہلے یہ کام ہو جانا چاہئے۔ بہر صورت آج شام سے پہلے۔''

بابا صاحب نے خود مداخلت کر کے اس معاملے کو روکا۔ شاید وہ ان دونوں کی آپس میں دشمنی کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

اُسے احساس تھا کہ پرویز بھائی اور رخسانہ آپس میں ٹکرائیں گے، اُسے بہر صورت ان دونوں کے درمیان دیوار بننا تھا تاکہ اس طوفان کو روکے رکھے۔ اگر یہ دونوں آپس میں ٹکرا جاتے تو سب کچھ ملیامیٹ ہو جانے کا خطرہ موجود تھا۔

بابا صاحب کو احساس تھا کہ سیکورٹی ایجنسی کا نیا چیف کتنا ہوشیار آدمی ہے۔

عین ممکن ہے اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑانے کے لئے یہ سازش تیار کی ہو۔ پہلے رخسانہ کے فون میں گیجٹ فٹ کروایا۔ پھر پرویز بھائی کے ذریعے اُسے برآمد بھی کروا دیا۔

بابا صاحب پرلے درجے کا مکار آدمی تھا۔

اُسے غصہ آتا تھا لیکن وہ غصے میں اپنا نقصان کروانے کا قائل نہیں تھا۔

اُس نے جان لیا تھا کہ بنے بھائی کی موت کے بعد سے کچھ لوگوں نے پر پرزے نکالنے شروع کئے تھے۔

عین ممکن تھا کہ مستقبل میں یہ لوگ اُن کی برابری کے دعویدار ہوتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تنظیم میں اپنی اہمیت منوانے کے چکر میں لٹیا ہی ڈبو دیتے۔

یہ سب اس کے ہاتھوں کے تراشے صنم تھے۔

وہ اُنہیں اپنے برابر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اُس کی کامیابی کا راز ہی یہی تھا کہ اُس نے اپنا قد کاٹھ چالاکی اور چکر بازی سے اتنا بڑھا لیا تھا کہ تنظیم کے باقی لوگ اس کے سامنے بونے نظر آئیں۔

اُسے اس بات کا پتہ تو لگانا ہی تھا کہ اُن کی صفوں میں کونسا غدار گھس آیا ہے۔

لیکن.....!

اس کی کام کرنے کی بھی اپنی ترجیحات تھیں۔

سب سے پہلے اُسے اُن سیاسی بونوں کا خاتمہ کرنا تھا جو مستقبل میں اس کے لئے چیلنج بن سکتے۔

اُس نے نوٹ کیا تھا کہ نجی محافل میں بھی پرویز کی آواز اس کے سامنے کچھ زیادہ ہی بلند ہونے لگی تھی۔

اور.....!

یہ کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ نہ اس کے لئے نہ تنظیم کے لئے۔

جہاں تک رخسانہ کا تعلق تھا دنیا کی کوئی طاقت اس کی وفاداریوں کو نہیں بدل سکتی تھی نہ ہی کوئی اُسے رخسانہ سے گمراہ کر سکتا تھا۔

''اگر رخسانہ غدار تھی تو پھر تنظیم کو تباہ ہی ہو جانا چاہئے تھا۔'' اس نے سوچا۔

اُس کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا جلد ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

''میں خود دیکھوں گا اس معاملے کو..... رخسانہ تم بھی خیال رکھا کرو اور اپنی آنکھیں کھلی رکھو..... کچھ بھی ممکن ہے..... اور ہاں پرویز بھائی تنظیم کے بڑے ہیں ان کی عزت کرنا ہوگی سب کو۔''

اُس نے رخسانہ کی طرف گردن گھما کر کہا۔

پرویز بھائی کی گردن اکڑ گئی۔

لیکن.....!

رخسانہ بابا صاحب کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس فقرے کا مطلب بخوبی جانتی تھی۔ بابا صاحب نے اس کے راستے کا کانٹا صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''جو حکم بابا صاحب۔''

اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''پرویز بھائی تلاش جاری رہنی چاہئے۔ عارف میاں تم بھی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو۔''

بابا صاحب اُن سے مخاطب تھے۔

''ٹھیک ہے بابا صاحب آئندہ آپ کو کبھی کوئی ایسی اطلاع نہیں ملے گی۔''

عارف کے کلیجے پر دھری چٹان، اچانک اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اب اطمینان سے بات کرنے کے لائق ہو گیا تھا۔

اس نے دل میں نجانے اب تک کتنی مرتبہ اللہ کا شکر ادا کیا تھا جس نے آج عارف میاں کو مکھن سے بال کی طرح آنے والے عذاب سے نکال کر الگ رکھ دیا تھا۔

یہ خدا کا فضل ہی تھا کہ پرویز بھائی کا خیال اُس کی طرف نہیں گیا۔ حالانکہ تنظیم کے اکثر لوگوں کو اس کے ساتھ رخسانہ کے اچانک بڑھ جانے والے تعلقات کا علم تھا اور وہ سب اُس کے تئیں حسد بھی کرنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد شیطانوں کی یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

پرویز بھائی بظاہر پھولے نہیں سما رہا تھا کہ اس کے سامنے بابا صاحب نے پہلی مرتبہ رخسانہ کی بے عزتی کر دی تھی۔

اب اُسے یہ ثابت کرنا تھا کہ رخسانہ ہی دراصل انٹیلی جنس کی ایجنٹ بن کر بابا صاحب کا بیڑہ غرق کرنے پر تلی ہے اور یہی عزائم لے کر وہ یہاں سے جا رہا تھا۔

●

انسپکٹر فیروز اپنی گارد کے ساتھ مستعد تھا۔

ان لوگوں کو چند ماہ پہلے ہی یہ خصوصی ذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں۔ جس پر کم از کم وہ خوش نہیں تھے لیکن یہ خدمات بحری محافظ انجام دے ہی رہے تھے اور اس علاقے میں تو بطور خاص نیوی کی انٹیلی جنس ایجنسی سرگرم رہتی تھی۔

لیکن.....!

شاید سیکورٹی ڈبل کرنے کے لئے اُن کی ایجنسی کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے سے یہ خبریں عام تھیں کہ ہمسایہ ممالک سے تخریب کاری کے لئے جو اسلحہ اس شہر میں لایا جا رہا ہے وہ اسی سمندری راستے سے آتا ہے اور ساحلی علاقے سے پھر شہر میں تقسیم کرنے کے لئے لے جایا جاتا ہے۔

یہ خبر بھی تھی کہ کچھ ملک دشمن عناصر اپنی شکاری لانچوں کے ذریعے دشمن کے ایجنٹ اور تنظیم کے تربیت یافتہ ورکروں کو جو بھارت سے واپس آتے تھے یہاں تک پہنچا دیتے تھے۔

مرکز کی طرف سے ایسی خبروں کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے یہ کارروائی کی گئی تھی اور اب نیوی کے علاوہ دوسری سیکورٹی ایجنسیوں کو بھی طویل ساحلی پٹی پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایات جاری ہوئی تھیں۔

اس ساحلی علاقے میں ماہی گیروں کی بستیاں آباد تھیں اور وہ انہیں سمندری راستوں سے گزر کر شکار کے لئے جاتے تھے۔

شام ڈھل چکی تھی۔

سمندر بظاہر پرسکون لیکن اپنے سینے میں ہزاروں طوفان سمیٹے بہہ رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی لانچ کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید ماہی گیر گہرے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے چلے گئے تھے اور اب اُن کی واپسی صبح کے بعد ہی ہونے والی تھی۔

چاند کی آخری تاریخوں کے سبب شام ڈھلے ہی چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور انسپکٹر فیروز جیپ میں اپنے چار مسلح جوانوں کے ساتھ ساحل کے ساتھ ساتھ

گشت کر رہا تھا۔ اُن لوگوں نے جیپ ایک طرف کھڑی کر دی تھی اور اب ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تاحدِ نگاہ سوائے نیلے پانی کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا یا پھر اندھیرے کی وہ طویل چادر جو بالآخر پانیوں کا حصہ بن جاتی تھی۔

''میرے خیال میں یہیں رُک جاتے ہیں۔ آج موسم کے تیور بھی اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ نذیر یار ذرا چائے کا ایک کپ تو بوتل سے نکالنا۔''

انسپکٹر فیروز نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے کہا جس نے ''یس سر'' کہہ کر جیپ ہی میں موجود فلاسک سے چائے کا ایک کپ نکال کر اپنے آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ ابھی اُس نے دو تین گھونٹ چائے ہی پی تھی جب اچانک جیپ میں نصب وائرلیس ریڈیو میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔

اُس نے معمول کے مطابق ہی مائیک ہاتھ میں پکڑ کر آواز موصول کرنے والا بٹن دبایا تھا۔

لیکن.....!

دوسری طرف سے آنے والی آواز سُن کر ایک مرتبہ تو اُس کے ہاتھوں سے چائے کا کپ گرتے گرتے رہ گیا۔

یہ ملک صاحب تھے۔

اس کی ایجنسی کے مقامی افسرِ اعلیٰ..... آج تک اُس نے ڈھنگ سے ملک صاحب کی شکل نہیں دیکھی تھی وہ براہِ راست اُس سے مخاطب تھے۔

''ایس پی صاحب ہیں خاموش.....'' اُس نے مائیک پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

سب اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تن گئے۔

''پیٹرول سیون! ہمارے ایک سورس نے تھوڑی دیر پہلے شمال کی سمت آٹھ نو کلومیٹر کی دوری پر مشتبہ نقل و حرکت نوٹ کی ہے۔ فوراً وہاں پہنچو اور حالات کا جائزہ لو اور ہاں وہاں پہنچتے ہی مجھے رپورٹ کرو۔ میں خود لائن پر موجود ہوں۔ خبردار اگر کسی نے معمولی سی کوتاہی بھی کی..... میں بالکل برداشت نہیں کروں گا۔ شاباش بڑی مستعدی سے، ہوشیاری سے۔ اگر ضرورت ہو تو فوراً مجھ سے رابطہ کرو اور جس قسم کی بھی مدد درکار ہو مجھے بتاؤ۔ اگر مزید فورس درکار ہے تو بھی میں نے دو جیپوں کو ''سٹینڈ بائی'' کر دیا ہے..... او کے، وش یو آل دی بیسٹ۔ گو آہیڈ.....''

ملک اختر نے حکم دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کوئی خطرناک معاملہ ہے سر! ایس پی صاحب نے خود حکم دیا ہے تو ضرور کوئی اہم بات ہو گی۔'' اس کے حوالدار نے کہا۔

''چوکس ہو جاؤ..... یہی موقع ہوتا ہے اپنا آپ دکھانے کا۔ بیوقوفو! ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے..... اپنے کارکردگی دکھانے کے..... ہوشیاری سے بیٹھنا..... اپنی گنیں چیک کر لو..... ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں..... ہم خود مجرموں کو پکڑ سکتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے ڈرائیور کو جیپ بڑھانے کا اشارہ دیا۔

اپنی روانگی کا سگنل اُس نے کنٹرول روم کو دے کر بتا دیا تھا کہ اُن کی اگلی منزل کون سی ہے۔

کنٹرول روم میں اُس روز بطور خاص موجود ایس پی ملک اختر نے جب یہ پیغام سُنا تو وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

اس روز اس کے محکمے کے لوگ اپنے افسرِ اعلیٰ کی کارکردگی اور کام سے اس کی لگن دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے تھے۔

ملک اختر کی آمد اچانک خلاف توقع اور چونکا دینے والی تھی۔

ملک اختر نے آتے ہی کنٹرول روم کا رُخ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے دو جیپوں کو ہنگامی حالت میں مدد کی اپیل پر روانہ ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ ایس پی ملک اختر کو ضرور اپنے خصوصی ذرائع سے کوئی اطلاع ملی تھی اور یہ اتنی اہم اطلاع تھی جس پر کارروائی کرنے کے لئے وہ خود یہاں آ گیا تھا۔

اب یہ خصوصی آپریشن اس کی کمان میں ہو رہا تھا۔

جیپ کی روانگی کے قریباً پانچ سات منٹ بعد اُس نے اپنے کمرے کا رُخ اس ہدایت کے ساتھ کیا کہ دوسری طرف سے موصول ہونے والا ہر پیغام اُس تک پہنچایا جائے۔ اُس نے اپنے ماتحت عملے کے لئے ''ریڈ الرٹ'' کر دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ لوگ اس وقت تک اپنے گھروں کو نہیں جا سکتے جب تک اُن کا افسرِ اعلیٰ یہاں موجود تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا پھر اپنی میز کے کونے میں دھرے ٹیلیفونوں میں سے ایک اُٹھا کر اس پر ایک نمبر ملایا۔

دوسری طرف کال ملنے پر اُس نے دُکان کے مالک سیٹھ صاحب سے اپنے 'سوٹ' سے متعلق دریافت کیا کہ وہ سِل کر تیار ہوا ہے یا نہیں۔

''سر! کل تک مل جائے گا۔''

دوسری طرف سے جواب ملا۔

''بھئی سیٹھ صاحب مجھے فوراً چاہئے۔ گو آہیڈ۔''

اتنا کہہ کر اُس نے اس طرح فون بند کر دیا جیسے اُسے بروقت نہ تیار ہونے پر غصہ آ گیا ہو۔

●

ملک اختر کا پیغام سیٹھ صاحب نے موصول کیا تھا یہ وہی ذات شریف تھے جو اُس سے مینا کشی کے بھائی کے روپ میں ملے تھے۔

آج وہ لوگ ملک اختر سے حق نمک وصولنے جا رہے تھے۔ اس طرح وہ اس کی وفاداریوں کا امتحان بھی لے رہے تھے اور اس بات کا جائزہ بھی کہ ان تلوں میں کتنا تیل ہے؟

جیسے ہی ملک کی طرف سے ''گو آہیڈ'' کا سگنل موصول ہوا سیٹھ نے اپنے فون سے ایک اور نمبر پر یہی پیغام دے دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چار مختلف ٹیلی فون نمبروں سے باری باری یہ پیغام ایک دوسرے تک پہنچنے کے بعد بالآخر سمندر میں موجود اس لانچ تک پہنچ گیا جو ساحلِ سمندر سے قریباً چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر ڈانواں ڈول پانی میں انجن بند کیے کھڑی تھی۔ اس مضبوط لانچ کے کیپٹن کو جیسے ہی ''گو آہیڈ'' کا سگنل ملا اس نے انجن روم کو پیغام منتقل کر دیا۔

اچانک ہی لانچ کے طاقتور انجن جاگے اور وہ پانیوں پر تیرتی برق رفتاری سے ساحل کی طرف بڑھنے لگے۔ اندھیرے کی چادر کو چیرتی لانچ کے صرف انجن ہی ایسے تھے جن کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اتنے گہرے اندھیرے میں بھی اُن لوگوں نے تمام لائٹیں آف کر دی تھیں۔

تنظیم کے ایک صوبائی وزیر کو ''مرکز'' کی طرف سے اپنے محکمے کی ایک بڑی سرکاری ویگن کو کسی بھی ہنگامی حکم پر روانگی کے لئے تیار رکھنے کی ہدایت صبح ہی دے دی گئی تھی اور ان کی ہدایت پر تنظیم ہی کے اسی محکمے میں ملازم ایک آفیسر نے اپنے بیٹے کی شادی کی درخواست دے کر محکمے سے ایک دن کے لئے ویگن مستعار مانگی تھی جو اُسے وزیر صاحب کا ''چہیتا آفیسر'' ہونے کے ناطے فوری طور پر جاری ہو گئی۔

یہ آفیسر جو سرکاری ملازم تو برائے نام لیکن بابا صاحب کا غلام بطورِ خاص تھا، سہ پہر ہی سے ویگن لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا تھا۔ اُس کا گھر ساحلِ سمندر سے کچھ فاصلے پر ایک جدید رہائشی کالونی میں واقع تھا۔

اس کے گھر پر پہلے ہی سے تنظیم کے تین نوجوان موجود تھے۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ویگن کی چابی ان نوجوانوں کے سرغنہ کو تھما دی اور خود اطمینان سے اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔

شام ڈھلنے کے بعد جب اُسے اپنے ''سیلولر فون'' پر اگلی ہدایت ملی تو اُس نے ویگن میں موجود نوجوانوں تک وہ ہدایات ''بابا صاحب کے حکم'' کی صورت میں منتقل کر دی۔

اس حکم میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں سے اُنہیں ''مال'' موصول کر کے پرویز بھائی کے ہاں پہنچانا تھا۔

اس مال کی نوعیت کیا تھی؟

اسے کہاں سے لایا جا رہا تھا؟

لانے والے کون تھے؟

اُن کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات ہی پیدا نہیں ہوتے تھے۔ انہیں تربیت ہی اس بات کی دی گئی تھی کہ جو حکم ملے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا ہے، خواہ اس راستے میں موت ہی آ جائے۔

یہ تینوں بھارتی انٹیلی جنس کے مختلف کیمپوں میں تربیت حاصل کر چکے تھے اور کسی بھی طرح کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔ تنظیم کی طرف سے

ان لوگوں کو نہایت اہم مشن پر ہی روانہ کیا جاتا تھا اور انہیں عام کارکنوں سے بھی دُور ہی رہنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔

ان لوگوں کو صرف ''کوڈ'' بتایا گیا تھا۔

''کوڈ'' وہ سوال کے جواب میں بتاتے جو مال لانے والوں پر اُن کی ''شناخت'' آشکار کرتا جس کے بعد بند پیٹیوں میں موجود ''مال'' اُن کی ویگن میں لوڈ کرایا جاتا اور وہ ویگن کو مال سمیت پرویز بھائی کے پہلے سے طے کردہ اڈے پر پہنچا کر اپنی راہ لیتے۔

اس سلسلے میں تنظیم کے مجرمانہ ذہن اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان تینوں میں سے کسی کو دوسرے کے صحیح نام کا بھی علم نہیں تھا۔

ان تینوں کا تعلق اس صوبے کے تین مختلف شہروں سے تھا اور انہیں خصوصی مشن کے لئے بطورِ خاص اکٹھا کیا جاتا تھا۔ انہیں سختی سے اس بات کی ہدایت کی جاتی تھی کہ اپنی شناخت سے ایک دوسرے کو باخبر نہ ہونے دیں۔

وہ خود بھی جانتے تھے کہ رازداری ہی میں اُن کی بقا کا راز مضمر ہے۔

انہوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو سوائے اپنے جعلی ناموں کے اور کچھ نہیں بتایا تھا اور اب وہ ساحل سمندر کے کنارے اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں رُک کر انہیں مال کا انتظار کرنا تھا۔

انہیں وہاں پہنچے بمشکل چند منٹ ہی گزرے تھے۔ جب سمندر کی طرف سے کسی لانچ کے انجن کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اُن میں سے ایک نے اپنے پاس موجود نائٹ ویژن (رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین) سے سمندر کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر گردن ہلا دی۔

اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارے سے چوکس رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کے پاس ''براؤننگ پستول'' موجود تھے۔

انہوں نے پستول فائرنگ پوزیشن میں کئے اور اُن ٹیلوں کی اوٹ میں پوزیشنیں سنبھال لیں جن کے ایک طرف انہوں نے اپنی ویگن کو چھپایا تھا۔

شاید یہ جگہ تنظیم نے بطورِ خاص ایسے کاموں کے لئے مختص کی تھی کیونکہ یہاں سمندر کے کنارے موجود پتھریلی پہاڑیوں میں ویگن کو چھپانے کے لئے خاصی جگہ میسر تھی اور اچانک کوئی مصیبت آ جانے کی صورت میں یہاں چھپ کر دفاع کرنا کسی حد تک ممکن تھا۔

اُن کا تیسرا ساتھی ساحل کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

جاری ہے...

لانچ کے انجنوں کی آواز اب بڑھنے لگی تھی پھر اندھیرے میں وہ سمندر کے سینے پر ایک ہیولے کی طرح نمایاں ہونے لگی۔
ساحل سمندر پر موجود نوجوانوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ سے تین مختلف رنگوں کی روشنیاں وقفے وقفے سے جلا کر آنے والوں کو اپنی موجودگی اور محفوظ ہونے کا سگنل دیا اور خود ایک ٹیلے کے پیچھے پستول تھام کر بیٹھ گیا۔
لانچ آہستہ آہستہ اس جگہ پہنچ رہی تھی۔
اب انہیں لانچ کے اگلے حصے میں کھڑا وہ شخص بھی دکھائی دینے لگا تھا جو ان کی طرح ٹارچ سے مختلف رنگوں کی روشنیاں منعکس کر رہا تھا۔
لانچ کے انجن بند ہو گئے تھے اور وہ کنارے سے آ لگی تھی۔ تین چار سائے بڑی تیزی سے لانچ سے چھلانگیں لگا کر باہر آئے اور تیرتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔
لانچ وہیں لنگر انداز ہو گئی۔
ویگن والا نوجوان اب اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُن سب نے ایک دوسرے کی طرف پستول تان رکھے تھے اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ انہوں نے آپس میں ''کوڈ ورڈز'' کا تبادلہ کرنے کے بعد اس بات کا اطمینان نہیں کر لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔
ایک دوسرے کی شناخت سے مطمئن ہونے کے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی ایک مخصوص اشارے پر وہاں پہنچ گئے۔
اب اُن سب لوگوں نے مل کر لانچ سے لکڑی کی بڑی بڑی مضبوط پیٹیاں اتارنی اور ویگن میں منتقل کرنی شروع کر دیں۔ بمشکل پندرہ منٹ میں انہوں نے لانچ پر موجود پیٹیاں جن میں انتہائی خطرناک آتشیں اسلحہ اور تخریب کاری کا سامان بند تھا ویگن میں منتقل کر دیں اور اپنی اپنی راہ لی۔
ویگن اپنی منزل کی طرف گامزن تھی جبکہ لانچ دوبارہ کھلے سمندر میں واپس جا رہی تھی اس میں سوار تنظیم کے دہشت گردوں نے اب لانچ کی بتیاں بھی روشن کر لی تھیں اور بڑے بڑے مچھلی پکڑنے کے جال بھی اس پر پھیلا دیئے تھے۔ اس لانچ پر پہلے ہی سے شکار کردہ مچھلیاں موجود تھیں اور اب بادی النظر میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ماہی گیروں کی لانچ ہے جو سمندر میں مچھلیاں شکار کرنے کے بعد اب رات گئے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔
دوسری طرف ویگن اسلحہ سمیت ساحل سمندر پر موجود ایک اور ماڈرن آبادی کے ایک بنگلے میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں تنظیم کے غنڈے اس کے منتظر تھے انہوں نے پلک جھپکتے مال وصول کر لیا۔
ویگن میں سوار دو دہشت گرد یہاں اُتر گئے جبکہ تیسرا ویگن اس سرکاری آفیسر کی کوٹھی کی طرف لے گیا جہاں سے اس نے ویگن وصول کی تھی۔ سرکاری آفیسر بے چینی سے ان کی بحفاظت واپسی کا منتظر تھا۔ اس نے ویگن دیکھ کر سکھ کا لمبا سانس لیا اور اپنے گھر کے لاؤنج میں ویگن کھڑی کر لی۔
تیسرے دہشت گرد کو اس نے ایک کار کی چابی تھما دی تھی جس پر سفر کر کے وہ یہاں آیا تھا اور اب اُسی پر سفر کرتا اطمینان سے واپس جا رہا تھا۔ اس کے باقی دونوں ساتھی بھی اسی طرح الگ الگ گاڑیوں میں اپنے محفوظ ٹھکانوں تک پہنچ گئے تھے۔ تینوں کو اس کام کا خطیر معاوضہ پہلے ہی سے مل چکا تھا۔
اُن کے محفوظ ٹھکانوں پر شراب اور شباب ''بونس'' کی صورت میں الگ سے اُن کے لئے فراہم کر دیا گیا تھا۔

آستین کے سانپ

انسپکٹر فیروز نے ایس پی صاحب کی بتائی ہوئی بستی سے کچھ فاصلے پر ہی اپنی جیپ کھڑی کر کے اُس کی لائٹس آف کر دی تھیں اور اب وہ جیپ سے اُتر کر رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی طاقتور دُوربین کے ذریعے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک ہی اس کی نظریں وہاں سے کچھ فاصلے پر موجود ایک لانچ پر فوکس ہو گئیں۔

یہ لانچ اُسے مشتبہ دکھائی دے رہی تھی۔

عموماً رات کے اس پہر اس علاقے سے کوئی لانچ نہ تو کہیں آتی تھی اور نہ ہی کہیں جاتی تھی۔

''ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔'' اُس نے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی۔

''سر! اُنہیں پکڑتے ہیں۔'' اُس کے نائب نے کہا۔

''نہیں..... ذرا ٹھہرو..... میں پہلے ''ریکی'' کر کے دیکھ لوں۔ میرا سگنل ملنے پر ہی تم کارروائی کرنا۔''

انسپکٹر فیروز نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

''آل رائٹ سر!''

اس کے ساتھی اب جیپ سے باہر آ کر اپنی اپنی گنیں سیدھی کرنے لگے تھے۔

انسپکٹر فیروز نے حسب ہدایت اپنی گاڑی کے وائرلیس ریڈیو سے ایس پی صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ پہلے ''ریکی'' کر کے صورتِ حال کا جائزہ لینے جا رہا ہے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اُن لوگوں کے پاس اسلحہ زیادہ تعداد میں موجود ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں یوں بھی اُن کی تربیت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد ہی ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے۔

''ویل ڈن..... شاباش جوان۔ پہلے تم ''ریکی'' کرو اور مجھے رپورٹ دو کہ خطرے کی نوعیت کیا ہے..... اگر صورتِ حال خراب ہو تو میں اس علاقے میں ''میری ٹائم سیکورٹی'' سے مدد کی درخواست کرتا ہوں۔ دیکھو آفیسر میرے لئے تمہاری اور دوسرے جوانوں کی جان بہت قیمتی ہے۔ اپنی جان کو بلاوجہ خطرے میں نہ ڈالنا۔ ناؤ گو آہیڈ..... میں تمہارے اگلے پیغام کا منتظر ہوں۔''

یہ کہہ کر اُس نے وائرلیس کا رابطہ ختم کیا اور اسی طرح اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے فون کر کے اپنے کسی ''دوست'' کی خیریت دریافت کی اور اُسے فوراً ''کسی'' ماہر امراض سے مشورے کا سبق دے کر فون بند کر کے دوبارہ کنٹرول روم میں آ گیا۔

تنظیم کے بھارتی انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ تخریب کاروں نے یہ سارا ڈرامہ بڑی ہوشیاری سے سٹیج کیا تھا۔

ان لوگوں نے ملک اختر سے صرف ایک ہی مرتبہ اس نوعیت کی ''وطن فروشی'' نہیں کروائی تھی کہ اسی ایک مہم کی کامیابی پر اکتفا کر کے بیٹھ رہتے۔ انہوں نے کچھ ایسا تاثر پیدا کرنا تھا کہ یہ ڈرامہ کا روپ دھار لے اور ملک اختر جس نے اپنے وطن سے غداری کی تھی اُلٹا اپنے محکمے والوں کی نظر میں معتبر بھی ٹھہرے!

یہ لانچ یہاں اسی مقصد کے لئے رکھی گئی تھی۔

جیسے ہی ملک اختر کی طرف سے یہ فون ملا دوسرے ہی لمحے لانچ پر موجود دہشت گردوں کو ''فرار اور فائرنگ'' کا پیغام دے دیا تھا۔

انسپکٹر فیروز ابھی کچھ دُور ہی تھا جب اُس نے لانچ کے انجن سٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اب کچھ کرنے کا لمحہ تھا..... وہ سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگا اور انہیں جیپ میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

''سر! انہیں شاید شک ہو گیا ہے۔ ہم انہیں للکارنے جا رہے ہیں۔'' اُس نے وائرلیس پر ایس پی صاحب کو پیغام دیا۔

''شاباش جانے نہ پائیں۔ پکڑو انہیں میں مدد روانہ کرتا ہوں..... میں خود آ رہا ہوں..... ''آوٹ!''

ملک اختر نے رابطہ منقطع کیا اور فوراً اپنے جوانوں کو آپریشن کا سگنل دے کر تیزی سے اپنا پستول سنبھالتا باہر لپکا۔

اُس کے ماتحت اپنے افسرِ اعلیٰ کی اس فرض شناسی پر دل ہی دل میں بہت معترف ہو رہے تھے کہ وہ کسی کی مدد حاصل کرنے کے بجائے خود اپنے جوانوں کی مدد کے لئے جا رہا ہے۔ پہلے سے تیار دونوں جیپیں برق رفتاری سے ساحل سمندر کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ ملک اختر نے جیپ میں بیٹھتے ہی وائرلیس کے ذریعے ساحل سمندر کے اس حصے میں سرگرم عمل سیکورٹی ایجنسیوں سے اپنے جوانوں کی مدد کا پیغام بھی نشر کر دیا تھا۔

اُسے جواب میں بتایا گیا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے اُن کے لئے مدد پہنچنا ممکن نہیں کیونکہ اس علاقے میں اس نوعیت کی کوئی واردات آج تک نہیں ہوئی تھی اور حسن اتفاق تھا کہ نزدیک کوئی مدد بھی میسر نہیں تھی۔

انسپکٹر فیروز نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اپنے ساتھیوں کو لانچ سواروں کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ وہ لوگ اپنی جیپ بڑی برق رفتاری سے بھگاتے ہوئے اس طرف جا رہے تھے۔

لیکن.....!

اُن کے لانچ کے نزدیک پہنچنے تک لانچ ان کی دسترس سے باہر ہو گئی تھی۔ انسپکٹر فیروز نے ساحل کی طرف بھاگتے ہوئے اس پر اپنی رائفل سے گولیاں برسائیں۔

جواب میں لانچ سواروں نے بھی ساحل کی طرف گولیوں کی بارش کر دی۔
جب تک اس کے ساتھی کی مدد کو پہنچتے لانچ گولیوں کی رینج سے باہر ہو گئی۔ اب وہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جس جگہ لانچ کھڑی تھی وہاں ڈبوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں میں غیر ملکی سستی اشیاء سگریٹ، صابن، ٹرانسسٹر ریڈیو وغیرہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔
ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے تخریب کاروں نے جان بوجھ کر یہاں پندرہ بیس ہزار روپے کی اشیاء چھوڑ دی تھیں۔
اس اثناء میں ایس پی صاحب بھی موقعۂ واردات پر پہنچ گئے تھے۔ خدا جانے کس نے پریس والوں کو اس واقعے کی خبر کر دی تھی۔ کیونکہ ان کی آمد کے قریباً ایک گھنٹہ بعد پریس کے لوگ بھی اپنے کیمروں سمیت وہاں موجود تھے۔

●

اس درمیان مختلف ایجنسیوں کے اعلیٰ افسران اور ذمہ داروں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ملک اختر نے اخبار نویسوں کو گردن پھلا کر اپنے اس کارنامے کی تفصیلات بتائیں اور اگلے روز اخبارات میں اس کی پریس کانفرنس کرتے ہوئے تصاویر کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ سمندری راستے سے غیر ملکی اشیاء کی سمگلنگ کرنے والی ایک لانچ پر اس کے جوانوں نے انتہائی خفیہ ذرائع سے ملنے والی اطلاعات پر چھاپہ مارا اور ہزاروں روپے مالیت کا غیر ملکی سامان قبضے میں لے لیا۔
لیکن.....!
سمگلر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔
خس کم جہاں پاک.....
سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔
اُس سے اگلے روز جب ملک اختر کے دروازے پر دستک ہوئی تو مینا کشی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔
نوٹوں سے بھرا بریف کیس اور سامان عیش و عشرت اس کے پہلو میں موجود تھا۔ ملک اختر کو اس کے ضمیر کی اتنی زیادہ قیمت چکا دی گئی تھی جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکے۔ اگر اُس کے نزدیک بظاہر اتنے معمولی سے کام کی اتنی زیادہ قیمت تھی تو وہ ہزار مرتبہ ایسا گھناؤنا اور ملک دشمن کارنامہ انجام دینے کو تیار تھا۔
اس رات مینا کشی نے ملک اختر پر عیش و نشاط کے ایسے ایسے بند دروازے وا کیے کہ اُسے مبہوت کر کے رکھ دیا۔
وہ ''را'' کی تربیت یافتہ فاحشہ تھی۔
اُسے بتایا گیا تھا کہ مرد کی سب سے بڑی کمزوری بہر حال عورت ہی ہے اور ایک عورت کی حیثیت میں وہ مرد کو کس ادا سے مات دے سکتی تھی یہ ہی وہ خصوصی گیان

تھا جو اُسے بہم پہنچایا گیا۔

بے حیائی اور جنسی بے راہروی سے متعلق کوئی بھی ایسا گھٹیا تصور جو ملک اختر کے ذہن میں رہا ہوگا۔ مینا کشی اسے حقیقت کا رنگ دے چکی تھی۔

صبح جب وہ اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا اس کے دل و دماغ پر مینا کشی چھائی ہوئی تھی۔

●

شیر گل کو جب افسرِ اعلیٰ کی طرف سے اس نوعیت کی پرائیویٹ ملاقات کا پیغام ملا تو ایک مرتبہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

لیکن.....!

اُسے اطمینان تھا کہ کم از کم اس کی جواب طلبی کا کوئی جواز موجود نہیں۔ افسرِ اعلیٰ نے جو حال ہی میں یہاں آئے تھے اب تک جو کام کئے تھے انہوں نے شیر گل کے دل میں اُن کے لئے بہت عزت پیدا کر لی تھی۔ یہ آفیسر نوجوان بلا کا ذہین تھا۔ اس نے چند ہفتوں ہی میں تنظیم کو نچا کر رکھ دیا تھا اور اُس کی وطن دشمن سرگرمیوں کے راستے میں آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

آخر اُسے ہی کیوں اس خصوصی ملاقات کے لئے طلب کیا گیا ہے؟

اس سوال نے اُسے پریشان کر دیا تھا اور کوئی ڈھنگ کا جواب اُسے نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور وقت مقررہ پر اس ہوٹل میں پہنچ گیا جس کا ایک کمرہ افسرِ اعلیٰ نے اس خصوصی ملاقات کے لئے ہی شاید بک کروایا تھا۔

افسرِ اعلیٰ صاحب اُس کے استقبال کے لئے کمرے میں موجود تھے۔

انہوں نے کمرے ہی میں اس کے لئے چائے منگوائی اور اس سے پہلے معمول کی گفتگو کرنے کے بعد دو روز پہلے ملک اختر کی ایجنسی کی طرف سے انجام پانے والے کارنامے پر بات شروع کر دی۔

''تمہارے خیال میں کیا واقعہ یہی تھا جو بتایا جا رہا ہے؟''

افسرِ اعلیٰ کے اچانک سوال نے اُسے چونکا دیا۔

''میں سمجھا نہیں سر!'' وہ اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''دیکھو شیر گل خان میری اطلاعات کے مطابق تم میرے ماتحتوں میں سب سے زیادہ محبِ وطن ہو۔ ملک کے جو حالات ہیں جس طرح کی بیرونی مداخلت ہو رہی ہے اور جس طرح غداروں کو سیاسی داؤ پیچ لگا کر حب وطن کا لبادہ اوڑھا جا رہا ہے تم سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ ان حالات میں گو کہ ہماری تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ کان لپیٹ کر خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور تماشہ دیکھتے رہیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے چائے کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور شیر گل خان کے چہرے پر نظر دوڑا کر اندازہ کر لیا کہ انہوں نے صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔

''میں نے اپنے ذرائع سے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ جس علاقے میں یہ واردات ہوئی وہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس لانچ سے سمگلنگ کا سامان اتارا جا رہا تھا تو اُسے وصول کرنے والے بھی تو ہونے چاہئیں۔ حیرت کی بات ہے کہ سمگلر لانچ سے مال اُتار کر سمندر کنارے جمع کرتے رہے تاکہ پولیس آئے اور اُسے اُٹھا کر لے جائے۔ اس مال کو وصول کرنے کے لئے کوئی وہاں کیوں نہیں آیا؟ اور یہ بات تو کوئی عقل کا اندھا بھی جانتا ہے کہ جب تک دوسری پارٹی نہ آ جائے یہ لوگ پاگل تو نہیں تھے کہ مال اُتارنا شروع کر دیتے..... انتہائی کوشش کے باوجود مجھے ابھی تک دوسری کسی پارٹی کی موجودگی کا ثبوت نہیں مل سکا نہ ہی اس بات کا علم ہو سکا کہ یہ مال آخر کس کے لئے لایا جا رہا تھا۔ جہاں تک میں نے سوچ بچار کی اس کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کوئی دھوکے کی چال تھی۔ اس سموک سکرین کی آڑ میں کوئی اور گھناؤنا کھیل کھیلا گیا ہے۔ کمال ہے سگریٹ اور صابن کے ڈبوں کے لئے وہ لوگ اپنی جان کیوں جوکھوں میں ڈالیں گے..... مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ملک اختر کی ایجنسی کے لوگوں کو غلط اطلاع دے کر وہاں سے ہٹایا گیا تاکہ میدان خالی ہو اور وہاں کوئی کارروائی کی جائے جس کے بعد.....''

فقرہ اُدھورا چھوڑ کر اُس نے ایک مرتبہ پھر شیر گل کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''سر! میں آپ کی بات کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے اس علاقے میں کچھ عرصہ ڈیوٹی کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ کم از کم اس پوائنٹ پر اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا نہ ہی کوئی لانچ نیوی کی آنکھوں سے بچ کر اس علاقے میں داخل ہو سکتی ہے..... لیکن حالات کا مکمل علم نہ ہونے کے سبب ابھی میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔''

اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

اپنے ذہن میں یہ مفروضہ قائم کرنے لینے کے بعد کہ یہ کسی سازش کا حصہ ہے میں نے اس لائن پر سوچنا شروع کیا کہ اس سموک سکرین کی آڑ میں آخر کون سا کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو پوائنٹس بڑی اہم ہیں..... یہ واقعہ 18 تاریخ کو پیش آیا اور 19 تاریخ کو ہماری یونیورسٹی کے ذریعے نے اطلاع دی کہ تنظیم کے طلباونگ کے پاس خطرناک اسلحے کی نئی کھیپ پہنچ گئی ہے۔ 19 تاریخ کی رات کو ریگل سینما کے باہر سفید کار سے ہونے والی فائرنگ میں جو اسلحہ استعمال ہوا وہ پہلی مرتبہ متعارف کروایا گیا ہے۔ گولیوں کے خالی خول جو ہم نے اکٹھے کئے وہ تمام بھارت کے ساختہ ہیں۔ کیونکہ اس نوعیت کی گولیاں ہمارے ملک میں کوئی نہیں بناتا..... جس کے بعد میں نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ دراصل 18 تاریخ کی رات کو اسلحے کی تازہ کھیپ سمندر کے راستے یہاں پہنچانے کے لئے اُن لوگوں نے ملک اختر کے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور میدان خالی کروانے کے بعد اپنا کام کر گزرے۔''

وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

شیر گل حیرت سے اپنے افسرِ اعلیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے ذہین اور محبِ وطن لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں..... اُس نے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ افسرِ اعلیٰ کو داد دی۔

''دوسری رپورٹ جو بظاہر تو اس معاملے سے الگ نظر آتی تھی لیکن جب میں نے کڑی سے کڑی ملا کر زنجیر بنانی شروع کی تو اس رپورٹ نے بھی میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ انسپکٹر چوہدری پرویز بھائی پر کام کر رہا ہے۔ اس نے پرویز کی ساحل سمندر والی کوٹھی، جس میں اس کی داشتہ رہتی ہے اور بظاہر یہ کوٹھی بھی اس نے اپنی داشتہ کی ماں کے نام پر خریدی ہوئی ہے، میں رات کے دوسرے پہر سرکاری محکمے کی ایک ویگن کو داخل ہوتے اور کچھ دیر بعد وہاں سے نکلتے بھی دیکھا۔ یہ ویگن تنظیم کے وزیر صاحب کے محکمے کی تھی جن کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے محکمے کی کم اور تنظیم کی زیادہ خدمت کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ایک لمبے عرصے سے جاری ہے..... انسپکٹر چوہدری کی رپورٹ کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ اس کوٹھی سے اس نے ویگن کی روانگی کے کچھ دیر بعد مٹھو میاں کو بھی ایک کار میں جاتے دیکھا..... جبکہ حیدر آباد سے اس کی یہاں آمد کو بالکل خفیہ رکھا گیا تھا اور وہ راتوں رات حیدر آباد واپس بھی پہنچ گیا۔ اس رپورٹ کے مطابق مٹھو میاں بھیس اور نام بدل کر اس شہر میں آیا تھا کیونکہ رات کو حیدر آباد جانے والی جتنی گاڑیاں چیک ہوئی ہیں اُن میں اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ انسپکٹر چوہدری چونکہ حیدر آباد پوسٹنگ پر رہا ہے اور مٹھو میاں کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اس کی نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں..... اس کا مطلب یہی ہے کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔''

شیر گل کو بھی اب کچھ خاصی سمجھ آنے لگی تھی۔

واقعی بڑی خطرناک سازش تھی جس کی آڑ میں یہ گھناؤنا کھیل رچایا گیا۔

اب واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے کے بعد میرے ذہن نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے جسے میں بہت حد تک صحیح بھی جاننے لگا ہوں کہ دراصل سمگلروں کی لانچ کو ''دھوکے کی چال'' بنایا گیا اور اس چکر میں اسلحہ کی کھیپ تنظیم نے حاصل کر لی ہے اب تمہارا ذہن کیا کہتا ہے کہ اس سارے کھیل میں مرکزی کردار کس نے ادا کیا؟''

''افسرِ اعلیٰ نے اپنی بات مکمل کر کے اچانک سوال کر کے اُسے بوکھلا دیا۔

''سر! میرے خیال سے اس شخص کا کردار سب سے زیادہ اہم اور مشتبہ ہے جس نے کچھ دیر کے لئے گشتی پارٹی کو اپنی جگہ سے ہٹایا اور اس کا دھیان اس لانچ کی طرف منتقل کر دیا۔''

اس نے ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''شاباش جوان! شاباش! اور تم جانتے ہو وہ شخص کون تھا؟''

''نہیں سر! میں کیا جان سکتا ہوں۔''

''وہ ملک اختر ایس پی ہے۔ جس نے خلافِ توقع، خلافِ عادت اور خلافِ معمول اس روز اچانک کارکردگی دکھانے کا ڈرامہ رچایا اور اس سارے آپریشن کی کمان کی۔ اُسی کے حکم پر انسپکٹر فیروز نے اپنی جگہ چھوڑی۔''

''میرے خدایا.....!''

بے اختیار شیر گل کے منہ سے نکلا۔

''صرف دو دنوں کی انکوائری نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شخص پرلے درجے کا شرابی اور عیاش ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام افسر نہیں اور اس شہر میں جس تیزی سے اس نے دولت کے انبار لگائے ہیں اُس نے تو مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

بالآخر افسرِ اعلیٰ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''آپ کی سوچ بالکل درست ہے جناب۔''

شیر گل نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

''میرے نزدیک تم سب سے زیادہ قابل اعتماد ہو..... اپنے سورس کو ''ایکٹو'' کرو اور پتہ لگاؤ کہ ملک اختر سے تنظیم کے کن لوگوں کا ملنا جلنا ہے اور تم خود اُس کی شام کے بعد کی سرگرمیوں پر نظر رکھو۔ مجھے ان لڑکیوں کی فہرست چاہئے جو اس سے اکثر ملتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے اگر وہ تنظیم کے جال میں پھنس چکا ہے تو یہ جال انہی لڑکیوں کے ذریعے اس پر پھینکا گیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں وہ عورتوں کے معاملے میں بہت کمزور واقع ہوا ہے۔''

افسرِ اعلیٰ نے اس پر ساری بات کھول دی۔

''ٹھیک ہے سر!''

''اور ہاں اب سب سے اہم بات بھی سن لو۔ فی الوقت تم جو بھی کر رہے ہو ''آف دی ریکارڈ'' ہے کیونکہ اس طرح کسی سرکاری افسر کی ہم اپنی حیثیت میں سرگرمیاں چیک نہیں کر سکتے اس کے لئے ہمیں ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینی ہوتی ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی مرحلے پر یہ بات ہاتھ سے نکل جائے..... شیر گل ذاتی حیثیت میں تم مجھے ہمیشہ اپنے بھائیوں کی طرح پاؤ گے۔ اگر ہم نے وطن دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ارباب بست وکشاد کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تو یقین رکھو کہ اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ شیر گل خان ہمیں پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کے دشمنوں کو نیست ونابود کرنا ہے۔ کسی بھی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر۔ یہ ہمارا ایمان ہے اور میں اس پر مرتے دم تک قائم رہوں گا۔ میں کسی ملک دشمن کو محض اس لئے حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا کہ مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے۔''

انہوں نے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ شیر گل کو اپنی طرح کے ایک پاکستانی آفیسر سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کے جذبات کا عجیب عالم تھا۔

''سر! آپ مجھے کبھی پیچھے نہیں پائیں گے۔ اس راستے میں اگر موت بھی آ جائے تو میرے نزدیک یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔''

''میرے خیال سے اس موضوع پر اور گفتگو کرنا تو مناسب نہیں ہوگا..... خدا حافظ!''

انہوں نے شیر گل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''خدا حافظ سر!''

شیر گل نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا اور جس طرح خاموشی سے یہاں آیا تھا اسی طرح چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

اس کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ افسرِ اعلیٰ نے اس پر اعتماد کر کے اس کا حوصلہ کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

●

پرویز بھائی کی اس طرح آمد کوئی پہلی مرتبہ تو نہیں ہوئی تھی۔

لیکن.....!

آج جس طرح اچانک وہ اُس کے کمرے میں گھسا تھا یہ حرکت وزیر صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ سب کی نظروں سے چھپ کر اس ریسٹ ہاؤس میں دادِ عیش دینے کے لئے آئے تھے۔ انہیں اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ پرویز بھائی یہاں بھی منہ اُٹھائے چلا آئے گا۔''

اس نے وزیر صاحب کے ایک محافظ کو جس نے پرویز بھائی کو روکنے کی کوشش کی تھی تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

یہ محافظ کوئی معمولی سا غنڈہ نہیں تھا۔

تنظیم کا خاص آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کو بطورِ خاص تنظیم کے حکومتی عہدیداروں کی حفاظتی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ اس طرح ایک طرف تو وہ سرکار کی خدمت کر رہے تھے دوسری طرف وہ اپنے ''باس'' کے ایک ایک پل کی خبر ''بابا صاحب'' کو دیتے تھے۔ اس طرح انہیں ہر وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ سرکار کے نہیں دراصل بابا صاحب کے نوکر ہیں۔

یہ محافظ چاہتا تو پرویز بھائی کو اس سے کئی گنا زیادہ قوت سے اس تھپڑ کا جواب دے سکتا تھا۔

لیکن.....!

وہ مجبور تھا۔

وہ پرویز بھائی کی اہمیت سے واقف تھا۔ تنظیم کے اندر کے معاملات اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بنے بھائی کی موت کے بعد سے پرویز بھائی اتنا اونچا اُڑنے لگا ہے کہ اب بابا صاحب بھی اس کے پر نہیں کاٹ سکتے تھے۔ پھر اس کی کیا مجال تھی کہ خواہ مخواہ کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتا۔

پرویز بھائی جب اچانک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وزیر صاحب اس حالت میں نہیں تھے کہ کسی کا سامنا کر سکیں۔

وہ جس فاحشہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے وہ اس شہر کی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ سرکار دربار میں اچھے خاصے اثر و رسوخ کی مالک تھی یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔

جہاں ایک طرف وزیر صاحب کا دماغ غصہ ضبط کرتے ہوئے پھٹنے کو آ رہا تھا وہاں دوسری طرف اُس کی ساتھی کے منہ سے بے اختیار مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔

پرویز بھائی نے سب سے پہلے اُس کا دماغ درست کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک زوردار تھپڑ اتنی طاقت سے اس کے منہ پر جڑا کہ بے چاری سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔

بے بسی، غصے اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ اس نے روتے ہوئے اپنے کپڑے سنبھالے اور وزیر صاحب کے منہ پر تھوک کر چل دی۔

وزیر صاحب نے دروازے تک اس کی منت سماجت کر کے منانے کی کوشش کی لیکن اس نے وزیر صاحب کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں، پھر اپنی راہ لی۔

''پرویز بھائی! آپ کو اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔''

وزیر نے روہانسی آواز میں کہا۔

''ابے بھڑوے۔ جب تو کوئی کام نہیں کر سکتا تو ہاں کرنے کو کس نے کہا تھا..... تم نے میری بے عزتی کروا دی۔ تمہارے ہوتے ہوئے تمہارے محکمے کے ایک ڈائریکٹر کی یہ ہمت..... جانتے ہو ڈرگ کی جس فیکٹری پر چھاپہ پڑا ہے اس میں تمہارا کتنا حصہ ہے۔ ابے ٹٹ پونجیئے جب لاکھوں روپے سے بھرے بریف کیس سنبھالتا ہے تو ان کی فکر بھی کیا کر جو تیرے لئے کما کر لاتے ہیں۔''

پرویز بھائی نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''دیکھو پرویز بھائی ہر شخص کے برداشت کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے۔''

''اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو کل صبح ہونے تک مجھے وہ ڈائریکٹر اس شہر میں دکھائی نہیں دینا چاہئے..... سمجھے تم۔''

یہ کہہ کر پرویز بھائی اس کا جواب سُنے بغیر غصے سے اُسے دھکا دے کر باہر نکل گیا۔

بے چارہ وزیر منہ کے بل زمین پر گرا۔

وہ تو خیریت گزری کہ فرش پر موٹے قالین بچھے تھے اور اُسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ورنہ شاید اس کی ہڈی پسلی ہی برابر ہو جاتی۔

پرویز بھائی کے باہر نکلتے ہی اس کا باڈی گارڈ اندر گھس آیا۔ اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ''باس'' کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔

''سر! یہ زیادتی کی انتہا ہے۔''

اس نے بے بسی سے کہا۔

''میں ابھی بات کرتا ہوں بابا صاحب سے..... ابھی چلو..... اسی وقت چلو بابا صاحب کے پاس۔ آج یہ فیصلہ ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ اب ہم دونوں میں سے ایک رہے گا۔ یا میں یا وہ۔''

غصے کے مارے وزیر صاحب کے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔

''فوراً گاڑی تیار کرو۔''

جیسے ہی باڈی گارڈ کو ''باس'' کا حکم ملا وہ تیزی سے باہر نکلا اور وزیر صاحب کے لئے گاڑی تیار کرنے کا حکم ماتحت عملے کو سُنا دیا۔

باڈی گارڈ کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

وہ نہ جانے کب سے اس بات کا منتظر تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لے سکتا تھا۔

***

انتقام

بابا صاحب کے لئے وزیر کی آمد بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ تو خود جانے کب سے پرویز بھائی پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے اب تو معاملہ ہی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھتا ہوں شمس میاں۔ پرویز بھائی کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ اس کا علاج ناگزیر ہو گیا ہے..... تم ایسا کرو مار ڈالو اُسے..... مار دو سالے کتے کے پلے کو..... ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں..... کل ذرا شوٹنگ کرواؤ ناں شہر میں..... اس چکر میں اس سالے کو بھی مروا دینا..... پہنچا دو اسے بھی بنے بھائی کے پاس..... سالا.....''

بابا صاحب کا خونخوار قہقہہ بلند ہوا۔

''ایسا ہی ہو گا بابا صاحب..... آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔''

وزیر کے منحوس چہرے پر سفاک مسکراہٹ جاگی۔

''اور ہاں..... یہ کام ذرا بالا بالا ہی کرنا ہو گا..... جتنے کم لوگوں کو علم ہو اتنا ہی فائدہ ہے..... سمجھ گئے ناں۔''

بابا صاحب نے وزیر کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''سمجھ گیا بابا صاحب! خوب سمجھ گیا۔''

وزیر کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

''اب تم جاؤ..... اور جاتے جاتے رخسانہ کو اندر بھیج دینا۔''

بابا صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے کہا۔

یہ ان کی خاص ادا تھی جس کا مطلب ہوتا تھا اب وہ کوئی بات نہیں سُنیں گے۔

وزیر صاحب نے آگے بڑھ کر اُن کے گھٹنے چھوئے اور اُلٹے قدموں باہر آ گئے۔ انہوں نے ملحقہ کمرے میں رخسانہ تک بابا صاحب کا حکم پہنچا دیا تھا۔

''جی!'' رخسانہ نے اندر داخل ہوتے ہی دریافت کیا۔

''ارے ادھر آؤ ناں..... بہت ناراض لگتی ہو..... بھئی کر دیا ہے تمہارے پرویز بھائی کا بندوبست..... اِدھر آؤ ناں میری جان۔''

بابا جان نے اُسے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس کے بعد اُن پر ہوس کاری کا دورہ پڑ گیا۔

بابا صاحب عجیب ذہنی مریض تھے۔ جب اُن کے سر پر خون سوار ہوتا وہ اپنی درندگی کا مظاہرہ کرنے کی عجیب و غریب صورتیں نکالتے تھے۔

رخسانہ کو بابا صاحب کی کمزوری کا مکمل ادراک تھا۔ وہ بابا صاحب کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے بابا صاحب کو جنسیت کی دلدل میں اتنا گہرا اُتار دیا تھا کہ اب وہ ہوس کے مارے ندیدے بچوں کی طرح تنظیم کے ہر قابل قبول شکر کے حامل ورکر پر حلوائی کی دُکان اور نانا جی کی فاتحہ کے مصداق پل پڑتے تھے۔

گزشتہ چند مہینوں سے تو انہوں نے اپنی اس جنسی درندگی کو تسکین بہم پہنچانے کے لئے کشتہ جات کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ اپنے ڈاکٹرز کی اس ہدایت کے باوجود کہ ان سونے چاندی کے کشتوں سے اُن کے گردے بھی فیل ہو سکتے ہیں۔ وہ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کوئی کشتہ کھانے سے باز نہیں آتے تھے۔

اس چکر میں انہیں دو مرتبہ ہسپتال کا منہ بھی دیکھنا پڑا، اور اب وہ گردوں کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔

لیکن.....!

اُن کی ہوس رانیاں روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

اخبارات کے ذریعے یہی خبریں آ رہی تھیں کہ کام کی زیادتی اور مسلسل ذہنی دباؤ نے بابا صاحب کے گردوں کو بھی اثر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کے معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

تنظیم کے معصوم اور گمراہ کارکن جنہیں بابا صاحب نے اپنی لچھے دار گفتگو سے اندھا کر رکھا تھا وہ ساون کے اندھوں کی طرح بابا صاحب کی ہر سیاہی کو سبزی ہی دیکھتے اور سمجھتے تھے..... بابا صاحب نے بڑی مکاری سے اُن کی بھولی بھالی آنکھوں پر ایسا چشمہ پہنا دیا تھا جس سے انہیں بابا صاحب کی درندگی میں بھی انسانیت دکھائی دیتی تھی۔

●

وزیر صاحب کے سامنے شراب کا جام دھرا تھا۔ انہوں نے اپنے اسی باڈی گارڈ کو طلب کیا جس کے منہ پر پرویز نے تھپڑ رسید کیا تھا۔

"بندو خان..... میں نے کہا تھا ناں کہ اس پرویز کے بچے کا بندوبست کر دوں گا..... کر دیا..... بابا صاحب کا حکم مل گیا ہے..... بابا صاحب کے حکم پر تم اُسے کتے کی موت مار ڈالو۔"

وزیر صاحب نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم تو بابا صاحب کے کتے ہیں مالک اور آپ کے بھی غلام ہیں۔"

بندو خان نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

''لو..... یہ لے جاؤ اور تازہ دم ہو کر جانا..... کل ہم ذرا شہر میں آتش بازی کروا رہے ہیں اس درمیان اپنا کام کر گزرنا۔ اور ہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ میں پسند کرتا ہوں نہ بابا صاحب..... سمجھ گئے ناں۔''

وزیر صاحب نے آنکھ دبائی۔

''بالکل سمجھ گیا مالک۔''

اس نے وزیر صاحب کی طرف سے ملنے والی وہسکی کی بوتل تھام لی۔

''یہ ابتدائی اخراجات رکھ لو۔''

وزیر صاحب نے اتنا کہتے ہوئے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف پھینک دی۔

''جیتے رہو مالک..... خدا کرے آپ چیف منسٹر بن جائیں۔''

ندیدے باڈی گارڈ نے نوٹوں کی گڈی چوم کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ابے گدھے..... پرائم منسٹر کہو..... پرائم منسٹر.....'' وزیر صاحب کو نشہ ہونے لگا تھا..... ''اور ہاں ہمارے آرام کا بندوبست کرو..... خبردار اگر صبح ہونے سے پہلے کوئی بھی اس طرف پھڑکا تو۔''

''ایسا ہی ہوگا مالک..... ایسا ہی ہوگا۔''

بندو خان نے دوسرے کمرے میں جا کر منی بائی کا نمبر ملایا اور اپنے باس کے آرام کا فوراً بندوبست کرنے کی ہدایت کی۔

''آدھے گھنٹے میں لڑکی پہنچ جائے گی۔'' منی بائی نے ایڈریس سمجھتے ہوئے کہا۔

''اتنی دیر منی بھائی۔'' بندو خان کو بن پیئے ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

''زیادہ جلدی ہے تو اپنے گھر سے بھیج دے نا کسی کو۔'' منی بائی نے پیشہ ور طوائفوں کے انداز میں اُسے گالی دے کر فون بند کر دیا۔

●

وہ دن شہر نگاراں کے لئے قیامت کا دن تھا۔

دوپہر کو یونیورسٹی میں ہونے والے ایک جلسے میں معمولی سی بدنظمی پر ہنگامے کا آغاز ہوا اور جلد ہی اُس نے آدھے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے باہر موجود سرکاری عملے پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ دوسری طرف سے بھی جوابی فائرنگ ہونے لگی جس کی زد میں آ کر تین بے گناہ طالب علم مارے گئے۔

ان تینوں ''بے گناہوں'' کا تعلق مخالف تنظیم سے تھا جنہیں تنظیم کے طلباونگ کے غنڈوں نے دو تین روز سے اپنی ناجائز حراست میں رکھا ہوا تھا۔ان وحشیوں نے درسگاہوں کو عقوبت خانوں میں تبدیل کر دیا تھا اور ہوسٹل کے کمروں میں اپنے مخالفین کو لا کر اُن پر وحشیانہ تشدد ڈھاتے تھے۔

ان تینوں طالب علموں کو انہوں نے یونیورسٹی کی حدود سے ہی اغواء کیا اور اپنے ہوسٹل میں رکھ کر ان پر اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ان بے چاروں کا گناہ صرف یہ تھا کہ یہ تینوں دوسرے شہروں سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے خود کو صرف طالب علم ہی سمجھا تھا۔

وہ یونیورسٹی کی گندی سیاست میں شامل نہیں ہوتے تھے جس کی کم از کم سزا یہی تھی کہ ان پر مخالف کا لیبل چپکا کر انہیں مار ڈالا جائے۔

کسی نے یہ نہ دیکھا کہ بظاہر پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والے ان طالب علموں کے جسموں پر وحشیانہ تشدد کے نشانات موجود تھے۔

کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ پولیس نے انہیں گولی مارنے سے پہلے آخر ان کے جسموں کو گرم استری سے کس طرح داغا۔

اگر انہیں پولیس نے ہی گولیاں ماری تھیں تو ان کے جسموں پر سوراخ کس نے کیے تھے۔

تنظیم کے طالب علموں کا لبادہ اپنے چہروں پر اوڑھے ہوئے درندوں نے اپنے بابا صاحب کی تربیت کے مطابق ظالمانہ اقدامات کیے اور مظلومیت کا ڈرامہ بھی رچا دیا۔

انہیں اس بات کا علم تھا کہ اخبارات میں ایک لفظ بھی ان کی مرضی کے خلاف شائع نہیں ہو سکتا۔

کس کی ہمت تھی کہ اُن کی اس انسانیت سوز اور بہیمانہ کارروائی کا پول کھولے۔انہوں نے یہی تو کام کیا تھا کہ سب سے پہلے پریس پر اپنی گرفت مضبوط کی تھی اور اس شہر میں چھپنے والے ہر قابل ذکر اخبار رسالے کے مالکوں کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔البتہ اگر تنظیم کے لوگ چاہیں تو ان کا جینا دوبھر کر دیں۔

اور.....انہوں نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔

یونیورسٹی سے جیسے ہی ہنگامے کا سگنل ملا.....تنظیم کے تربیت یافتہ غنڈے اپنے اپنے پہلے سے طے شدہ ٹارگٹ پر پل پڑے۔

انہوں نے بے گناہوں کو گھروں سے نکال کر گولیاں ماریں۔

اُن کا مال اسباب لوٹا۔

اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کی عزتوں کا نیلام کیا۔

اُن کے گھروں کو آگ لگائی اور اپنی راہ لی۔

شہر کے بھرے پرے بازاروں میں اچانک سفید رنگ کی کاریں نمودار ہوئیں جن میں بیٹھے غنڈوں نے کاروں کی کھڑکیوں سے کلاشنکوفیں باہر نکالیں اور بے گناہ اور بے خبر لوگوں پر موت کے دھانے کھول دیئے۔

ہر طرف ایک قہر برپا تھا۔

کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہوا کیا ہے؟

جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگنا شروع کر دیا۔ ان بھاگنے والوں میں پولیس کے وہ بوکھلائے ہوئے سپاہی بھی شامل تھے جنہیں ڈنڈے ہاتھوں میں تھما کر شہر کے مختلف چوراہوں میں کھڑا کیا گیا تھا۔

وہ ان ڈنڈوں سے جدید اسلحے کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

●

پرویز بھائی کو اس بات کا علم تو تھا کہ آج انہوں نے چند روز پہلے آنے والے اسلحے کی آزمائش نہتے شہریوں پر گولیاں برسا کر کرنی تھی۔

لیکن.....!

بارود کو چنگاری دکھانے والا اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟

یہ بات جہاں اس کے لئے پریشان کن تھی وہاں الارمنگ بھی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اس سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے تو بابا صاحب کو یہی احساس دلا رکھا تھا کہ تخریب کاری میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور تنظیم کے غنڈہ ونگ کی سرداری اسی کو زیب دیتی ہے اور یہی اس کی بقاء کا راز بھی تھا۔

اگر وہ اپنی دہشت گردی کا تاثر قائم نہ رکھتا تو جس طرح گزشتہ ایک سال سے اُس نے بنے بھائی کے بعد پر پرزے نکالے تھے اور بعض جگہ تنظیم کو خاطر میں لائے بغیر اپنے بل بوتے پر ہی غنڈہ ٹیکس کی وصولی شروع کر دی تھی۔ یہ تو بابا صاحب کے اقتدارِ اعلیٰ میں کھلم کھلا مداخلت تھی۔ خدا جانے اب تک بابا صاحب نے اُسے برداشت کیسے کیا تھا؟

شاید انہیں اپنے غیر ملکی دوستوں سے اس کی اجازت نہ مل رہی ہو؟

ممکن ہے انہوں نے پرویز بھائی کو ابھی تک اسی لئے ڈھیل دے رکھی تھی کہ ''را'' کے نزدیک پرویز بھائی ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا تھا اور وہ ان کی ہر ضرورت پوری کر رہا ہو۔ ''را'' کو تنظیم سے زیادہ اپنے کرائے کے کتوں کی خیریت عزیز تھی۔

بات کچھ بھی رہی ہو پرویز بھائی کو یہ پریشانی ضرور لاحق ہو گئی تھی کہ آخر اس مرتبہ بابا صاحب نے نئے اسلحہ کی نمائش کے لئے اس کے بجائے کسی اور کو ذمہ داری کیوں سونپ دی گو کہ تنظیم کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں تھا جس کے مطابق پرویز بھائی کی چودھراہٹ مستقل ہو گئی ہو۔

لیکن.....!

بابا صاحب کو یہ کیا سوجھی؟

اُس نے پہلے یہی چاہا کہ بابا صاحب سے براہِ راست بات کرلے پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔ اس طرح تو وہ خواہ مخواہ دوسروں کو اہمیت دے گا۔

کیوں نہ اپنے طور پر اس سورے کا پتہ لگایا جائے جو اُس کی جگہ پُر کرنے کے چکر میں ہے۔

اس نے سوچا اور آستانے پر ایک نمبر گھما دیا۔

اس نے ''آستانے'' پر اپنے خصوصی دہشت گرد ونگ سے رابطہ کر کے آج کے واقعات کی تفصیل جاننا چاہی۔

''پرویز بھائی! وہ سالا شمسو (وزیر صاحب) اس مرتبہ ہم پر بازی لے گیا۔'' اس کے لونڈوں نے یونیورسٹی سے ابتداء کی تھی۔ پرویز بھائی یہ دوسرا ہاتھ دکھایا ہے اس نے ہلڑ کے بہت غصے میں ہیں۔''

دوسری طرف سے جواب ملا۔

''ابھی کچھ نہیں کرنا۔ میں مرکز پہنچتا ہوں تم لونڈوں کو اکٹھا کرو..... اور ہاں یہ بڑا اہم مسئلہ ہے سمجھ گئے ناں۔ ذرا سوچ سمجھ کر اور اپنے اعتماد کے بندوں کو ہی بلانا..... میں اس شمسو کے بچے کا ٹنٹا ہی ختم کر دوں گا..... اس کی یہ ہمت۔'' اس نے اتنا کہہ کر غصے سے فون بند کر دیا۔

''گاڑی تیار کرو۔''

●

جیسے ہی اس کے منہ سے نکلا دو مسلح باڈی گارڈ پہلے سے تیار گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے پچھلی نشست سنبھالی تھی اور پرویز بھائی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھے پستول کو چیک کر کے دیکھا۔ پستول لوڈ تھا۔ آج اس کے ساتھیوں نے پہلی مرتبہ پرویز بھائی کو اتنا مضطرب دیکھا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسی باتوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا۔

جس علاقے میں پرویز بھائی رہائش پذیر تھا وہ خاصا ماڈرن اور شہر سے الگ تھلگ علاقہ تھا۔ عموماً اس طرف فسادات نہیں ہوتے تھے یا پھر یہ تنظیم کی پالیسی تھی کہ وہ اُن علاقوں میں جہاں سے اُسے غنڈہ ٹیکس کی صورت میں بڑی بڑی رقمیں ملا کرتی تھی فسادات نہیں کرواتے تھے۔ اس طرح وہاں کے امیر کبیر رہائشیوں کو یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ یہ اُن کی پُر امن زندگی بسر کرنے کی فیس ہے جو تنظیم اُن سے وقتاً فوقتاً وصول کرتی رہتی ہے۔

پرویز بھائی کے گھر میں تین چار مسلح محافظ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس وقت بھی جب کہ وہ گھر سے باہر جا رہا تھا اس کے گھر پر تنظیم کے دہشت گرد گروپ کے تین نوجوان جدید اسلحے سے لیس موجود تھے۔

اونچی اونچی دیواروں سے بنا یہ جدید بنگلہ جس کی دیواروں پر کانٹے دار تار لگا کر رات کو اُن میں بجلی دوڑا دی جاتی تھی۔ کسی قلعے کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس کا آہنی

دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ عام بندوق کی گولی بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ دروازہ عموماً بند رہا کرتا تھا۔ سوائے پرویز بھائی کے ذاتی محافظوں یا گھریلو گاڑیوں کے کسی اور گاڑی کے لئے بھی یہ دروازہ نہیں کھولا جاتا تھا۔

اس کے مہمانوں کی گاڑیاں اس بنگلے سے ملحقہ کھلے پلاٹ میں پارک کی جاتی تھیں۔ اس پلاٹ کے مالک کو ڈرا دھمکا کر پرویز بھائی کے غنڈے ساتھیوں نے اُس سے اونے پونے داموں یہ پلاٹ خرید لیا تھا۔

محض اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا کسی گاڑی میں ہی کوئی بم نصب نہ کر دیا گیا ہو۔ اُس کے محافظ کی گاڑی کو اندر نہیں آنے دیتے تھے۔

پرویز بھائی خود جس ملاقاتی کمرے میں اپنے مہمانوں سے ملا کرتا تھا اس کے دروازے میں وہ ایکسرے مشین نصب تھی جو ساتھ والے کمرے میں رکھی ایک سکرین پر اندر داخل ہونے والے کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیتی تھی۔

یہ سارا حفاظتی نظام اُسے ''را'' نے نصب کروا کر دیا تھا۔

''را'' نے اس ملک میں اپنے سب سے مضبوط ایجنٹ کی حفاظت سے کبھی آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ''مرکز'' کی طرف عازم سفر تھا۔

بندو بھائی کے لئے پرویز کے گھر کا کوئی کونہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اس نے بھی دو سال یہاں ڈیوٹی دی تھی اور اکثر کسی نہ کسی کام سے اس کا آنا جانا بھی یہاں لگا رہتا تھا۔ اس نے وزیر صاحب کے حکم کی تعمیل بہر صورت کرنی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اپنے دل کے ارمان پورے کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ آج تو پرویز بھائی نے اُسے تھپڑ مارا تھا اس سے پہلے جب وہ اس کے گھر ڈیوٹی کرتا تھا معمولی بات پر گالی گلوچ کرنا اور بے عزتی کر دینا پرویز کا معمول تھا۔

بندو بھائی نے تنظیم کے لئے کم قربانیاں نہیں دی تھیں۔

اُس کا شمار ایک لحاظ سے تنظیم کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ وہ بنے بھائی کے گروپ کا آدمی تھا جس کی پرویز سے گاڑھی چھنتی تھی اور بنے بھائی کی زندگی میں پرویز نے کبھی جرأت نہیں کی تھی کہ اُس کے سامنے اونچی آواز سے بول بھی سکے۔

بندو بھائی نے مخالف تنظیم کی جڑیں اُکھاڑنے کے لئے بابا صاحب کے حکم پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ اُسے تو اب اپنے ہاتھوں مرنے والے بے گناہوں کی گنتی بھی بھول گئی تھی۔

بابا صاحب اور بنے بھائی کے احکامات پر اُس نے آنکھیں بند کر کے عمل کیا تھا۔ اس نے پرویز بھائی کی بھی بہت خدمت کی تھی۔

لیکن.....!

نجانے کیوں اس کا دماغ خراب ہو گیا اور اُس نے بات بات پر بندو بھائی کی بے عزتی کرنی شروع کر دی تھی اور اس کے مقابلے میں کل کے لونڈوں کو اہمیت

دینے لگا تھا۔ جب شمس میاں وزیر منتخب ہوئے تو پرویز بھائی نے اس سے جان چھڑانے کے لئے اُسے شمس میاں کو سونپ دیا۔

بندو خان نے بھی انہی کیمپوں میں تربیت حاصل کی تھی جنہیں پرویز کے باس چلا رہے تھے۔ وہ بھی ٹھنڈے دماغ کا قاتل تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ وزیر صاحب نے اگر اس کو یہ ذمہ داری سونپی ہے تو کچھ جان کر ہی سونپی ہوگی اور اس میں یقیناً بابا صاحب کی مرضی بھی شامل رہی ہوگی۔

وہ پرویز بھائی کا شکار کھلے میدان میں کھیلنا چاہتا تھا۔

اس کے لئے ضروری تھا کہ بھیڑیا اپنی کچھار سے باہر نکلے۔

بندو خان نے اپنے ایک ساتھی کو "موبائل" کے ساتھ پرویز کے گھر کے سامنے ایسی جگہ چھپا کر بٹھایا تھا جہاں سے وہ بہت کچھ آسانی سے نوٹ کر سکتا تھا۔ خود وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرکاری کار میں اس راستے پر گھات لگائے کھڑا تھا جو اس کالونی سے "مرکز" کی طرف جانے والی سڑک کو جاتا تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ انہیں یہاں کھڑے قریباً ایک گھنٹے ہونے کو آ رہا تھا۔ اس درمیان محض اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کسی کو کار پر شک نہ گزرے اس نے خواہ مخواہ آبادی کے اردگرد کئی چکر لگا لئے تھے۔

لیکن.....!

بڑی ہوشیاری سے اپنے ساتھی کی رینج سے گاڑی کو باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ دوسری سڑک کا چکر کاٹ کر واپس آئے تھے جب اس کے ساتھی کے ہاتھ میں پکڑے "موبائل" پر سگنل موصول ہوا۔

"گاڑی میں باہر آ رہا ہے۔ ڈرائیور اور دو محافظ ہیں..... اگلی نشست پر موجود ہے۔"

مختصر پیغام ملا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"تم اس طرف جاؤ اور تم اس طرف۔" بندو خان نے اپنے دونوں ساتھیوں کو پہلے سے منتخب کردہ ٹھکانوں کی طرف روانہ کر دیا۔

خود وہ کار میں بیٹھا رہا۔

پرویز بھائی کا ڈرائیور آنے والی قیامت سے قطعی بے خبر معمول کے مطابق کار چلاتا اس طرف آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی ہوگی کہ کوئی اُن پر بھی حملے کی جرأت کر سکتا ہے۔

جیسے ہی وہ اس مخصوص مقام پر پہنچا جہاں سپیڈ بریکر کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑتی تھی۔ اچانک ہی اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ سب سے پہلے حملہ آوروں نے بطور خاص گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

پرویز بھائی کا ہاتھ بمشکل ڈیش بورڈ تک پہنچا تھا جب سامنے والی سکرین کو توڑتی تین چار گولیاں یکے بعد دیگرے اس کے دماغ میں اُتر گئیں اور وہ ڈرائیور کے

بازوؤں پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

دونوں باڈی گارڈز نے دروازے کھول کر باہر چھلانگیں لگائی تھیں لیکن وہ بھی کچھ کرنے کی حسرت دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن پر بہت نزدیک سے فائرنگ کی گئی تھی۔

بندو خان بڑا ماہر نشانے باز تھا۔ اس نے پرویز بھائی کے کسی ساتھی کو زندہ بچ نکلنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کہانی کو سنانے کے لئے کوئی کردار زندہ بچ سکے۔ اس طرح بابا صاحب یا وزیر صاحب کو اپنی مرضی سے کچھ بھی بیان دینے کی آزادی میسر ہو جاتی اور وہ جس طرف چاہتے اپنی زبانوں کا رُخ پھیر لیتے۔

پرویز بھائی اپنے تینوں ساتھیوں سمیت موت کی آغوش میں سما گیا تھا۔ یہ تصدیق کرنے کے لئے اُن میں سے کسی میں زندگی کی کوئی رمق باقی تو نہیں رہ گئی۔ بندو خان اور اس کے ساتھیوں نے اُن کے سروں پر پہنچ کر بطور احتیاط بھی ان کے جسموں سے تین تین چار چار گولیاں پار کر دی تھیں۔

پرویز کی موت کی تو بندو بھائی نے بطور خاص گاڑی کا دروازہ کھول کر تصدیق کی تھی پھر مطمئن ہو کر بند کر دیا۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹتے ہوئے اُس نے اچانک ہی رُکنے کا اشارہ کیا اور بھاگ کر اپنی گاڑی میں رکھا پٹرول کا کین اُٹھا لایا۔

''گاڑی پر پٹرول چھڑکا دو..... بے چارے کی لاش بے یار و مددگار کیوں رہے۔ میں اس کا ''انتم سنسکار'' بھی اپنے ہاتھوں ہی سے کر دوں تو بہتر ہو گا۔''

اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ایک ساتھی نے گاڑی پر پٹرول کا چھڑکاؤ شروع کیا۔

''تم ان دونوں بے چاروں کو بھی گاڑی کے نزدیک گھسیٹ لاؤ۔ اپنے مالک کے پہلو میں جہنم واصل ہوں گے تو ان کے درجات مزید بلند ہو جائیں گے۔''

دوسرے ساتھی اور اپنی گاڑی کے ڈرائیور کو بندو خان نے حکم دیا۔ وہ دونوں اس کام میں جُت گئے۔

جیسے ہی وہ اپنی بندوقیں زمین پر رکھ کر کام میں مصروف ہوئے بندو بھائی کے ہاتھ میں پکڑی آٹومیٹک بندوق نے انگارے اُگلنے شروع کر دیئے اور پل جھپکتے میں وہ تینوں بھی پرویز بھائی کے ساتھیوں کے ساتھ ہی مارے گئے۔

اس نے تینوں کی بندوقیں اُن کے نزدیک پھینکیں اور کچھ دُور ہٹ کر پٹرول پر جلتی ہوئی تیلی پھینک دی۔ اب وہ مطمئن ہو کر واپس جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں سات لاشیں جل رہی تھیں۔

اُس نے قاتل اور مقتول دونوں کو اکٹھے جلا کر اپنی دانست میں اس واقعے کے تمام ثبوت ہی ختم کر دیئے تھے۔

جاری ہے...

جال

شیر گل خان نے پہلے ہی روز اندازہ کرلیا تھا کہ اختر ملک اپنی حفاظت سے غافل نہیں رہتا۔ اُس نے اپنی دانست میں اپنے گرد حفاظت کا ایسا جال بُن رکھا تھا کہ اگر شک پڑنے پر اُن کے خلاف نگرانی بھی شروع ہو تو وہ باخبر ہو جائے۔

لیکن.....!

ایک بات شیر گل نے بطور خاص نوٹ کی تھی کہ ملک اختر نے کسی کو اپنی پرائیویٹ لائف میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی تھی۔ خصوصاً شہر کے جس ماڈرن اور انتہائی مہنگے علاقے میں اُس نے فلیٹ لے رکھا تھا وہاں اس کے فلیٹ پر سوائے ایک بیرے اور ایک چوکیدار کے اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ یہ چوکیدار اُس نے محکمے کی طرف سے نہیں بلکہ اپنے طور پر رکھا ہوا تھا اور کوئی سابق فوجی دکھائی دیتا تھا۔

اس علاقے میں جو سمندر کنارے اس شہر کا سب سے مہنگا علاقہ تھا جو فلیٹس بنائے گئے تھے وہ جدید ترین لگژری فلیٹس کہلاتے تھے۔ ایک دوسرے سے الگ تھلگ، محفوظ اور زندگی کی تمام ضروریات سے آراستہ..... جنہیں فلیٹ کہنا تو غلط تھا البتہ اپارٹمنٹس ضرور کہے جا سکتے تھے۔

شیر گل خاں نے ملک اختر کے تعاقب میں اپنی شناخت کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فی الوقت اپنا ڈیرہ اُس کے گھر کے سامنے ہی جمانے کی ٹھانی تھی۔

ملک اختر کے گھر کے سامنے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر سمندری ساحل شروع ہو جاتا تھا۔

ساحل کا یہ حصہ کچھ غیر آباد سا تھا کیونکہ اس طرف سہولیات موجود نہیں تھیں اس لئے عام لوگ تو اُدھر کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی فلموں والے اس طرف شوٹنگ کے لئے آ جاتے تھے یا پھر کوئی شوقین مزاج یا تنہائی پسند یہاں سمندر کنارے پتھریلی چٹانوں پر بیٹھ کر پتھروں سے سر پٹختی لہروں کو دیکھتا رہتا تھا۔

شیر گل نے فی الوقت ایک طاقتور دُوربین کے ساتھ ایسی ہی ایک پتھریلی چٹان پر ڈیرہ جما رکھا تھا۔

وہ اپنے ساتھ کچھ کتابیں اور ایک فائل سی پکڑ کر اس طرح کا تاثر پیدا کر رہا تھا جیسے وہ فلسفے کا کوئی طالب علم ہو اور یہاں اُس کی آمد کا مقصد کوئی بڑا ہی دقیق مقالہ تحریر کرنا ہے۔ اگر وہ بھیس بدل کر نہ بیٹھتا تو بھی اس بات کا سوال بہت کم اٹھتا تھا کہ کوئی اس کی حرکات کا نوٹس لے گا۔ کیونکہ ان خوبصورت بنگلوں کے مکینوں کے پاس کسی کی کسی بھی حرکت کا نوٹس لینے کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔

یہاں شہر کے وی آئی پیز رہتے تھے اس لئے دن میں ایک دو مرتبہ اور اسی طرح شام ڈھلے یا رات دیر گئے ایک آدھ چکر اس طرف کا پولیس کی کوئی گشتی جیپ لگا لیا

کرتی تھی یا پھر اس سڑک سے کبھی کبھی ایک آدھ گھنٹہ بعد کوئی کار، بس یا ویگن گزرتی تھی اور بس۔

دو دن سے شیر گل خان کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ملک اختر کے دفتر جانے سے پہلے اور شام کو دفتر سے آنے کے بعد دیر گئے تک یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ اُس کی دُوربین کے شیشے رات کے اندھیرے میں بھی دن کے اُجالے کی طرح سارے منظر دیکھ لینے کی طاقت رکھتے تھے۔

ان دو دنوں میں تو اُس نے کوئی خلافِ معمول بات نوٹ نہیں کی تھی سوائے ان دو تین عورتوں کے جو اُس کے ساتھ ہی آتی اور چلی جاتی تھیں یا پھر اس سے ملنے والے کچھ پرائیویٹ مہمان جن میں سے ہر ایک کی نگرانی کرنا اُس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

آج اُسے تیسرا دن تھا اور کسی چھٹی حس کے تابع وہ معمول سے کچھ پہلے ہی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل معمول کے مطابق پتھروں کی اوٹ میں اس طرح پارک کر رکھی تھی کہ اس پر کسی کی نظر پڑنا ممکن نہیں تھا۔

آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے اعلیٰ افسر سے درخواست کر کے ایک کار بھی نگرانی کے لئے منگوالی تھی جسے اُس کا ایک ماتحت اور انتہائی قابلِ اعتماد ساتھی چلا رہا تھا۔ شیر گل خان کی ہدایت پر کار اُس نے آبادی کے دوسرے کونے میں پارک کی تھی اور اس کی کسی ہدایت پر ہی اُسے یہاں سے کسی طرف موو کرنا تھا۔

●

سورج شیر گل کے عقب میں سمندر کے پانیوں پر اپنی سرخیاں بکھیرتا مغرب کی طرف عازمِ سفر تھا۔

یہ منظر اتنا دلفریب ہوتا کہ وہ اکثر اس میں کھو جاتا۔ اُسے سمندر کی لہروں پر کپکپاتی سورج کی روشنیاں بہت بھاتی تھیں۔ خصوصاً جب آخری لمحات میں سورج آگ کے گولے کا روپ دھار لیتا اور سارا منظر سُرخی مائل ہو جاتا تو شیر گل خان کو اپنے وجود میں ایک بے نام سی طمانیت اترتی محسوس ہوتی۔ ان لمحات میں کئی مرتبہ اُس کا دل چاہا کہ عارفہ اُس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ دونوں مل کر اس منظر سے محظوظ ہوں۔

لیکن.....!

یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اُس نے عارفہ سے متعدد ملاقاتیں کی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں متعدد مرتبہ اپنا حالِ دل بیان کیا تھا۔ دونوں نے کئی مرتبہ ذو معنی فقروں سے ایک دوسرے تک اپنا احوال پہنچایا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے درمیان ایک حد فاصل قائم رکھی تھی۔ دونوں کی خواہش تھی کہ وہ ایک دوسرے سے سوائے محبت کے اور کسی موضوع پر بات نہ کیا کریں۔

لیکن.....!

دونوں کبھی کھل کر اس موضوع پر بات نہیں کر سکے تھے۔ اگلے ہی روز جب عارفہ اس سے ملنے آئی تھی بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''پرویز بھائی کو کسی نے مار ڈالا.....''

اُس نے اپنی دانست میں شیر گل تک بڑی اہم خبر پہنچائی تھی۔

''ہاں! میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔''

اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

''بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے..... کسی نے اُس کے ساتھیوں کو پرویز سمیت قتل کر کے اُن کی لاشیں بھی جلا ڈالیں..... شاید اُن جیسا ہی کوئی درندہ ہوگا۔''

عارفہ نے اس کی آنکھوں میں اس طرح جھانکا جیسے اپنے اس فقرے کا ردعمل جاننا چاہتی ہو۔

''یہ وحشی لوگ ہیں عارفہ..... ان کی دوستیاں اپنے مخصوص مفادات کے تابع ہوتی ہیں..... تم یہ سمجھ لو جیسے جنگل میں وحشی درندے ایک دوسرے سے مل کر زندگی گزارتے ہیں اور موقع ملنے پر ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں بالکل یہی حالت ہے ان لوگوں کی..... جہاں ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں یہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں..... پرویز اور اس کے ساتھیوں کو کسی اور نے نہیں..... میرا اندازہ ہے کہ بابا صاحب نے خود ہی مروایا ہوگا۔''

''آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔''

عارفہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ یہ حرکت بابا صاحب ہی کی ہے..... یونیورسٹی میں بھی یہ لوگ یہی کچھ کرتے ہیں۔ موقعہ ملنے پر ایک دوسرے کو گولی سے اُڑا دینا اُن کے لئے بچوں کا کھیل ہے۔ شاید اس طرح قدرت ان موذیوں کے ہاتھوں سے ہی ان کو اپنے اپنے بھیانک انجام تک پہنچاتی ہوگی۔

''شیر گل میرا دل کہتا ہے یہ لوگ اس طرح ایک دوسرے کے ہاتھوں ہی مارے جائیں گے۔ شاید اب ہمارے حکمرانوں کی بے حسی کو دیکھ کر قدرت نے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔''

عارفہ نے اپنے دل کی بات لبوں پر لاتے ہوئے کہا تھا۔

''عجیب اتفاق ہے ہم جب بھی ملتے ہیں اس موضوع پر باتیں کرتے رہتے ہیں حالانکہ اور بھی کئی موضوعات ہیں۔''

آج پہلی مرتبہ شیر گل نے اُسے کہہ ہی دیا۔

''ہاں! میں بھی یہ محسوس کرتی ہوں لیکن.....''

اس سے آگے اُس نے کچھ کہنے کی بجائے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

شاید وہ شیر گل کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کے چہرے کی سنولاہٹ میں اب حیا کی سُرخی بھی اُتر آئی تھی اور اس کے دونوں گال اس طرح تمتمانے لگے

تھے جیسے اُس کے رخساروں پر شفق کی ساری سُرخی اُتر آئی ہو۔

''عارفہ! ہم بھی کیا لوگ ہیں..... اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہم ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔''

''اصل مسئلہ تو ابلاغ کا ہے ناں..... جب آگہی ہو تو زبان کو زحمت دینا کیا ضروری ہے۔''

عارفہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

''بس آپ اہل زبان میں یہی تو خوبی ہے۔ بات کہنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔''

شیر گل نے کہا۔

''اور بات بنانا آپ سے۔''

عارفہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

دونوں چند گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے حسب سابق ماضی اور حال کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں۔

لیکن.....!

اس ملاقات میں بھی اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی بات چاہنے کے باوجود ایک دوسرے سے نہ کہہ سکے۔

●

اپنی آنکھوں سے دُوربین لگا کر اُس نے دُور ہی سے ملک اختر کی کار پر نظریں جمائی تھیں۔ حسب سابق اُس کی کار میں اگلی سیٹ پر ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ شیر گل کے لئے اس کے ساتھ کسی لڑکی کی موجودگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، کیونکہ ملک اختر کی عیاش طبیعت سے بخوبی آگاہ تھا۔

لیکن.....!

جیسے ہی اس کی کار اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی ہوئی اور شیر گل نے اس لڑکی پر فوکس کیا تو اچانک وہ چونک پڑا۔

کون ہے یہ؟ کون ہے یہ؟

اس کے ذہن میں تکرار ہونے لگی۔

اچانک اُسے یاد آ گیا یہ تو وہی ہے جس کی تلاش میں اُس نے اس شہر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ جس کی تصویر کو اُس نے اپنے ذہن میں یوں اُتار لیا تھا کہ اب کوئی بار بار کھرچنے پر بھی نہ مٹا پاتا۔

یہ مینا کشی تھی۔

میناکشی کی اچانک دریافت نے اُس کے دل کی دھڑکن تیز کردی تھی۔ اُس نے میناکشی پر دُوربین کے شیشوں کو اس وقت تک فوکس کیے رکھا جب تک کہ کار گیٹ میں داخل نہیں ہوگئی۔

میناکشی کی اُس کے ساتھ موجودگی کے بعد ملک اختر کے خلاف کوئی ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جس طرح کی رپورٹ اُس سے متعلق مل رہی تھی اور حال ہی میں اس نے جس چکر بازی اور ہوشیاری سے تنظیم کے تازہ اسلحے کی کھیپ اُن تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔ اس کے بعد ملک اختر کے ہاں میناکشی کا پایا جانا اس کا ثبوت تھا کہ وہ میناکشی کی اصلیت سے آگاہ ہے۔

اگر میناکشی نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ وہ ''را'' کی ایجنٹ ہے تو بھی اُسے یہ ضرور علم ہوگا کہ میناکشی کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے ہے۔ شیر گل کو علم تھا کہ ''را'' کے لوگ اپنے شکار کو عموماً اپنی اصلیت بتائے بغیر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کی ہر انٹیلی جنس ایجنسی کی طرح انہیں بھی آم کھانے سے مطلب ہوتا ہے گٹھلیاں گننے سے نہیں۔

عین ممکن تھا کہ میناکشی نے اسے اپنا کوئی اسلامی نام بتایا ہو۔

یقیناً اُس نے اپنا رشتہ تنظیم کے کسی عہدیدار سے قائم کیا ہوگا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ اُس نے یہاں اپنے کچھ بہن بھائی یا اپنی کوئی فیملی بھی ملک اختر کو دکھادی ہو۔ اس سب کچھ کے باوجود ملک اختر کو یہ علم رہا ہوگا کہ میناکشی کا تعلق کسی مجرموں کے گروہ سے ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ گھوم رہا ہے تو ایک آفیسر ہونے کے ناطے وہ بھی اس کے گناہ میں برابر کا شریک ہے۔

خوشی اور کامیابی کے ملے جلے احساس سے شیر گل خان اپنی موٹر سائیکل کی طرف جارہا تھا جس کے دائیں ہاتھ نصب لوہے کے ڈبے میں دستی ٹیلی فون رکھا تھا اور بڑے موٹر سائیکل کی بیڑی سے اس کا کنکشن ہونے کی وجہ سے اُس میں زندگی بیدار رہتی تھی۔

اس نے بمشکل اپنی انگلیوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اپنے افسرِ اعلیٰ سے رابطہ کیا تھا۔

یہ وہ خصوصی نمبر تھا جو افسرِ اعلیٰ کے چند جانثار ساتھیوں تک محدود تھا اور جس پر وہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔

''سر!''

اس نے رابطہ ملتے ہی جذبات سے بے قابو آواز میں کہا۔

''سر! بڑی کامیابی ہوئی ہے..... میناکشی مل گئی..... ملک اختر اسے اپنے ساتھ لایا ہے۔''

''ویل ڈن..... ویل ڈن مائی بوائے..... ونڈرفل۔''

افسرِ اعلیٰ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

شیر گل نے افسرِ اعلیٰ کو بتایا تھا کہ اب مینا کشی یہاں سے صبح واپس جائے گی اور اس کا بھی وہی طریقہ ہوگا جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے۔ جنہیں ملک اختر رات بھر عیاشی کرنے کے بعد صبح پرائیویٹ کار سے واپس بھیجتا ہے یا پھر انہیں کوئی لینے آتا ہے۔ وہ خود کبھی ان کے ساتھ واپسی کا سفر نہیں کرتا۔

اس نے افسرِ اعلیٰ سے درخواست کی تھی کہ کم از کم چار گاڑیاں اُس کا تعاقب کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کریں۔

یہ کام وہ لوگ ایک گاڑی سے بھی لے سکتے تھے لیکن شیر گل خان کی خواہش تھی کہ اس کامیابی کو معمولی سی غلطی کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے کہیں ان لوگوں کو تعاقب کا شک ہو گیا تو وہ بہت محتاط ہو جائیں گے۔

''تم بے فکر ہو جاؤ..... یہیں ڈٹے رہو..... میں آصف کو تمہاری مدد کے لئے بھیج رہا ہوں..... تھوڑی دیر تم آرام کر لو..... صبح پھر ڈیوٹی سنبھال لینا۔''

افسرِ اعلیٰ نے کہا۔

''نو سر! آپ مطمئن رہیں۔ اس کھیل میں کم سے کم لوگ ہی شامل ہوں تو بہتر ہے میں ساری رات یہیں گزاروں گا۔ آپ باقی بندوبست کر دیں۔''

وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''او کے..... او کے..... جیسے تم کہہ رہے ہو ویسے ہی ہوگا۔ خدا حافظ۔''

افسرِ اعلیٰ کو اپنے ماتحت کے جذبات اور کام کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک اختر کے اپارٹمنٹ کے چاروں طرف انٹیلی جنس کی گاڑیوں میں مستعد اہلکار شیر گل کی کسی بھی ہدایت کے منتظر بیٹھے تھے۔

شیر گل خان نے ابھی تک اپنی آنکھوں سے دوربین لگا رکھی تھی۔ اُس نے ملک اختر کے گھر کی چھت کو فوکس کیا ہوا تھا۔ اُسے علم تھا کہ چھت پر رکھی ہوئی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر ہی ملک اختر اور اس کی داشتائیں شغل مے نوشی کرتے ہیں جس کے بعد وہ لوگ نیچے چلے جایا کرتے تھے۔

اس کے اندازے کے مطابق قریباً پندرہ بیس منٹ بعد اُس نے دونوں کو انہیں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے دیکھ لیا۔

اب مینا کشی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے موجود تھی۔

اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جس کی توقع شیر گل خان کو تھی۔ ملک اختر جیسے جنسی مریض کو پھانسنے کے لئے ایسا ہی پھندا لگایا جا سکتا تھا۔

دونوں وہاں بیٹھے مے نوشی کرتے رہے۔ اس درمیان انہوں نے بیہودہ حرکات بھی شروع کر دی تھیں۔ جس کے بعد آتش شوق بجھانے دونوں نیچے چلے گئے تھے۔

شیر گل اپنی جگہ ڈٹا رہا۔

اس نے اپنے ساتھ رکھے ''واکی ٹاکی'' پر کار میں موجود اپنے ساتھی سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں منگوالی تھیں اور اب سڑک کنارے کھڑا اس کا منتظر تھا۔

''واکی ٹاکی'' پر سگنل اُسے مل چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُسے ایک کار اپنی طرف آتی دکھائی دی جس میں موجود اس کے ساتھی نے گاڑی روک کر اس کا بونٹ اس طرح اوپر اٹھالیا تھا، جیسے اچانک اس میں کوئی نقص آ گیا ہو۔

شیر گل خان لاپرواہی سے چلتا اس کے نزدیک پہنچ رہا تھا جب اُس کے ساتھی نے اگلی سیٹ پر رکھا ایک شاپنگ بیگ باہر رکھ دیا جو شیر گل نے چلتے چلتے ہی اُٹھالیا اور اس سے بغیر کوئی بات کیے واپس اپنے مورچے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بیگ میں اس کے لئے لنچ بکس، چائے کا تھرموس اور ایک کاغذ پر لکھا ہوا پیغام تھا کہ اس کی ہدایت کے مطابق گاڑیاں پہنچ چکی ہیں اور اُسے کس طرح اُنہیں سگنل دینا ہے۔

شیر گل خان ایک قدرے آرام دہ جگہ پر پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا جب اُسے دُور سے کسی کار کی روشنیاں ملک اختر کے گھر کی طرف لپکتی دکھائی دیں۔

ایک مرتبہ پھر وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

اپنے گلے میں لٹکتی دُوربین اُس نے آنکھوں سے لگائی تھی۔

اندھیرا اب دن کے اُجالے پر مکمل غالب آ چکا تھا اور دُور دُور تک سوائے سمندر کی لہروں کے شور کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

لیکن.....!

اس دُوربین کی مدد سے باہر کا منظر دن کے اُجالے کی طرح روشن تھا۔ بڑی مرسڈیز کار تھی جو گیٹ پر آ کر رُکی اور اس میں سے ایک شخص باہر نکلا جس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

ایک مرتبہ پھر وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

یہ شیر گل کے لئے دوسرا ''سرپرائز'' تھا۔

گھنٹی بجانے والا جبار تھا۔

''آستانے'' کا موجودہ انچارج۔

پرویز کی موت کے بعد ان لوگوں کو اُمید تھی کہ اس کی ذمہ داریاں جبار کو ہی سونپی جائیں گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔

جبار کے ساتھیوں کی شکلیں گاڑی میں بیٹھے ہونے کی وجہ سے نمایاں نہیں تھیں۔ لیکن یہ بھی کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ یقیناً یہ بھی اُس قبیل کے لوگ ہوں گے، اُس نے سوچا۔

گیٹ کھل گیا تھا۔ گاڑی اندر چلی گئی اور شیر گل خان قدرے مطمئن ہو کر چائے پینے لگا۔

قریباً دو ڈھائی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس دوران بمشکل ایک مرتبہ پولیس کی ایک گشتی جیپ نے اِدھر کا چکر لگایا تھا۔

رات کے قریباً بارہ بجنے والے تھے جب ایک مرتبہ پھر دروازہ کھلا جس سے مرسڈیز اپنے سواروں سمیت واپس برآمد ہوئی۔ شیر گل خان نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ اس کار میں مینا کشی سوار نہیں ہے۔

اُس نے اپنے بائیں ہاتھ رکھے ''واکی ٹاکی'' پر اپنے ساتھیوں کو مرسڈیز کے نمبر، رنگ اور پوزیشن سے آگاہ کرنے کے بعد اس کے تعاقب کی ہدایت کی اور پھر اپنی جگہ ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ زندگی میں پہلی مرتبہ رات جاگ کر نہیں گزار رہا تھا۔ ایسی سینکڑوں راتیں اُس نے اس سے پہلے بھی گزاری تھیں۔ اپنی نوکری میں بھی اور اس سے پہلے بھی۔ جب وہ کالج لائف میں سکاؤٹ تھا تو 'کیمپ فائر' میں اکثر شمولیت کیا کرتا تھا۔

صبح کب ہوئی اور رات کب گزر گئی۔

شیر گل کو احساس ہی نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھی نے شاید اس کی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے اس کے لئے چھوٹا سا ٹیریو اور دو تین کیسٹ بھی ساتھ ہی رکھ دیئے تھے تا کہ اس کی دلچسپی کا کوئی سامان تو وہاں موجود ہو۔

لیکن.....!

شیر گل نے ایک کیسٹ بمشکل سنا تھا جب اس کی طبیعت اُکتا گئی اور اس نے سمندر کے سینے پر بہت دُور اندھیرے میں رینگتے اُن جہازوں اور سٹیمروں پر نظریں جمالیں جو یہاں سے معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔

●

صبح کی نماز اس نے وہیں بوتل میں بچے تھوڑے سے پانی سے وضو کر کے ادا کی اور پھر چوکنا ہو کر بیٹھ رہا۔

اختر ملک کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا۔

وہ حسب معمول اکیلا اپنی کار چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا تعاقب فضول تھا۔ کیونکہ شیر گل خان جانتا تھا کہ وہ یہاں سے سیدھا اپنے آفس ہی کی طرف جائے گا۔

لیکن.....!

وہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کے زوال کی مہر اس کی بدکرداری کے سبب اس پر ثبت ہو گئی ہے اور اس کے افسرِ اعلیٰ نے راتوں رات ہائی کمان سے رابطہ کر کے ملک

اختر کے فون ''بگ'' کرنے کی اجازت طلب کر لی تھی۔

آئی ایس آئی کے آہنی شکنجے نے غدارِ وطن ملک اختر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اب اس کا فرار ناممکن ہو چکا تھا۔

اس کی روانگی کے قریباً پندرہ بیس منٹ بعد اس نے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا گاڑی وہاں رُکتے دیکھی یقیناً وہ مینا کشی کو لینے آئی تھی۔ ڈرائیور نے جو اکیلا ہی گاڑی یہاں تک لایا تھا کار سے نکل کر گھنٹی بجائی۔ اندر موجود چوکیدار نے جھانک کر باہر دیکھا اور گردن ہلاتا اندر چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی شیر گل خان نے ''واکی ٹاکی'' پر اپنے ساتھیوں کو کار سے آشنا کروا کر اگلی ہدایات دے دی تھیں اور اب اپنے موٹر سائیکل کی طرف جا رہا تھا جسے دھکیلتا ہوا وہ سڑک تک لے آیا تھا۔

175 سی سی کے موٹر سائیکل کا سلف دباتے ہی انجن سٹارٹ ہو گیا۔

مینا کشی حسب سابق بڑے اطمینان سے مٹکتی ہوئی باہر نکلی۔ چوکیدار نے ''بیگم صاحبہ'' کو سلیوٹ کیا اور اُس نے اپنے بیگ سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

لیکن.....!

اُسے احساس نہ ہو سکا کہ اس کوٹھی سے کچھ فاصلے پر رُکی ایک کار کے پیچھے کھڑے ایک نوجوان نے بڑے طاقتور لینز کے ذریعے اس کی باقاعدہ فلم بندی شروع کر دی تھی۔ اس کی مصروفیات اور ملک اختر کے ساتھ مشغولیات کو اب اُن لوگوں نے سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔

بیک وقت تین کاریں اور شیر گل خان اپنی موٹر سائیکل پر اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اُن لوگوں نے مینا کشی کی کار کو اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ اس کو تعاقب کا شک ہی نہیں گزر سکتا تھا۔ کبھی ایک کار اُس کے آگے ہو جاتی اور دوسری پیچھے پھر تینوں اپنی جگہیں بدل لیتے۔ جبکہ سڑک کے ایک کنارے سے شیر گل خان کی موٹر سائیکل بھی اُن کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔

جیسے ہی وہ لوگ معروف شاہراہ پر داخل ہوئے دو کاریں ایک طرف مڑ گئیں لیکن ان کی جگہ لینے کے لئے دوسری دو کاریں وہاں آ گئی تھیں۔ ایک مرحلے پر پھر تیسری کار بھی ایک طرف مڑ گئی اور اس کی جگہ ایک موٹر سائیکل سوار نے لے لی۔

افسرِ اعلیٰ نے شیر گل خان کے کہنے پر مینا کشی کے لئے شک کی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑی تھی۔

اس سفر کا اختتام شہر کے دوسرے کونے میں موجود ایک خواتین کے ہوسٹل پر ہوا۔

یہ ہوسٹل ترقی پسند خواتین کی ایک مقامی انجمن چلا رہی تھی۔ جس کی کرتا دھرتا تین چار بڑی بڑی بیگمات تھیں جن کے متعلق اس شہر کے شرفاء کو کسی طرح کی کوئی غلط فہمی نہیں تھی اور اُن کے ''پارٹ ٹائم مشاغل'' سے اکثر باخبر لوگ مکمل باخبر رہتے تھے۔

اس ہوسٹل میں عموماً ستم رسیدہ معاشرے کی ستائی ہوئی خواتین یا پھر وہ عورتیں جن کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو، پناہ لیا کرتی تھیں۔

مینا کشی نے بھی یقیناً ان میں سے کسی ایک کا روپ دھارا ہوگا۔

نیلے رنگ کی کار نے اُسے ہوسٹل کے گیٹ کے سامنے اُتارا تھا۔ گیٹ پر موجود بڑی بڑی مونچھوں والے چوکیدار نے جو شکل ہی سے کوئی دلال لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کر اپنے استقبالیہ دانت نکالے تو مینا کشی نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر بھی پچاس کا ایک نوٹ رکھ دیا اور لاپرواہی سے مٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

●

کاروں نے ہوسٹل کے مختلف کونوں میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں فی الوقت انہیں شیر گل کے فیصلے کا انتظار تھا۔

مینا کشی کو اس مرتبہ بھی احساس نہ ہو سکا کہ نہ صرف طاقتور لینز والے ایک کیمرے نے اُس کی کار کے اُترنے سے اندر جانے تک کی درجنوں تصاویر اُتار لی تھیں بلکہ دوسرے کیمرے نے اُس کی باقاعدہ فلمبندی بھی کر لی تھی۔

شیر گل کے اشارے پر اُن کا ایک ساتھی اس نیلی کار سے چپک گیا تھا جس کے ذریعے مینا کشی یہاں تک آئی تھی۔ اُس کی نظروں سے غائب ہونے کے بعد شیر گل خان ٹہلتا ہوا گیٹ کے سامنے پہنچ گیا اُس نے آنکھ کے اشارے سے چوکیدار کو ایک طرف بُلایا تھا۔

چوکیدار اس کے اندازے کے مطابق خاصا تجربہ کار دکھائی دیتا تھا وہ بھی بڑے اطمینان سے اُس طرف آ گیا۔

"کیا بات ہے؟"

اس نے بظاہر بڑے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"یار..... کیوں ناراض ہوتے ہو..... ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک نوٹ بٹوے سے نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ چوکیدار نے نوٹ کی شکل دیکھی اور پگھل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صاحب لوگ یہاں کیوں آتے ہیں۔

"بڑا زبردست مال ہے۔"

اُس نے لوفروں کی طرح آنکھ دبائی۔

"کون سا بابو جی۔"

چوکیدار نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"یار..... تم نے ابھی تک ہمیں بتایا ہی نہیں۔ کوئی اچھا سودا کروا دو۔ ہمارا سیٹھ کروڑ پتی آدمی ہے۔ ایک آدھ سودے سے ہی اندازہ ہو جائے گا۔"

شیر گل خان نے اندازہ کر لیا تھا کہ جو لوگ اس ہوسٹل سے لڑکیوں کو لے کر جاتے ہیں اس چوکیدار کی مٹھی یقیناً گرم کرتے ہوں گے اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کون کس کے ساتھ جاتا ہے۔

''بابو جی..... آپ پروین بی بی کی بات تو نہیں کر رہے جو ابھی نیلی کار سے آئی ہیں۔''

چوکیدار نے پوچھا۔

''ہاں یار..... بس میرے سیٹھ کا دل آ گیا ہے اس پر۔ ذرا بات تو کروا دو ہماری۔''

شیر گل خان بولا۔

''ناں بابو ناں..... معاف کرنا۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ۔ میں بہت اچھا بندوبست کر دوں گا..... دو تین اور بیبیاں ہیں۔ بڑی ماڈرن ہیں۔ خوش ہو جاؤ گے تم انہیں دیکھ کر۔''

چوکیدار نے جواب دیا۔

''یار اسے کیا ہے۔ بھئی تم بیبیوں سے نہ گھبرانا اپنا سیٹھ کوئی معمولی آدمی نہیں..... میں نے کہا ناں، تمہاری لائف بنا دے گا۔''

شیر گل نے اس کی طرف دیکھ کر لوفروں کی طرح آنکھ دبائی۔

''بابو جی..... ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن پروین بی بی کسی بڑے سرکاری افسر کے ساتھ سیٹ ہے وہ کسی کو لفٹ نہیں کرواتی۔ میرے ساتھی نے ایک مرتبہ کوشش کی تھی اس کی نوکری سے چھٹی ہو گئی۔''

چوکیدار نے مجبوری ظاہر کی۔

''کون سا سالا ایسا سرکاری افسر آ گیا۔''

شیر گل نے جانتے بوجھتے اُسے کریدنے کے انداز میں پوچھا۔

''صاحب ہمیں اس کے نام کا تو علم نہیں۔ بڑا سمارٹ سا نوجوان ہے بڑی قیمتی گاڑی پر آتا ہے۔''

چوکیدار نے اُسے گاڑی کا رنگ اور نوجوان کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔ جو حلیہ اُس نے بیان کیا وہ ملک اختر ہی کا تھا۔

''یار تم نے بڑا مایوس کیا..... اپنا سیٹھ سالا کوئی بات نہیں مانے گا۔ اچھا تم ایک کام کرو۔ کسی طرح اس افسر کا پتہ لگا دو۔ ہمارا سیٹھ خود ہی کوئی چکر چلا لے گا۔ بے فکر رہنا۔ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا اور تمہارا کمیشن تمہیں ملتا رہے گا۔ ایک مرتبہ میرے سیٹھ کا دل ایک ایکٹریس پر آ گیا تھا۔ اُس نے اپنی ایک قیمتی کار اور کوٹھی اُسے دے کر اُس کے عاشق سے توڑ لیا تھا۔ اس کی کیا مجال ہے۔ یہ لو تم یہ رکھو اور اُس کا پتہ لگانا..... باقی کام میرا سیٹھ کر لے گا۔''

اُس نے سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چوکیدار کی تو آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ اتنا ''دیالو'' اور مہربان گاہک تو اُسے آج تک نہیں ملا تھا۔ ضرور یہ کسی بہت بڑے آدمی کا ملازم ہے۔

''دوسرے تیسرے دن دوپہر 2 بجے کے بعد وہ آتا ہے اس طرف اور دونوں شاید اکٹھے لنچ وغیرہ کرنے جاتے ہیں۔ آج بھی اُدھر ہی گئی ہوگی۔ اب شاید وہ کل پرسوں آئے گا۔ میں آپ کو بتا دوں گا..... آپ کل ایک ڈیڑھ بجے آ جانا۔''

چوکیدار نے کن انکھیوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے..... خدا حافظ۔''

شیر گل خان نے اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور واپس لوٹ آیا۔ اُس نے اپنے ایک ساتھی کو جسے مینا کشی کی شناخت ہو گئی تھی اس کی مستقل نگرانی پر لگا کر اپنی راہ لی۔

یہاں سے وہ سیدھا اپنے آفس آیا تھا جہاں اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی افسرِ اعلیٰ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

''شاباش جوان۔ تمہارے لئے خوشخبری موجود ہے۔ تمہارا عہدہ بڑھا دیا گیا ہے..... ویل ڈن مبارکباد۔''

افسرِ اعلیٰ اس کی کارکردگی سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

شیر گل خان نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چوکیدار کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے اُن سے درخواست کی تھی کہ کسی لیڈی آفیسر کو اس ہوسٹل میں داخلہ دلوا کر مینا کشی کی نگرانی پر فوراً مامور کر دیا جائے۔

''میرے ذہن میں پہلے سے یہ بات موجود ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ اب اُسے دُنیا کی کوئی طاقت ہماری نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی..... یہی تو ہے جس کے ذریعے ہمیں سانپ کے بل کے اندر گھس کر اسے باہر نکالنا ہے۔''

افسرِ اعلیٰ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

دونوں اگلا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ اُس نے عارف میاں کی مدد لینے کے خصوصی اختیارات حاصل کر لئے تھے۔ افسرِ اعلیٰ کے دل میں اس نے عارف میاں کے لئے خاصا احترام پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اس کی خدمات کا وقت پڑنے پر ضرور مول چکائیں گے اور اُس پر قانونی گرفت نہیں ہونے دیں گے۔

شیر گل نے تھوڑی دیر بعد وہاں سے رخصت لے لی اور گھر آرام کرنے چلا گیا۔

***

شکنجہ

شام گئے تک وہ گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔

اُس کی آنکھ کھلی تو سرہانے رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے ماتحت نے اُسے اطلاع دے دی تھی کہ اب تک تین مرتبہ اس کے لئے عارف کا فون آ چکا ہے۔ عارف کے اصل نام سے اس کا کوئی ساتھی آگاہ نہیں تھا اور وہ اپنے کوڈ نام کے ساتھ بات کیا کرتا تھا۔ شیر گل نے اُسے خصوصی ہدایت کی تھی کہ وہ کبھی فون پر اصل نام نہ لے۔ اُس نے جان بوجھ کر عارف کو اپنے گھر کا فون نمبر نہیں دیا تھا۔ عین ممکن تھا کبھی تنظیم کو اس پر شک گزرتا اور وہ لوگ عارف میاں کی نگرانی شروع کر دیتے۔

لیکن.....!

ایسا بندوبست موجود تھا کہ عارف کا پیغام ملنے کے چند منٹ بعد ہی وہ اس سے رابطہ کر سکتا تھا۔ آج اس کے ماتحت نے شاید اس لئے اُسے دیر سے فون کیا تھا کیونکہ اُسے علم تھا کہ شیر گل خان ساری رات جاگتا رہا ہے۔

اُس نے فوراً ہی عارف سے رابطہ قائم کر لیا تھا جس نے ہوٹل پہنچنے کو کہا تھا۔ اگلے آدھ گھنٹے میں وہ عارف کے سامنے موجود تھا۔ دونوں نے اپنی ملاقات کے لئے جس جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا وہ اتنی محفوظ تھی جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ ایک عام سا ہوٹل تھا جس کا مالک شیر گل خان کے گاؤں کا ایک آدمی تھا۔ جسے شیر گل نے عارف کی پہچان کرواتے ہوئے اُسے اپنا جگری دوست بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اُس کے لئے فوراً ہوٹل کا کمرہ ریزرو کر دیا کرے۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق ایک کمرے میں بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔

''آپ کے لئے ایک زبردست خبر ہے خان صاحب۔''

عارف نے چھٹتے ہی کہا۔

''اور تمہارے لئے بھی..... لیکن پہلے تم سناؤ۔''

شیر گل خان نے اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔

''آستانے میں یہ افواہ ہے کہ پرویز کو منسٹر صاحب نے مروایا ہے۔ میں نے اپنے طور پر جبار کو اعتماد میں لے کر بات کی ہے۔ اُس کا شک بھی منسٹر پر ہی ہے۔ لیکن

وہ لوگ اس لئے چپ ہیں کہ منسٹر صاحب بابا صاحب کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا..... جس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ بابا صاحب نے ہی پرویز کی چھٹی کروانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ پرویز کو رخسانہ کی مخاصمت لے ڈوبی جناب..... یہ سالی! بڑی مضبوط عورت ہے۔ بابا صاحب کے اعصاب پر سوار رہتی ہے..... آج کل اس نے بابا صاحب کو "کشتوں" پر لگا دیا ہے۔ یہ سونے چاندی کے کشتے اب اُن کے گردوں کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں اور آستانہ والے جانتے ہیں کہ بابا صاحب کو گردوں کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے..... میں نے خود شہر کے دو گردوں کے سپیشلسٹ، جو تنظیم کے بااعتماد ساتھی ہیں، بابا صاحب کے ہاں اکثر آتے جاتے دیکھے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ سالی رخسانہ اُسے کشتے کھلا کھلا کر اُس کے گردے ناکارہ کروا دے گی اور خود تنظیم کی قیادت سنبھال لے گی۔ آپ دیکھیں ناں جناب کہ اب اس کا کون سا مخالف زندہ بچا ہے۔ میرے خیال سے اس وقت تنظیم میں کوئی ایسی شخصیت ہی نہیں رہ گئی جو اس کے ہم پلہ ہو اور بابا صاحب تو اس کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ افسوس جس شخص نے اس ملک کے حکمرانوں کو نچا کر رکھ دیا ہے اس کو ایک فاحشہ عورت اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہے۔"

عارف نے اُسے مطلع کیا۔

"اگر یہ کارنامہ منسٹر نے انجام دیا ہے تو تمہارے خیال میں کس کے ہاتھوں پرویز اپنے انجام کو پہنچا ہوگا۔"

شیر گل نے اگلا سوال کیا۔

"بندو خان کے..... وہی ایک ایسا شخص ہے اس کے پاس جس کے لئے اتنے بے شمار قتل کر دینا کوئی مشکل بات نہیں..... آپ کو علم ہے کہ اُس نے اپنے تین ساتھیوں کو بھی اس کے ساتھ ہی مار ڈالا۔ درندہ ہے سالا۔ درندہ..... اس کی یہی خاصیت ہے کہ اپنے جُرم کا کوئی ثبوت نہیں رہنے دیتا..... ہاں جی..... میں نے اُسے قتل کرتے نہیں دیکھا لیکن طریقہ واردات اسی کی چغلی کھا رہا ہے۔"

اُس نے رُک کر چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔

"پرویز بھائی نے اس کی بہت بے عزتی کی تھی..... ریسٹ ہاؤس کی کہانی منی بائی کے ذریعے بابا صاحب کو اور پھر رخسانہ کے ذریعے مجھ تک پہنچی ہے۔ پرویز نے منسٹر صاحب کی بہت بے عزتی کی تھی۔ بہت اونچا اُڑنے لگا تھا سالا۔ بھارتیوں سے سیدھے روابط قائم کر لئے تھے اُس نے۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ اگر کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو شاید بابا صاحب کی پکی چھٹی ہو جاتی..... ہاں خان صاحب اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ کسی روز بھارتیوں کو اعتماد میں لے کر بابا صاحب کی ہی "اکال چلتا" کروا دیتا۔ اس وقت تنظیم کے جتنے لڑکے بھارتی کیمپوں میں موجود ہیں اُن میں سے ساٹھ ستر فیصد اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اس سے پہلے کے تمام بھرتی بھی یا تو بنے بھائی نے دی تھی یا پھر اُس نے۔ "آستانے" میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ بھارتی اس پر بابا صاحب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ کیا مجال جو اس کی چٹ لے کر جانے والے کو ویزا نہ ملا ہو۔ بڑا خطرناک آدمی تھا۔"

عارف نے اُسے ساری کہانی سنائی۔

''یار تم ایک کام کرو۔''

اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح شیر گل کے ذہن پر لپکا تھا۔

''فرمایئے۔''

''کسی طرح جبار اور منسٹر صاحب کو اکٹھے کر کے رخسانہ سے ٹکرا دو۔''

شیر گل نے یہ بات سرگوشی کے انداز میں کی تھی لیکن عارف اچانک ہی یوں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس کو طاقت ور سپرنگوں نے اُچھال دیا ہو۔

''بیٹھ جاؤ۔''

شیر گل خانے نے اُسے اس طرح ہاتھ اُٹھا کر کہا جیسے اس کے حکم سے ہی عارف کھڑا ہوا تھا اور اس کے حکم سے بیٹھ جائے گا۔

''خان صاحب..... شاندار..... ایک دم شاندار..... بس اب دیکھئے میرا کمال۔ سالوں کو آپس میں ہی نہ ٹکرا دیا تو عارف نام بدل دیجئے گا..... دیکھتے جایئے میں کرتا کیا ہوں۔''

عارف کے چہرے کا رنگ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے اندر شیر گل خان کے اس فقرے نے گویا ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ اچانک ہی ایک جوار بھاٹا اُس کے اندر اُٹھا تھا جس کے آثار اس کے چہرے سے بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''اور ہاں تمہارے لئے ایک خبر یہ تھی کہ تمہاری مینا کشی مل گئی ہے..... بھئی بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے اس نے..... بڑی کایاں عورت ہے کم بخت.....''

شیر گل خان نے اُسے بتایا۔

''گویا قدرت نے اب ہم سے کوئی کام لینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔''

عارف نے کہا۔

''ہاں! تمہیں بھی جلد ہی اُس کا دیدار کروا دوں گا..... لیکن ابھی دُور دُور سے ہی نظارہ کرنا..... تمہیں شاید علم نہ ہو کہ آج کل تنظیم کے بڑے بڑے مگرمچھ اس کے نزدیک پائے جا رہے ہیں۔ میرے خیال سے احتیاط اب لازم ہو گئی ہے۔ تم اپنے طور پر اشفاق بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہ کرنا۔ میں نے نفیس میاں کو بھی اس کے محسن کا نام بتا دیا ہے۔ وہ سب لوگ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔''

شیر گل خان اُس کے ساتھ کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ دونوں نے ایک منصوبہ طے کیا تھا اور اب دونوں اُس کی کامیابی کے لئے خدا سے دُعائیں مانگتے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

●

اختر ملک کے ساتھ جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ کبھی اُس کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ مختلف دفاتر میں تبدیلیاں تو روزانہ کا معمول تھا۔

لیکن.....!

یہاں ہونے والے تبادلے بلا مقصد نہیں تھے۔

یہ تبادلے چھوٹی سطح پر ہوئے تھے۔ کچھ ڈرائیور اس محکمے سے دوسرے محکمے میں بھیج دیئے گئے تھے اور اگلے دو تین روز میں پانچ ڈرائیور یہاں آ گئے تھے۔ ملک اختر نے ان میں سے ایک کا انتخاب اپنے لئے کیا تھا اور آج ہی اُس نے ''صاحب بہادر'' کی گاڑی کا چارج سنبھالا تھا۔

پہلے ہی روز اس نے گاڑی میں ایک معمولی سی الیکٹرونک پرابلم شکایت کی اور اس کے حکم پر کسی مکینک کو دکھانے لے گیا۔

یہ معمول کی کارروائی تھی۔

اس شہر میں مختلف مقامات پر ہونے والی کھدائی سے حشر برپا ہوا تھا اور جس طرح گرد و غبار کا طوفان سارا دن فضا پر چھایا رہتا تھا۔ اس کے بعد کسی انسان یا مشین میں کوئی خرابی پیدا ہو جانا معمول کی بات تھی۔

ڈرائیور صوبے خان جو اس سے پہلے ایس پی صاحب کی ڈیوٹی کسی دوسرے شہر میں کرتا رہا تھا گاڑی لے گیا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ واپس لوٹا تو گاڑی ''اے ون'' ہو چکی تھی اس کا معمولی نقص دُور ہو گیا ہے۔

لیکن.....!

گاڑی میں ایک معمولی سا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔

یہ خصوصی ''بگ سسٹم'' تھا جو بادلِ نخواستہ پاکستان انٹیلی جنس کو اپنے ہی ایک آفیسر کی کار میں نصب کرنا پڑا تھا تاکہ اس کے شیطانی منصوبوں سے آگاہی حاصل کر سکے۔

بال جتنی باریک تاروں سے ترتیب دیا یہ سسٹم اتنا حساس اور طاقت ور تھا کہ اس گاڑی میں ہونے والی معمولی آہٹ کو بھی ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

صوبے خان کے ساتھ ملک اختر کا پہلا سفر ہی بڑا شاندار تھا۔

وہ اس کی توقع سے بڑھ کر تابعدار، مستعد اور اس کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں ملک اختر سے اپنے سابق ایس پی صاحب کا مکمل تعارف کروا دیا تھا..... اور اشارے کنایے میں بتا دیا تھا کہ وہ افسروں کے لئے اُن کے اشارہ ابرو پر جان دینے کو بھی تیار رہتا ہے۔

اس کے اطوار بتا رہے تھے کہ اس شخص میں اپنے افسران کے راز چھپانے کی مکمل صلاحیت موجود ہے کیونکہ اپنے سابق مالک کے متعلق اُس نے ملک اختر کے کریدنے پر بھی کوئی بات نہیں بتائی تھی اور یہی تاثر دیا تھا کہ وہ اپنے افسروں کی پرائیویٹ زندگی کے رازوں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتا ہے۔

ملک اختر اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا۔

اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صوبے خان بھی اُس جیسے شوق کا مالک ہے لیکن غریب اور کانسٹیبل کے درجے کا ملازم ہونے کے سبب وہ چھپ کر ہی اپنا شوق پورا کر سکتا تھا۔

دو ایک روز ہی میں اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ صوبے خان اُس کے عین مزاج کے مطابق ہے اور مستقبل میں اس کا بہترین ملازم ثابت ہوگا۔

ملک اختر نے اس کا ٹیسٹ اگلے ہی روز کر لیا تھا جب اُس نے صوبے خان کو ایک پیٹی کسی دکان سے وصول کر کے اس کے گھر پہنچانے کی ہدایت کی تھی اور صوبے خان نے یہ کام اس طرح کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

لیکن.....!

گھر پہنچتے ہی اس نے ملک اختر کے بیرے سے دوستی گانٹھ لی تھی اور اُسے بتایا تھا کہ بھوک کے مارے اُس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اگر وہ اُسے روٹی کھلا دے تو اس سے زیادہ ثواب کبھی نہیں کمائے گا۔

بیرے کو اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی اور اس نے فوراً ہی اس کے لئے کھانا تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

صوبے خان کمر سیدھی کرنے کے بہانے ملک صاحب کے بیڈ روم میں بچھے قالین پر لیٹ گیا تھا۔

اُسے اپنا کام مکمل کرنے کے لئے بمشکل آدھا گھنٹہ درکار تھا۔

آدھ گھنٹے میں اُس نے ملک صاحب کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں ''بگ سسٹم'' نصب کر دیا تھا۔ اب اُن کی کار کی طرح اُن کے گھر میں ہونے والی گفتگو بھی تمام تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ ہو سکتی تھی۔

اپنا کام مکمل کر کے وہ کچن میں آ گیا تھا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر ملک صاحب کو لینے چلا گیا۔

گھر پہنچ کر ملک صاحب نے بطورِ خاص یہ بات نوٹ کی تھی کہ اُس نے کسی بھی طرح پیٹی کھول کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس نے پیٹی لینے والے سے کوئی سوال کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے والا ہے اس بات سے قطعاً بے نیاز کہ اس کے افسران کیا کرتے ہیں۔

ایسے ہی شخص کی اُسے تلاش تھی۔

ملک اختر نے اُسے اپنے ساتھ مستقل ڈیوٹی کے لئے رکھ لیا تھا۔ صوبے خان نے اُسے اپنی خوش بختی جانا تھا۔

●

''گیسٹ ہوم'' کی انچارج مسز عامہ چوہدری شہر کی کئی انجمنوں کی عہدیدار تھیں۔ انہیں دنیا کی ہر مظلوم عورت سے ہمدردی تھی۔ اس شہر میں طلاق کے بیشتر

مقدمات کی پیروی وہ خود کر رہی تھیں۔ انہوں نے مظلوم اور ستم رسیدہ خواتین کی امداد کے لئے بطور خاص ''لیگل ایڈ'' کمیٹی قائم کر رکھی تھی۔
ملک کے کونے کونے سے مظلوم اور ستم رسیدہ خواتین ان کے پاس پناہ لینے آتی تھیں اور مسز چوہدری ان کے اور ظالم معاشرے کے درمیان ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔
آج بھی وہ معمول کے مطابق اپنے دفتر میں بیٹھی تھیں جب دوپہر کے بعد ان کی سیکرٹری نے ایک جواں سال لڑکی کو اندر بھیج دیا۔
اس لڑکی نے اپنا نام عمرانہ بتایا تھا اس کی عمر بمشکل تیئس برس ہوگی لیکن وہ شکل سے بمشکل اٹھارہ برس کی دکھائی دیتی تھی۔ یوں تو مسز چوہدری نے بڑی بڑی خوبصورت ستم رسیدہ لڑکیاں دیکھی تھیں۔
لیکن.....!
اتنی خوبصورت اور شاندار شخصیت کی مالک لڑکی سے اُن کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ اُس نے مسز عاصمہ چوہدری سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے اپنا تعلق ملک کے ایک معروف گھرانے سے بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان پر بوجھ نہیں بنے گی اور اپنے اخراجات خود ادا کرے گی۔ اُس نے اپنی آنسو بھری آنکھوں اور رندھے ہوئے گلے سے بتایا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس کا گھرانہ جاہل جاگیردارانہ ذہنیت کا حامل ہے۔
اس کا گناہ یہ ہے کہ اُسے اپنے خاندان سے کمتر درجے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے محبت ہوگئی تھی۔ جب کہ اس کے والدین اس شادی پر رضامند نہیں ہیں۔
انہوں نے لڑکے کو اتنا خوفزدہ کیا ہے کہ وہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔
اب عمرانہ بطور احتجاج اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر آ گئی تھی۔
اس نے مسز عاصمہ چوہدری کو بتایا کہ وہ کسی پر بوجھ نہیں بنے گی۔ اُس نے اس شہر میں نوکری کا بندوبست کر لیا ہے اور یہاں قیام کرنا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنے بزدل محبوب کو یہاں لائے گی اور اپنے والدین کی آنکھوں کے سامنے علی الاعلان اُس سے شادی کرے گی۔
مسز عاصمہ چوہدری پر اُس کی پراثر اور سحر انگیز شخصیت کا ایسا جادو چلا کہ وہ موم کی طرح پگھلتی چلی گئی۔
اُس نے شام کو گیسٹ ہاؤس کے کامن روم میں موجود لڑکیوں سے اُس کا تعارف کرواتے ہوئے اس کی جرأت کی تعریف کی اور انہیں کہا گیا کہ جب تک اس ملک کی عورت خود جرأت کا مظاہرہ نہیں کرے گی اس معاشرے میں اُنہیں کوئی مقام نہیں ملے گا۔
اُس نے عمرانہ کی جرأت کی داد دیتے ہوئے اسے گیسٹ ہاؤس کا شاندار کمرہ الاٹ کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ اس کی تنظیم اس کی ہر قدم پر مدد کرے گی۔
یوں دکھائی دیتا تھا جیسے عمرانہ نے مسز چوہدری پر کچھ پڑھ کر ہی پھونک دیا ہے کیونکہ اس نے بہت عرصہ بعد آج اس کے اعزاز میں چائے پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔
اس پارٹی میں بطور خاص شہر کی سوشل ورکر خواتین کو مدعو کیا گیا تھا۔ اُن کے سامنے بھی اس نے عمرانہ کے تعریف کے پُل باندھنے شروع کر دیئے تھے۔

عمرانہ سے یوں تو اس ''گیسٹ ہاؤس'' کی بہت سی مظلوم لڑکیاں دوستی کی خواہاں نظر آتی تھیں لیکن اُسے یہاں ایک خاص لڑکی کی تلاش تھی جو اُسے بالآخر ایک کونے میں کھڑی نظر آ گئی یہ پروین تھی۔

پروین بھی کوئی معمولی ہستی نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ شہر کی متمول خواتین سے محوِ گفتگو تھی جب عمرانہ بڑے نامحسوس انداز میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

''ہیلو!''

عمرانہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''ہیلو!'' مجھے پروین کہتے ہیں..... بہت خوشی ہوئی آپ کے متعلق جان کر واقعی آپ جیسے بڑے گھروں کی لڑکیاں جب تک ہمت سے کام نہیں لیں گی بات نہیں بنے گی۔''

''آف کورس مس پروین۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ یہ لوگ جب چاہیں ہمیں مذہب اور روایات کے نام پر بیوقوف بنانا شروع کر دیں۔ اکیسویں صدی کی عورت کیسے غلام رہ سکتی ہے..... بتایئے ناں کیسے رہ سکتی ہے۔''

اُس نے پروین کی ہاں میں بڑھ چڑھ کر ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

عمرانہ کی آنکھوں میں اُسے معصومیت کا دریا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے رہا تھا۔

''چلے گی۔''

اس نے دل ہی دل میں خود سے مسکراتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے تک دونوں ایک دوسرے کی دوست بن چکی تھیں۔ پروین نے اس کے لئے کھانا بطور خاص اپنے کمرے میں منگوایا تھا۔

کھانے کے دوران عمرانہ نے پروین پر ثابت کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ آزاد خیال عورت اس ملک میں کوئی اور نہیں ہے جسے نہ تو اپنے ملک وملت سے کوئی واسطہ تھا نہ اپنے مذہب سے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ زندگی جتنے دن کی بھی ہے اُسے اپنی مرضی سے اپنے نظریات کے مطابق ہی گزارنی چاہئے۔

پروین کو بھی اس سارے لیڈیز گیسٹ ہوم میں پہلی لڑکی کچھ پسند آئی تھی۔ ورنہ تو وہ کسی کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک تو وہ یوں بھی ہفتے میں تین چار دن یہاں قیام کرتی تھی پھر جتنے دن وہ یہاں رہتی عموماً اپنے کمرے میں بند رہتی۔

اس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی بڑے سرکاری افسر سے اس کا معاشقہ چل رہا ہے جس کے ساتھ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی تھی۔

یوں لگتا تھا شاید عمرانہ یہاں آئی ہی اس لئے ہے کہ پروین سے دوستی کر لے۔

●

دونوں شہر سے باہر جبار کے ہی ایک خفیہ ٹھکانے پر آ گئے تھے۔

جبار سے جب اس نے ایک ضروری مسئلے پر بات چیت کرنے کے لئے کہا تھا تو اُس نے ایک مرتبہ تو حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''سالے کوئی چکر تو نہیں دے رہا۔''

جبار نے اس کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''جبار بھائی ہم نے اپنے سفر کا آغاز ایک ساتھ کیا تھا۔ ہماری منزل اگر الگ الگ ہو بھی گئی تھی تو اب ایک ہو جانی چاہئے۔ حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ میرے خیال میں بنے بھائی کے بعد پرویز بھائی کی موت ایسا واقعہ نہیں جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے ہمیں مل کر یہ سوچنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک ایک کر کے مارے جائیں۔''

اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تو جبار نے چند لمحے سوچنے کے بعد ہاں کر دی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جگہ کا انتخاب خود کرے گا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

عارف نے جواب دیا۔

اب دونوں ایک ہی گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ گاڑی جبار خود چلا رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا جو بالکل ویران تھا اور شہر سے کافی فاصلے پر وہ ایک فارم پر آ گئے تھے۔

شاید اس لمبے راستے سے اس لئے آیا تھا کہ کسی بھی تعاقب کو نوٹ کر سکے۔

لیکن.....!

اُسے یقین ہو گیا تھا کہ عارف اُس کے خلاف کوئی چکر نہیں چلا رہا بلکہ اپنی بقا کے پیش نظر شاید اس نے کچھ اور فیصلہ کر لیا ہے۔

''ہاں عارف! اب بات کرو..... بھائی برا مت ماننا۔ ان حالات میں جبکہ ہمارے گرو پرویز بھائی کو اس طرح سازش سے مروا دیا گیا ہے ہم کسی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار نہیں کر سکتے۔''

***

جاری ہے.....

جبار بھائی نے ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

یہ فارم شاید اس کے کسی ساتھی کا تھا یا پھر اس کا۔ کیونکہ اس کا استقبال مالک کی طرح ہی کیا گیا تھا۔

''مجھے علم ہے اس میں کسی کا قصور نہیں۔ جبار بھائی ہم نے ایک عظیم انقلاب کے لئے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ کم از کم میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بابا صاحب کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہایا ہے۔ مجھے اُن کی ڈکٹیٹرشپ پر اعتراض نہیں اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کا وجود تنظیم کی بقا کے لئے نقصان دہ ہے تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ اُسے ختم کروادیں۔''

''لیکن یہ فیصلہ اُن کا ذاتی فیصلہ ہو تو..... میں تو یہ نہیں چاہوں گا کہ ہماری قسمتوں کے فیصلے اب خواتین کو سونپ دیئے جائیں۔''

عارف کا تیر عین نشانے پر لگا۔ اس کے آخری فقرے کا جبار کے چہرے پر شدید ردعمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اعصاب اچانک تن گئے اور چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔

''عارف جو بات آج تمہارے دماغ میں سمائی ہے اس کا احساس پرویز بھائی کو بہت پہلے سے ہو گیا تھا۔ یہ سالی انٹیلی جنس کی ایجنٹ ہے۔ اس کے فون میں گیجٹ کسی اور نے نہیں خود اُس نے نصب کیا تھا بھلا کسی کی جرأت ہے کہ اس کے فون کو ہاتھ لگا سکے اور اس کے اُکسانے پر پرویز بھائی کے قتل کی اجازت بھی دے دی۔ تم جانتے ہو اس سالے منسٹر کی یہ ہمت تھی کہ ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھتا بابا صاحب کی اجازت اور حکم سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے تو اب بنے بھائی کے قتل کے پیچھے بھی بابا صاحب ہی نظر آ رہے ہیں۔''

جبار نے بمشکل اپنی زبان پر کنٹرول پایا تھا یوں لگتا تھا جیسے اُس کے اندر اُبلتے لاوے کو اچانک ہی عارف نے اخراج کی راہ دکھا دی ہو۔

اُسے جبار کی اس کمزوری کا علم بھی تھا کہ وہ پرویز بھائی کا سالا بھی ہے۔ کچھ بھی ہو پرویز اس کا بہنوئی تھا۔ اس کی بہن پرویز کے قتل سے بیوہ ہوئی تھی۔

''دیکھو جبار بھائی کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میرے خیال سے باتیں کرنے کا وقت گزر چکا ہے اور اب عمل کا وقت آ گیا ہے۔ جس طرح تنظیم کا ایک سازش کے تحت بیڑا غرق کیا جا رہا ہے اور جس طرح انٹیلی جنس کے لوگ ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں۔ اس طرف شاید بابا صاحب کا دھیان ہی نہیں جاتا وہ اپنی ہی لگن میں مست ہیں۔ کسی ورکر کے مشورے کو اہمیت نہیں دی جاتی اور ہر فیصلے کے پیچھے اس رخسانہ کا ذہن کارفرما ہوتا ہے۔ اب ہمیں خود سوچنا ہوگا ورنہ یاد رکھنا یہ لوگ تو بچ جائیں گے کیونکہ یہ سرکار کے وعدہ معاف گواہ بن کر ہمارے خلاف بھارتی کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے کے ثبوت پیش کر کے ہمیں ساری زندگی کے لئے فوجی عقوبت خانوں میں پھینکوا دیں گے۔''

عارف بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ جبار کے منہ سے وہ بات نکلوالے جو عارف کے دل میں تھی اور جسے کہنے کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق جبار تو اس سے کئی گناہ

زیادہ بابا صاحب کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔ پرویز کے قتل نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔

''عارف! مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ اشفاق بھائی اور کالیا وغیرہ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔ ان لوگوں نے قوم کے لئے کیا ہی کیا ہے۔ سوائے اپنی عیاشیوں کے.....ہم تو ''آستانے'' کے لوگ ہیں۔ ارے وہ سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کے بنکوں میں جو اربوں روپیہ جمع کر رکھا ہے وہ کس کے باپ کی کمائی ہے۔ ہمارا ہی تو مال ہے۔ ارے مرنے کے لئے کیا ہم ہی رہ گئے ہیں اور مزے کرنے کے لئے یہ لوگ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ عارف چاہے کوئی میری زبان کاٹ دے میں تو یہی کہوں گا کہ بابا صاحب خود ذمہ دار ہے۔ اس کے دماغ میں تکبر سما گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ وہی ہماری تباہی کی جڑ ہے۔ ہمیں اس جڑ کو اُکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ ورنہ یاد رکھنا ایک ایک کر کے ہم سب مارے جائیں گے۔''

بالآخر جبار بھائی نے کہہ ہی دیا۔

''جبار بھائی میں گزشتہ چار روز سے خواب آور گولیاں کھا کر سو رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے بابا صاحب اس تنظیم کے ہر اس شخص کو جس کے متعلق اُسے شک ہو جایا کرے گا کہ کہیں مستقبل میں اس کے لئے خدشات پیدا نہ کرے گے مروا دیا کرے گا.....اور ہاں جبار بھائی اس غلط فہمی میں ہم میں سے کوئی نہ رہے کہ بابا صاحب یار خسانہ کا قرب کسی کو بچا لے گا.....ارے کہیں بابا صاحب نے حکومت سے ہاتھ تو نہیں ملا لیا اور انٹیلی جنس والوں کی نشاندہی پر ہی ہمارے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہو۔ میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔''

عارف نے جلتی پر تیل ڈالا۔

''عارف! بات سیدھی سی ہے۔ جو بات تمہارے دل میں ہے وہی خدشہ ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔ تم نے صحیح کہا ہے یہ لوگ سالے بیچ جائیں گے ہمیں قربانی کا بکرا بنا کر سرکار کے سامنے پھینک دیں گے۔ میں تو کہتا ہوں اب تخت یا تختہ دونوں میں سے ایک کو چن لینا چاہئے۔ تمہارے ساتھ بھی مخلص کارکن ہیں اور میرے ساتھ بھی اگر ہم ''آستانہ'' پر قبضہ کر لیں تو ہم بھی حکومت کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں گے۔''

جبار بھائی نے تجویز پیش کی لیکن یہ کام بڑی رازداری اور انتہائی مضبوط منصوبہ بندی سے ہوگا۔ کسی بھی مرحلے پر معمولی سی غلطی ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کر لو اور اس کے بعد ہم کوئی اگلا قدم اٹھائیں گے۔''

عارف چوہدری نے بڑی رازداری سے اس طرح اس کے نزدیک جھکتے ہوئے یہ بات کہی تھی جیسے اُسے خدشہ ہو کہ کوئی اُن کی بات سن نہ لے حالانکہ دور دور تک کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔

''کہو.....کہو.....کیا تجویز ہے۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

جبار بھائی اُس سے زیادہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

''دیکھو جبار بھائی ہم میں سے کسی کا سرکاری ایجنسی کے ساتھ تو کوئی رابطہ ہے نہیں..... ہمیں تو جو کام بھی کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ پرویز بھائی کی وجہ سے اگر تم سمجھتے ہو کہ بھارتی قونصلیٹ سے کوئی مدد لو گے تو تمہاری خام خیالی ہوگی کیونکہ یہ لوگ مردوں سے دوستی نہیں رکھا کرتے۔ پرویز بھائی جب تک زندہ تھا ان کا تھا مر گیا تو اُن سے تعلق ختم ہو گیا۔ یوں بھی ان لوگوں کو بھنک لگ گئی کہ بابا صاحب کے خلاف ''آستانہ'' میں کوئی سازش چل رہی ہے تو فوراً اُسے ہوشیار کر دیں گے کیونکہ اس وقت وہی اُن کا سب سے مضبوط ساتھی ہے۔ بابا صاحب کے لئے ہمیں تنظیم کے اندر ہی سے لوگ تلاش کرنے ہوں گے اور کام بھی اسی طرح کرنا ہوگا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ خاص طور پر بھارتیوں کو تو اُس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے۔''

اس نے رازداری سے کہا۔

''تنظیم کے اندر تو پھر ہم خود ہی ہیں..... مار دیتے ہیں سالے کو آج ہی گولی۔''

جبار بھائی نے اپنی دانست میں بڑا آسان حل نکالا تھا۔

''جلدی نہیں جبار بھائی۔ جلدی ہم سب کو مروا دے گی۔ پہلے میری بات سُن لو..... میں ایک تیر سے دو شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ اس وقت بابا صاحب کے مقابلے کی ایک ہی شخصیت ہے اور وہ ہے منسٹر صاحب۔ اس سالے نے پرویز بھائی کو مروایا ہے۔ ہم اسی کو اعتماد میں لے کر لیڈری کا جھانسہ دیں گے۔ اُسے باور کرا دیں گے کہ اب اس کا نمبر لگنے والا ہے کیونکہ رخسانہ بابا صاحب کی جگہ لینا چاہتی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو یہ ہے بھی سچی بات..... میرے خیال میں اگر ہم نے سوچ سمجھ کر اپنے پتے کھیلے تو کوئی وجہ نہیں کہ منسٹر قابو میں نہ آئے۔ اس کو بابا صاحب سے ٹکرا دیتے ہیں اور خود ایک طرف بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔ دونوں میں سے جو دوسرے کو زیر کر لے گا وہ خود بھی اتنا تھک چکا ہوگا کہ تازہ حملے کی تاب نہیں لا سکے گا۔ رخسانہ کو فی الحال منسٹر کے پیچھے میں لگا دوں گا اور منسٹر کو بابا صاحب کے پیچھے..... جو ان میں سے بچے گا وہ ہمارا شکار ہوگا۔''

عارف کی بات کے خاتمے پر جبار بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

''ارے واہ عارف چوہدری! تم تو سالے بڑے کام کے آدمی ہو..... بڑا دماغ ہے رے تیرا..... ہمارے تو اوسان ہی خطا ہو رہے تھے۔ کاش پرویز بھائی نے تجھے اپنے ساتھ لگا لیا ہوتا۔''

جبار نے اُس کے لئے نعرہ تحسین بلند کیا۔

''کل سے آغاز کر دیں اس کام کا؟''

عارف نے پوچھا۔

''ارے آج ہی سے۔ بلکہ ابھی سے، لیکن ایک الجھن ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہ سالا منسٹر میری بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔ یہی سمجھے گا کہ میں کوئی چال چلنے والا ہوں۔''

جبار بھائی نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے تمہاری اجازت چاہئے تھے۔ میں تمہاری طرف سے اُسے صلح کا پیغام دیتا ہوں اور کسی طرح تمہیں اکٹھے کرتا ہوں۔ وہیں اُس کے سامنے یہ ترپ چال چل دینا۔ اس درمیان بابا صاحب کی طرف سے اس کی ٹھکائی بھی کروادوں گا۔ جب لوہا گرم ہوگا تب ہی تو صحیح چوٹ پڑے گی۔''

عارف نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''ارے واہ عارف..... مزہ آجائے گا۔ آؤ تمہاری ہماری فتح کا جام تجویز کریں۔''

جبار نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور گلے لگا لیا۔

اُسے اپنے ساتھ لے کر وہ ایک کمرے میں آیا تھا جہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی توقع جبار سے کی جاسکتی تھی۔ یہیں دونوں نے جام فتح نوش کیا اور واپس شہر لوٹ آئے۔

●

اگلے روز ایک بجے سے پہلے ہی شیر گل خان وہاں پہنچ گیا تھا۔

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی چوکیدار کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بظاہر لاپرواہی سے ٹہلتا اس طرح اُس کی طرف آرہا تھا جیسے وہ کوئی عام سا ملاقاتی ہو۔

''سناؤ!'' آیا ہے ابھی یا نہیں اور وہ کہاں ہے تمہاری میڈم پروین۔''

اُس نے بے حیائی سے آنکھ دبائی اور ایک نوٹ نکال کر چوکیدار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ارے صاحب! اس کی کیا ضرورت تھی آپ نے پہلے ہی اتنا کچھ دے دیا ہے لیکن ہے بڑا خطرناک کام۔ اگر اُن میں سے کسی کو علم ہوگیا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے تو میری چھٹی ہوجائے گی۔ صاحب جی! وہ بہت بڑا افسر ہے کوئی معمولی افسر نہیں۔ کہیں مجھ غریب کو مروا ہی نہ دینا۔''

چوکیدار نے بظاہر اُس پر احسان جتانا بھی ضروری سمجھا۔

''ارے یار کیوں مرا جاتا ہے۔ کیا ہوگیا زیادہ سے زیادہ تیری نوکری جائے گی ناں..... بے فکر ہوجا..... ایسی درجنوں نوکریاں تجھے لادوں گا اور یہاں سے تین گنا زیادہ تنخواہ بھی۔ پھر یار میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے کہ تیرا پتہ چلنے دوں گا۔ جیسا تو کسی کا ملازم ہے ایسا ہی میں بھی کسی کا نوکر ہوں۔ میں سامنے کھڑا ہوتا ہوں تم بس اشارہ کر دینا پھر اپنے کام میں مست ہوجانا۔ سمجھ گئے ناں۔''

شیر گل خان نے اُسے مطمئن کیا۔

''ٹھیک ہے صاحب۔ میں چلتا ہوں گیٹ پر.....کوئی فون ہی نہ آ جائے۔''

یہ کہہ کر وہ گیسٹ ہوم کے دروازے پر اپنے کیبن میں جا گھسا۔

شیر گل اور اس کے ساتھی اپنی جگہ مستعد تھے جب انہوں نے دور ہی سے اختر ملک کی کار آتے دیکھی۔ حسب توقع وہ کار خود ہی چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید یہ گاڑی اُس نے حال ہی میں خریدی تھی یا کسی شوروم سے اُٹھالایا تھا کیونکہ اس سے پہلے اس کے پاس کسی نے یہ گاڑی نہیں دیکھی تھی۔

چوکیدار نے گاڑی کو دور سے دیکھا اور کیبن سے باہر آ کر اس طرح مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا دیا جس طرح اُسے شیر گل نے سمجھایا تھا۔

انٹیلی جنس کے خفیہ کیمرے حرکت میں آ گئے اور ان مناظر کی فلمبندی شروع ہو گئی۔ ملک اختر کار سے اُتر کر چوکیدار کو کچھ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے بٹوا کھول کر اُسے ایک نوٹ چوکیدار کو تھماتے دیکھا جس کے بعد اُس نے قریباً جھکتے ہوئے ملک اختر کا شکریہ ادا کیا اور کیبن میں رکھے ٹیلی فون پر اندر اطلاع دی۔

قریباً دو منٹ بعد انہوں نے میناکشی کو بن ٹھن کر اس طرف آتے دیکھا۔ شاید وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔

ملک اختر نے گیٹ پر اس کا استقبال کیا۔ دونوں نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ملک اختر کی کار تک آ گئے۔

اُن کے کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہونے تک کا ایک ایک لمحہ کیمرے کی آنکھ نے سلولائیڈ کے پردے میں منتقل کر دیا تھا۔

جیسے ہی کار وہاں سے روانہ ہوئی تین موٹر سائیکل سوار اُس کا تعاقب کرنے لگے۔ اُن میں شیر گل خان بھی شامل تھا جس نے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ ملک اختر کی نگرانی پر کسی کار کو مامور نہ کیا جائے۔ اس طرح اُسے شک گزرنے کا امکان تھا۔

اب انہیں معروف شاہراؤں سے گزرنا تھا جہاں وہ کسی بھی کار کا باآسانی تعاقب کر سکتے تھے۔ تینوں اپنے محکمے کے ذہین آفیسر تھے۔ انہوں نے شہر کے مشہور ہوٹل تک اس طرح اپنی پوزیشنیں بدل بدل کر اُن کا تعاقب کیا تھا کہ ملک اختر کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

یوں بھی وہ میناکشی کے شباب میں اس طرح گم تھا کہ اس کے لئے ایک ہی وقت میں میناکشی اور سڑک پر نظر رکھنا ہی کارِ دارد تھا۔ شاید دونوں یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ ہوٹل کے اندر داخل ہوئے دروازہ کھولنے والے نے بڑی آشنا نظروں سے ان کا استقبال کیا اور اُن کی رہنمائی ایک میز کی طرف کی جہاں پہلے ہی سے کوئی ان دونوں کا منتظر تھا۔

یہ میناکشی کے بھائیوں میں سے ایک تھا۔

لیکن.....!

اس کی اصلیت کچھ اور تھی اور اس اصلیت سے شیر گل خان بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا یہ پرکاش ہے۔ بھارتی قونصلیٹ کا ایک افسر۔

پرکاش کی سرگرمیاں ہمیشہ سے مشکوک رہی تھیں۔ اُس پر شروع ہی سے انٹیلی جنس نے نظر رکھی تھی اور تنظیم کے لیڈروں کے ہاں اس کا اکثر آنا جانا مشکوک سمجھتا جاتا تھا۔ پرکاش کو قونصلیٹ میں ایک طرح سے تنظیم کے آفس انچارج کی حیثیت حاصل تھی۔ تنظیم کے ذریعے جتنے ویزے اور دیگر مراعات حاصل کی جاتی تھیں۔ اُن کا ذریعہ پرکاش ہی بنتا تھا۔

تینوں کھانے کی پہلے سے ریزرو میز پر بیٹھے تھے اور آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے جس سے انہوں نے یہی اندازہ کیا کہ ان کے پہلے سے بھی آپس میں تعلقات رہے ہوں گے۔

ملک اختر کو اس مرتبہ پھر احساس نہ ہو سکا کہ اُس کی موجودگی کے دوران ہی ہوٹل کے دروازے پر ایک کار سے نوبیاہتا جوڑا اُتر کر شاید ڈنر کرنے آیا تھا۔ یہ شاید اُن کا پہلا باقاعدہ ڈنر تھا۔ تب ہی تو اُن سے پہلے والی کار سے ایک کیمرہ مین باہر نکلا تھا جس نے اُس کی کار سے اُترتے ہی فلمبندی شروع کر دی تھی۔

یہ شادی شدہ جوڑا بڑے اطمینان سے ان میزوں کی طرف جا رہا تھا جو ملک اختر کے نزدیک خالی موجود تھیں۔

ایسی ہی ایک میز پر ہوٹل کے سپروائزر نے اُنہیں بڑے احترام سے بٹھایا۔ اُسے علم تھا کہ ایسے جوڑے انہیں کتنی ٹپ دے دیا کرتے ہیں۔

کیمرے کا رخ بظاہر اُن کی طرف تھا لیکن کیمرہ مین کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک اختر اور اس کے ساتھیوں کی ایک ایک حرکت فلما رہا تھا۔ سوائے اُن کی آواز کے اور سب کچھ ریکارڈ ہو رہا تھا۔

یہ سارا ڈرامہ شیر گل خان کی ہدایت پر انٹیلی جنس والوں نے ہنگامی بنیادوں پر تیار کیا تھا۔ اس کے تمام کردار انٹیلی جنس کے لوگ تھے اور دُلہا دُلہن کی آڑ میں دراصل وہ ملک اختر کے خلاف تمام ثبوت سلولائیڈ پر منتقل کر رہے تھے۔

ملک اختر کے یہاں سے روانگی اور پھر کار پارکنگ میں موجود اپنی کار میں مینا کشی سمیت سوار ہونے تک کی ساری فلم تیار ہو چکی تھی۔ پرکاش کچھ دیر بعد دوسری کار میں گیا تھا۔ کسی نے اُس کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ یہاں سے سیدھا قونصلیٹ جائے گا۔ اس ہوٹل میں قونصلیٹ کے اکثر لوگ دوپہر کا کھانا کھانے آیا کرتے تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

ملک اختر کی روانگی کے بعد شیر گل نے ہوٹل میں موجود انٹیلی جنس کے ایک ''سورس'' کے ذریعے اس بات کا دستاویزی ثبوت بھی حاصل کر لیا تھا کہ ملک اختر نے یہ میز اپنے نام سے بک کروائی تھی۔

●●●

مکافاتِ عمل

جبار بھائی نے اگلے ہی روز ہنگامی بنیادوں پر اپنے خاص دوستوں کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر اکٹھا کیا تھا۔ اُس نے عارف کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس کا نام درمیان میں لائے بغیر اُن لوگوں کے سامنے تنظیم پر قابض ہونے کا آئیڈیا پیش کیا تھا۔

اس کے ساتھی تو پرویز بھائی کے قتل کے خلاف پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملادی اور اُس کی طرف سے اُٹھائے جانے والے کسی بھی انتہائی اقدام میں اس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا۔

جبار بھائی نے انہیں فی الوقت خاموشی سے کام کرتے رہنے کی تلقین کی تھی اور یہ وارننگ بھی دی تھی کہ اگر اس میٹنگ کی خبر یہاں سے باہر نکلی تو اُن میں سے کسی کی بھی خیر نہیں۔ وہ بھی ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ حالات کو نہ پہچان پاتے۔ انہوں نے بھی جان لیا تھا کہ بابا صاحب مکھن سے بال کی طرح نکل جائے گا اور وقت آنے پر اُنہیں غداروں کی فہرست میں شامل ہو کر ساری زندگی انٹیلی جنس کے عقوبت خانوں اور جیلوں کی بھینٹ چڑھانی پڑے گی۔

عارف چوہدری نے جبار بھائی کی طرف سے سگنل ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا اور اس ضمن میں وہ آج رخسانہ کی اس کوٹھی پر موجود تھا جہاں وہ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔ شاید بابا صاحب کے بعد وہ اس تنظیم کا سب سے زیادہ خوش قسمت ممبر تھا جس نے اتنی مرتبہ رخسانہ کی خواب گاہ میں قدم دھرا تھا۔

''خیریت ہے۔ آخر ایسی کون سی بات ہے بھئی..... چلو اس بہانے تم نے ہمارے غریب خانے پر قدم تو رکھا۔''

رخسانہ نے گھر پہنچتے ہی اس سے کہا۔

''بات ہی ایسی تھی مس رخسانہ جو کم از کم اتنی احتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔''

عارف نے ایک آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

''اب پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے یا کچھ کہو گے بھی۔''

رخسانہ نے اس کے پہلو میں براجمان ہو کر اُس کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

''مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں تصدیق کیے بغیر کوئی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ شک تو مجھے نفیس میاں پر بھی ہوا لیکن میں نے زبان نہیں کھولی جو بعد میں سچ ثابت ہوا..... مس رخسانہ تنظیم کو تباہ کرنے کی ایک گھناؤنی سازش کا علم ہوا ہے مجھے..... آستین کے سانپ اب بابا صاحب کو ڈس کر تنظیم پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔''

عارف نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا واقعی تم سنجیدہ ہو.....؟''

اب رخسانہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔

''ہاں مس رخسانہ۔ سنجیدہ اس لئے ہوں کہ میں نے ذاتی طور پر اس کھیل میں ملوث ہو کر ساری معلومات حاصل کی ہیں۔''

عارف نے جواب دیا۔

''خدا کے لئے میری قوتِ برداشت کا مزید امتحان نہ لو اور سب کچھ بتاؤ۔''

رخسانہ نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

''مس رخسانہ میں آپ کو سب کچھ بتانے کے لئے ہی یہاں لایا ہوں..... لیکن میری ایک درخواست ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ بابا صاحب کی طبیعت آج کل یوں بھی خراب ہی رہتی ہے۔ وہ ہر وقت سازشوں کی زد میں رہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اس عظیم انسان کو ہم مزید ذہنی دباؤ کا شکار کریں..... اسی لئے میں یہ بات آپ سے اسی درخواست سے کر رہا ہوں کہ فی الوقت یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہئے..... اور ہم کوشش کریں کہ اس معاملہ کو بالا بالا ہی حل کر لیں..... میرا مطلب ہے بابا صاحب کو تکلیف دیئے بغیر۔ مس رخسانہ آپ جانتی ہیں کہ منسٹر اور جبار، بابا صاحب کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں اور جلد ہی بابا صاحب کے خلاف بہت خطرناک قدم اٹھانے والے ہیں۔ مس رخسانہ بابا صاحب کی جان خطرے میں ہے..... بابا صاحب کو بچا لیجئے..... خدا کے لئے بابا صاحب کو بچا لیجئے۔''

اس نے آخری دونوں فقرے اتنے زبردست فلمی انداز سے کہے تھے کہ خود کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

''لیکن..... یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے.....''

رخسانہ نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

''آپ نے بالکل بجا فرمایا میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا جب مجھے یہ خبر ملی تھی لیکن بعد میں جب خود اس تجربے سے گزرا تو مجھے یقین ہوا۔ مس رخسانہ مختصر بات یہ ہے کہ جبار نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی بات کر لینے میں کوئی ہرج نہ جانا۔ بہر حال ہم ملے تو اُس نے مجھے بتایا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اس لئے ہمیں ایک دوسرے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے کہا کہ پرویز بھائی کو منسٹر صاحب نے بابا صاحب کے حکم پر مروایا ہے اور بابا صاحب تنظیم کے سارے فنڈ پر اکیلا قابض ہونا چاہتا ہے۔ اُس نے بابا صاحب کے غیر ملکی بنکوں میں اکاؤنٹس کے نمبر تک بتائے ہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ سارے فساد کی جڑ بابا صاحب ہے اور جلد ہی وہ ایک خطرناک چال چل کر اُن سب کو مروا دے گا کیونکہ اُن لوگوں کے بھارتی

انٹیلی جنس سے روابط ہیں جن کا علم پاکستان انٹیلی جنس کو بھی ہے۔ اگر وہ اب تک محفوظ ہیں تو صرف اس لئے کہ یہ لوگ تنظیم کی طاقت سے خوفزدہ ہیں لیکن بابا صاحب کسی بھی وقت سودے بازی کر کے انہیں مروا دے گا۔ اُن کا کہنا ہے کہ بابا صاحب ہر اس نوجوان کو مروا دیتا ہے جس کے متعلق اُسے شک ہو جائے کہ وہ مستقبل میں ان کے لئے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کے متعلق بھی بہت غلط بکواس کر رہے تھے۔ بہر حال مفادات کے حصول پر جبار اور منسٹر صاحب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں نے موذیوں کی سازش کا سراغ لگانے کے لئے فی الحال جبار بھائی کی ہاں میں ہاں ملا دی ہے اور اب میں اُس کی طرف سے منسٹر صاحب کو اتحاد کی پیش کش لے کر جاؤں گا۔ مس رخسانہ میں آپ کو پرسوں تک سارے ثبوت دے دوں گا۔ اس کے بعد کا لائحہ عمل ہم مل کر طے کریں گے۔"

جیسے جیسے وہ اپنی بات کہہ رہا تھا رخسانہ کے چہرے پر ایک رنگ آ اور دوسرا جا رہا تھا۔

اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ عارف کم از کم اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اُن دونوں کے درمیان بڑے گہرے اور مضبوط روابط قائم ہو گئے تھے جن کے بعد ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

"عارف..... تم نے میرے ساتھ یہ بات کر کے میری تشویش میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ مجھے بھی دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔ جس طرح ممکن ہے اس سازش کا سراغ لگا لو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ بابا صاحب کے بعد اس تنظیم میں اگر کسی کو کوئی مقام ملے گا تو تمہیں ملے گا۔ میں بابا صاحب کی زندگی میں تمہیں اُن کا نائب بنا دوں گی۔"

اُس نے بڑے جوش سے عارف کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

"مس رخسانہ! میں نے زندگی میں کبھی اس بات کا تصور ہی نہیں کیا۔ خدانہ کرے میں کبھی ایسا سوچوں۔ میرے لئے اگر کوئی ہستی اس دنیا میں بابا صاحب کے بعد ہے تو وہ آپ ہیں..... آپ....."

عارف نے اس طرح رخسانہ سے یہ بات کہی تھی کہ اُس کے جسم کے سارے تار جھنجھنا کر رکھ دیئے تھے۔

کیا واقعی یہ نوجوان اس سے اتنا متاثر ہو گیا ہے۔

رخسانہ نے سوچا اور شیطان نے اس کے کان میں پھونکتے ہوئے اُس کی سوچ کا جواب ہاں میں دے دیا۔ اب عارف اُسے کچھ زیادہ ہی دل و جان سے عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی شدید خواہش پر آج پھر عارف کو رات اس کے ہاں بسر کرنی پڑی۔ اس گھر میں گزاری الف لیلیٰ کی دیگر راتوں کی طرح یہ رات بھی اپنے پہلو میں شباب کی ہزاروں رنگینیاں لائی اور بہا کر لے گئی۔

ساری رات رخسانہ اُس پر اپنے جسم کا فسوں پھونکتی رہی۔

عارف کے لئے گویہ کوئی نیا کھیل نہیں تھا۔

لیکن.....!

جس انداز کے داؤ پیچ رخسانہ نے آزمائے تھے۔اس کے بعد سے اُسے یقین ہو چلا تھا کہ بابا صاحب کو وہ واقعی گدھا بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

✹

عارف کی طرف سے پیغام ملنے پر منسٹر صاحب نے اُسی روز اُسے اپنے ریسٹ ہاؤس میں طلب کر لیا تھا۔شاید اُن کے خوابوں کی تکمیل ہونے جا رہی تھی۔

''کیا حال ہے عارف! ہم غریبوں کو کیسے یاد کر لیا۔آپ تو ''رنگ منچ'' کے راجا اِندر بنے ہوتے ہیں۔ہم ایسے بے چاروں کی گنجائش کہاں نکل آئی۔''

اُنہوں نے عارف سے گرمجوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

''منسٹر صاحب آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں ذرہ برابر شک نہیں لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ میں نے اور میرے جیسے ہزاروں بدقسمت نوجوانوں نے تنظیم میں کسی عظیم مقصد کے لئے شمولیت اختیار کی تھی اور ہم نے کسی بھی طرح قربانی دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا.....لیکن منسٹر صاحب کیا ہماری قربانیاں محض ایک عورت کے ناز نخروں کی بھینٹ چڑھا دی جائیں گی.....خدا کے لئے سوچئے، ذرا سوچئے۔''

اُس نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

''عارف یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔''

انہیں شاید عارف کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''منسٹر صاحب! آپ ہمارے بڑے ہیں۔آپ سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔آپ جانتے ہیں کہ بابا صاحب کو گردوں کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔آپ کو اس کی وجہ کا بھی علم ہے۔میں اسے سازش سمجھتا ہوں۔کیا ہم سب آنکھیں بند کر کے یہ تماشا دیکھتے رہیں۔''

''عارف میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔مجھے علم ہے کہ اس وقت تنظیم کے نوجوانوں کے دلوں میں کیا ہلچل مچی ہے۔تم ہی بتاؤ اس صورتحال کا حل کیا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ تم نے رخسانہ بیگم کا اصلی روپ تو پہچان لیا۔''

منسٹر صاحب کے دل کی آواز یہی تھی جو عارف کے منہ سے برآمد ہوئی لیکن وہ چاہتے تھے کہ سب کچھ عارف ہی کہہ ڈالے۔

''میں لمبی بات نہیں کرتا منسٹر صاحب نہ مجھے کسی کا خوف ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اب تو انقلابی قدم اٹھانے کا وقت آ چکا ہے۔اس انقلاب کی کمان آپ نے سنبھالنی ہے۔ہم اگر اکٹھے ہو جائیں تو بابا صاحب کو ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتے ہیں۔''

اس نے بالآخر منسٹر صاحب کے دل کی بات کہہ دی۔

''عارف تم نے بالکل ٹھیک کہا۔میں سمجھ گیا ہوں۔ہمیں بابا صاحب کو آرام کرنے کا موقع دینا چاہئے۔یوں بھی بیچارے بابا صاحب کے دل و دماغ پر آج کل

رخسانہ بیگم سوار ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اُنہیں قتل کر دیا جائے وہ شوق سے زندہ رہیں لیکن اب سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لیں۔ میرے خیال سے انہوں نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ ساری زندگی کسی یورپی ملک میں بادشاہ کی طرح گزار سکتے ہیں۔ اگر پسند کریں تو رخسانہ بیگم کو بھی ساتھ لے جائیں مجھے کیا اعتراض ہے۔ اب تنظیم کی قیادت کم از کم ان کے ہاتھوں میں نہیں رہنی چاہئے۔ لیکن یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔"

منسٹر صاحب نے کھل کر بات کہہ دی۔

اُن کی گفتگو کا آغاز ہوتے ہی عارف نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالنے کے بہانے کے چھوٹا سا بٹن دبا دیا جس سے اب ساری گفتگو ان کے کپڑوں میں چھپے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہونے لگی تھی۔

"آپ کو "آستانہ" کا مکمل تعاون ملے گا۔ منسٹر صاحب میں آپ کے پاس جبار بھائی کے نمائندے کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ حیران نہ ہوں۔ سیاست میں دوستیاں دشمنوں میں اور دشمنیاں دوستیوں میں بدلتی رہتی ہیں۔ میں بھی بہت حیران ہوا تھا جب اس کی طرف سے مجھے پیغام ملا کیونکہ وہ لوگ مجھے بھی مخالف کیمپ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ جبار بھائی چند معمولی سی شرائط کے ساتھ آپ کی قیادت تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سرحد پار والے دوستوں نے اُسے ذہنی طور پر پرویز کا جانشین سمجھ لیا ہے اور وہ اُس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ جبار کے آپ کے ساتھ ملنے کا مطلب ہوگا کہ "آستانہ" آپ کی جیب میں آ گیا ہے جس کے بعد بابا صاحب تک رسائی کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتی۔"

عارف میاں نے اگلا ترپ کا پتہ پھینکا۔

"عارف! کاش ایسا ہی ہو۔ مجھے جبار اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ میں اس کے ساتھ ہر وقت ہاتھ ملانے کو تیار ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہئے کہ اس تنظیم میں کچھ بھی بابا صاحب کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا۔ پرویز بھائی سے میری کیا دشمنی تھی؟ میں اُسے کیوں مرواتا۔ یہ سب رخسانہ کا کیا دھرا ہے۔ اس نے بابا صاحب کے ذریعے کروایا ہوگا نجانے مجھے کیوں درمیان میں قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔"

منسٹر صاحب نے اپنی دانست میں مکاری کا مظاہرہ کیا۔

"میں اُسے آپ کی اجازت سے یہیں بلا لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ اُس کی وفاداری کا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ وہ نہتا یہاں چلا آئے گا۔"

عارف نے اپنی رائے پیش کی۔

"ارے ضرور عارف! میں نے تو کہہ دیا ناں کہ وہ میرے بیٹے کے برابر ہے۔"

منسٹر صاحب کو آنے والے دنوں کے خواب نے ابھی سے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور وہ اقتدار کے نشے میں اندھا ہو کر سانپ اور سیڑھی کے اس خطرناک کھیل میں کود گیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہاں جبار بھائی موجود تھا۔

دونوں نے عارف کو ثالث مان کر اس کی ہر ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔ حالانکہ دونوں بدنیت تھے اور اپنی دانست میں ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے تھے۔

اس کا احساس دونوں کو نہ ہو سکا۔

منسٹر صاحب نے فنڈ کی تقسیم اور استعمال سے متعلق جبار بھائی کی تمام باتیں تسلیم کر لیں۔ مستقبل کے منصوبے بن گئے۔ منافقوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کامیابی کی صورت میں مل کر لوٹ مار کرنے کے خفیہ معاہدے کر لئے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ تقدیر اپنا کھیل کھیل رہی ہے۔

دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ منسٹر صاحب نے وہاں بیٹھے بیٹھے جبار بھائی کے ایک رشتہ دار کو تین کروڑ کا ایک ٹھیکہ دے کر اُس پر اپنی وفاداری اور دوستی کا سکہ جما دیا۔

تینوں کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتے طے پا چکا تھا۔

اگلے روز اس ٹیپ کی ایک کاپی شیر گل کے پاس اور دوسری رخسانہ کے پاس پہنچ چکی تھی۔

جیسے جیسے رخسانہ کیسٹ سُن رہی تھی اس کا بلڈ پریشر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

''کتے کا پلا.....!''

اُس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھا مس رخسانہ۔ دیکھا آپ نے..... یہ غدار کسی بھی رحم دلی کے مستحق نہیں۔ ان نالی کے کیڑوں کو بابا صاحب نے آسمان کے ستارے بنایا اور ان کے دماغ خراب ہو گئے..... سالے! بابا صاحب کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ ذلیل انسان، نمک حرام، کمینے.....''

وہ بے تحاشہ منسٹر صاحب اور جبار کو گالیاں بکنے لگا۔

عارف میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھلا پاؤں گی۔ تم میری توقعات سے بڑھ کر عظیم نکلے ہو۔ اب دیکھنا میں ان سب گدھوں کو بتاؤں گی کہ بابا صاحب یوں ہی میری بات نہیں مانتے۔ میں انہیں مٹا کر خاک کر دوں گی۔ میرے نزدیک ان کیڑے مکوڑوں کی حیثیت ہی کیا ہے اور ہاں تم آج شام گھر پہنچ جانا..... بابا صاحب سے وہیں بات ہو گی۔''

رخسانہ غصے سے باؤلی ہوئی جاتی تھی۔

''مس رخسانہ خدا کے لئے آپ کیوں اپنا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہیں۔ ہم جیسے جانثاروں کے ہوتے ہوئے کوئی آپ کی یا بابا صاحب کی طرف میلی نظروں سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ اچھا چلئے کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔''

اس نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

رخسانہ نے جواب میں اُس سے زیادہ گرمجوشی دکھائی تھی۔

شام تک دونوں اکٹھے رہے۔

شام ڈھلے بابا صاحب اپنے دو خاص باڈی گارڈز کے ساتھ بھیس بدل کر یہاں آئے تھے۔ ''آستانہ'' میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ بابا صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔

انہوں نے سیکورٹی کے انتہائی اقدامات کئے تھے اور اس وقت ایک کمرے میں اُن تینوں کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔

بے چارے بابا صاحب اور بے چاری رخسانہ کو اس بات کا گمان ہی نہیں گزر سکتا تھا کہ ان تینوں کی گفتگو عارف کے کپڑوں میں چھپے انتہائی حساس ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔

اس نے رخسانہ کے کہنے پر بابا صاحب کو دوبارہ ساری رام کہانی سنائی اس کے بعد رخسانہ نے وہ کیسٹ چلا کر سنا دیا۔

بابا صاحب نے کیسٹ اپنی جیب میں رکھ لیا اور ایک مرتبہ گہری نظروں سے عارف کا جائزہ لیا۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ عارف کو اپنے سارے بدن میں سنسنی کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔

بابا صاحب کے چہرے سے اُن کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔

یہ شخص اپنے جذبات چھپانے پر مکمل عبور رکھتا تھا۔

''عارف! ہم اپنے وفاداروں کے لئے دنیا کی تمام آسائشوں کے دروازے کھول دیا کرتے ہیں اور غداروں کے لئے جہنم کے۔ دشمن کتنے بھی پردوں میں چھپا ہو بچ نہیں سکتا..... میں اُن کے جسموں سے چمڑی اُتروا دیا کرتا ہوں۔ میرے ہاتھوں کے تراشے صنم زندگی کے لئے میرے محتاج ہیں۔ میں خالق ہوں اُن کا..... میں پتھروں میں زندگی ڈالنے اور نکالنے کا فن جانتا ہوں۔ تمہارا شکریہ! وقت آنے پر تمہیں توقع سے بڑا انعام ملے گا۔ ان سے کیسے نمٹنا ہے ہم بہتر جانتے ہیں۔ تم ہماری طرف سے ان غداروں میں گھسے رہو ان کو شک نہ گزرنے دینا۔ میں ایک دو روز ہی میں ان کا علاج کرتا ہوں۔ میں دشمنوں کو زندہ رہنے کے لئے زیادہ وقت دینے کا قائل نہیں ہوں۔ سانپ کا زہر جتنی جلدی نکل جائے اتنا ہی بہتر۔ کیوں رخسانہ بی۔''

بابا صاحب کا موڈ اچانک ہی بدلنے لگا تھا۔

اُن کی رنگین طبع اپنی جولانیوں پر آ رہی تھی۔

وہ اس طرح نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس کے لئے یہ کوئی معمولی سی بات ہو جس کی اس کے نزدیک اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔

لیکن.....!

اس کے اندر اس خبر کے بعد جو جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا اُس سے بھی عارف میاں لاعلم نہیں تھے۔ وقت اور حالات نے اُنہیں بھی ماہر نفسیات بنا دیا تھا۔

انہوں نے رات کا کھانا دونوں کے ساتھ کھایا اور تھوڑی دیر بعد انعام کی ایک خطیر رقم کے ساتھ عارف کو جانے کی ہدایت کی۔ آج رات انہوں نے عارف کی بجائے خود یہاں قیام کرنا تھا۔

عارف کو انہوں نے نارمل رہنے کی تلقین کی تھی۔

●

شیر گل خان بے قراری سے پہلے سے مخصوص جگہ پر عارف کا منتظر تھا۔

عارف اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے آیا تھا۔ اس نے شیر گل کو دیکھ کر گاڑی روکی نہیں تھی اور وہ بھی معمول کے مطابق اُس کے پیچھے آ رہا تھا۔ ایک مخصوص جگہ عارف نے گاڑی روک کر اس کا بونٹ اُٹھایا اور شیر گل اس طرح اس کے نزدیک رُکا جیسے مدد کے لئے رُکا ہو۔ عارف نے جھکے جھکے چھوٹی سی کیسٹ نکال کر اُسے تھمادی اور بونٹ بند کر کے اپنی راہ لی۔

اگلے روز بابا صاحب نے صبح سب سے پہلے جبار بھائی کو اپنے پاس طلب کیا۔ وہاں پہلے سے منسٹر صاحب اور دو تین کونسلر بھی بیٹھے تھے۔

''پنڈی کا معاملہ بہت اُلجھ گیا ہے۔ تم لوگ ابھی روانہ ہو جاؤ اور جس طرح بھی ممکن ہے دونوں گروپوں کی صُلح کرا دو۔ میں حکومت کے سامنے اب مزید تماشا نہیں بننا چاہتا۔''

اُنہوں نے چھٹتے ہی کہا۔

''جو حکم بابا صاحب۔''

جبار بھائی نے احترام سے جواب دیا۔

بابا صاحب نے انہیں کچھ ہدایات دیں اور چاروں پنڈی کے لئے چل دیئے۔ جہاں واقعی گزشتہ پندرہ بیس روز سے تنظیم کے دو گروپوں کے درمیان ٹھن گئی اور انہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔

انہیں اپنے مشن پر روانہ ہوئے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا تھا جب منسٹر صاحب کو بابا صاحب سے فوری ملاقات کا پیغام ملا۔ چونکہ آج کل اُن کی بابا صاحب سے گاڑھی چھنتی تھی اور بابا صاحب اکثر معاملات میں اُن سے مشاورت کرتے رہتے تھے۔

یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

منسٹر صاحب بابا صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ دونوں کے درمیان قریباً ایک گھنٹہ میٹنگ چلتی رہی جب اُن کی سیکرٹری نے اطلاع دی کہ چیف منسٹر صاحب شرف باریابی چاہتے تھے۔

''شام کا وقت دے دو۔''

بابا صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔

اُنہوں نے منسٹر صاحب سے آج بہت اہم باتیں کی تھیں جس کے بعد انہیں فارغ کر دیا تھا۔ بابا صاحب کی عادت تھی کہ اپنے خاص مہمانوں کو جنہیں عزت دینا مطلوب ہوتا بابا صاحب اپنے کمرے کے باہر برآمدے تک رخصت کرنے آتے تھے۔

برآمدے سے قریباً تیس چالیس گز تک مہمان کو پیدل سفر کر کے اپنی کار تک جانا ہوتا تھا۔ بابا صاحب نے منسٹر صاحب کو گرمجوشی سے رخصت کیا اور جیسے ہی واپس مڑے اچانک لڑکھڑا کر گر پڑے۔

ایک کونے میں کھڑے ایک باڈی گارڈ نے اچانک گولیوں کی بارش شروع کر دی تھی۔ منسٹر صاحب کے جسم میں یکے بعد دیگرے آٹھ دس گولیاں جا گھسیں۔

اُس بے چارے کو تو منہ سے آواز نکالنے کی بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اچانک ہی کسی نے چیخ کر بتایا بابا صاحب زخمی ہیں۔

چاروں طرف کہرام مچ گیا۔

درجنوں محافظ اُس طرف دوڑتے چلے آئے جنہوں نے بابا صاحب کے گرد حصار باندھ لیا اور انہیں اُٹھا کر اندر لے گئے۔

جس باڈی گارڈ نے فائرنگ شروع کی تھی اُس نے ''منصوبے کے مطابق'' ایک طرف دوڑ لگا دی، لیکن اس بے چارے کو چند قدم ہی بھاگنے کی مہلت نصیب ہوئی اس کے جسم پر گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔

مرتے دم اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں کیونکہ اس بے چارے کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اُسے بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اُس نے تو حکم کی پابندی کی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ خود اُسے علم نہیں تھا کہ وہ تو قربانی کا بکرا بن رہا ہے۔

بابا صاحب کو ان کے محافظ ہسپتال لے جا رہے تھے۔

سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ بابا صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے جس میں منسٹر صاحب مارے گئے ہیں اور بابا صاحب زخمی ہوئے ہیں۔

لیکن.....!

سیکورٹی ایجنسیاں پہلے سے کسی بھی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوشیار تھیں۔ اس لئے شہر نگاراں میں خون خرابہ تو ہوا لیکن معمول سے بہت کم۔

چند گھنٹوں کے اندر اندر حساس علاقوں میں کرفیو نافذ کرنے کے بعد قانون نافذ کرنے والے اداروں کے جوانوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔

*

ہسپتال کے باہر بابا صاحب کے عقیدت مندوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

لوگ ہسپتال کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے کہ کسی بھی طرح اُنہیں بابا صاحب کی ایک جھلک دیکھنے دی جائے۔

لیکن.....!

بابا صاحب کے خصوصی گارڈز نے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف سے لوگوں سے بار بار اپیل کی جا رہی تھی کہ وہ بابا صاحب کو آرام کرنے دیں۔ فی الوقت اُن کو ڈسٹرب کرنا اُن کی صحت کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

بابا صاحب ہسپتال میں فروکش تھے جب یہ ''افسوس ناک خبریں'' انہیں مل گئیں۔ جس کے مطابق جبار بھائی جو اُن کے حکم پر تنظیم کے معاملات کی دیکھ بھال کے لئے پنڈی گئے تھے اُن پر پنڈی پہنچتے ہی قاتلانہ حملہ ہوا جس میں جبار بھائی بھی جاں بحق ہو گئے۔

واقعات کے مطابق جبار بھائی جب تنظیم کے مرکزی دفتر میں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے بعد واپس آ رہے تھے تو وہاں گھات لگائے ایک شخص نے اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ درجنوں گولیاں اُن پر فائر ہوئیں اور حملہ آور بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

یہ حملہ بالکل اُسی انداز کا تھا جس طرح یہاں منسٹر صاحب پر کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ منسٹر صاحب پر حملہ کرنے والے کو موقعہ پر مار دیا گیا تھا۔ جبکہ جبار بھائی پر حملہ کرنے والا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

تنظیم کے مقامی دفتر نے اس حملے کی ذمہ داری حسب روایت مخالف تنظیم پر عاید کر کے اُس کے خلاف دھواں دھار بیانات اخبارات کے لئے جاری کر دیئے تھے۔

جیسے ہی اس حادثے کی خبر شہر میں پھیلی چاروں طرف بے چینی پھیل گئی۔ جذبات بھڑکے اور اشتعال انگیز نعروں نے ہجوم کی شکل اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زبان، نسل، قومیت کے بھیانک شکنجے میں جکڑے معصوم اور ورغلائے انسانوں کے انبوہ کثیر کے احتجاج نے تخریب کاری شروع کر دی۔ اُن کی صفوں میں گھس آئے ''را'' کے تخریب کاروں نے اُن کی راہنمائی کرتے ہوئے انہیں سرکاری دفاتر، مخالف تنظیم کے عہدیداران کے گھروں اور پولیس چوکیوں پر حملے کا راستہ دکھایا۔

پل بھر میں شہر کا امن تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

خوفزدہ لوگ چیختے چلاتے، بے بسی سے تخریب کاروں کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔

ہنگامہ آرائی کی آڑ میں تنظیم والوں نے چُن چُن کر مخالف تنظیم کے عہدیداروں کے خون سے ہولی کھیلی۔

اُن کے گھر پھونک دیئے گئے۔

گھروں کو جلاتے ہوئے بطور خاص اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ وہاں سے کوئی متیم اس ظلم کی داستان سنانے کو زندہ نہ نکل سکے۔

شام تک امن وامان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انتظامیہ کو بادلِ نخواستہ کرفیو لگانا پڑا اور کئی جگہ ہوائی فائرنگ کر کے جلوس منتشر کرنے پڑے۔

بابا صاحب نے ہسپتال کے آرام دہ کمرے میں جہاں وہ ایک کامیاب ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے کے بعد اپنی ٹانگ پر پٹیاں باندھے آرام کر رہے تھے یہ خبر سُنی تو اُن کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک دوچند ہوگئی۔

''مر گیا سالا..... کتے کا پلا..... ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔ بہت چالاک سمجھتا تھا خود کو..... ارے ایسے تو درجنوں میں نے چٹکی سے مسل ڈالے اور وہ منسٹر کا بچہ۔ وہ گندی نالی کا کیڑا۔ جسے میں نے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا وہ تو اپنی اوقات ہی بھول گیا تھا۔ مجھے مارنے چلا تھا..... بناتا ہوں تمہیں تنظیم کا چیئرمین..... سالے لیڈر بنتے ہیں.....'' اُس کے منہ سے مغلظات کا طوفان برآمد ہوا۔

کمرے میں اُس کی چارپائی سے لگے بابا صاحب کے خصوصی درندے بڑے خشوع وخضوع سے اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور بڑھ چڑھ کر بابا صاحب کو ایک ہی جھٹکے سے دو شکار مار گرانے پر داد وتحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔

''بابا صاحب! سیاست تو آپ کے گھر کی باندی ہے۔ یہ سالے کل کے لونڈے کیا جانیں۔ ارے کیا خبر کہ سرکار سے کیسے نمٹا جاتا ہے..... حکومت کیسے کی جاتی ہے۔''

نصیر بھائی نے چمچہ گیری میں زبان ہلائی۔

''واہ بابا صاحب کمال کر دیا۔ کمال کر دیا آپ نے۔ ایک ہی ہلے میں دونوں کا صفایا کروا دیا۔''

عارف نے جس کے جسم سے حساس ٹیپ ریکارڈ لٹکا تھا بابا صاحب کے منہ سے اقرارِ جرم ریکارڈ کروانے کے لئے فلر چھوڑا۔

''عارف! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میں تو غداروں کو زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر زندہ درگور کر دیا کرتا ہوں..... چاہئے تو یہ تھا کہ ان دونوں کی کھال میں بھُس بھروا کر انہیں چوراہے میں لٹکا دیتا لیکن بے چاروں کے جسموں میں اتنے زیادہ سوراخ ہو گئے تھے کہ ایسا کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔''

بابا صاحب نے بھیانک قہقہہ بلند کیا۔

''آپ عظیم ہیں بابا صاحب۔''

نصیر بھائی نے نعرہ بلند کیا اور وہاں موجود تمام بھیڑیئے اُن کے ہم زبان ہو گئے۔

●

ہسپتال کے ایک بڑے کمرے میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اخبار نویس وہاں جمع ہو چکے تھے اور اب بابا صاحب کی آمد کے منتظر تھے۔ جنہوں نے کمال مہربانی سے اتنی ''زخمی حالت'' میں بھی اُن کے ساتھ گفتگو کا اہتمام فرمایا تھا۔

''سب آ گئے کیا؟''

بابا صاحب نے جن کے پاؤں پر گولی لگی تھی لیکن جو اپنے قدموں پر کھڑے کمرے میں بے چینی سے چکر کاٹ رہے تھے اپنے خصوصی بھیڑیوں سے دریافت کیا۔

''جی بابا صاحب۔ آپ کے منتظر ہیں۔''

رخسانہ نے جواب دیا جس نے آج بابا صاحب کے حکم پر میک اَپ سے اجتناب کیا تھا اور بادلِ نخواستہ سُرخی پاؤڈر کے بغیر ہی پریس کا سامنا کرنے جا رہی تھی۔

''چلو!''

بابا صاحب نے اچانک بے خیالی میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ادھر بابا صاحب۔''

نصیر بھائی نے اچانک اُنہیں یاد دلایا کہ اُن کے تو پاؤں میں گولی لگی ہوئی ہے اور وہ تو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ اُنہوں نے معذوروں والی کُرسی پہلے سے ہی وہاں منگوا رکھی تھی۔

عارف میاں حیران رہ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ بابا صاحب کے جسم پر تو خراش تک نہیں آئی تھی اور انہوں نے پاؤں میں گولی لگنے کا ڈرامہ بھی اپنے پیروکاروں اور حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے رچایا ہوا تھا۔

عارف میاں کو یاد آ گیا کہ جس سرکاری ہسپتال بابا صاحب ''زیرِ علاج'' ہیں وہ دراصل تنظیم کا ایک قلعہ ہے۔

اس ہسپتال کے چپڑاسی سے ڈاکٹر تک سب بابا صاحب کے خاص مُرید تھے۔ اس ہسپتال میں باورچی کی تعیناتی بھی اُن کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ اُسے علم تھا کہ اس ہسپتال کے بعض کمرے دراصل تنظیم کا اسلحہ خانہ ہیں جہاں بڑے خطرناک ہتھیار چھپائے گئے ہیں۔ کس کی جرأت تھی کہ وہ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے کمزوری کا مظاہرہ کرتا۔

یہاں کے ہر ملازم کو احساس تھا کہ وہ نوکر تو سرکار کا ہے لیکن حکم اُسے بابا صاحب کا ماننا ہوگا۔ بصورتِ دیگر نوکری سے چھٹی ہی نہیں بلکہ بھیانک سزا بھی اُس کا مقدر بن جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد مریضوں کی کرسی پر حزن و یاس کی تصویر بنا اس صدی کا سب سے بھیانک اداکار اخبار نویسوں کے سامنے موجود تھا۔

''ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارے پاس قربانیوں کی ایک لازوال تحریک موجود ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اس ملک کے قیام کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے اور ہماری نسل اس ملک کی بقا کے لئے اپنا خون بہا رہی ہے۔ اگر ہمارے دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو شہید کر کے ہمارا راستہ روک لیں گے تو یہ اُن کی بھول ہے۔ ہمارے دشمنوں کی گولیاں ختم ہو جائیں گی لیکن ہمارے سینے اور اُن میں موجود عزائم کبھی دم نہیں توڑ سکتے۔ منسٹر صاحب اور جبار بھائی کی شہادت نے ہماری منزل کو اور قریب کر دیا ہے۔ ہمارے کارکنوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ اُن کی شہادت سے بلند ہوئے ہیں۔ انہوں نے مر کر ہمیں جینے کی راہ دکھائی ہے۔''

بابا صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔

اچانک ہی انہوں نے اداکاری کا کمال دکھایا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

''معزز صحافی حضرات! پرویز بھائی کے بعد منسٹر صاحب اور جبار بھائی کی موت نے بابا صاحب کو بہت دُکھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹروں نے شدت سے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے اور فوراً کسی یورپی ملک جا کر فی الوقت موجودہ حالات سے کنارہ کشی کی ہدایت کی ہے لیکن بابا صاحب نے ہماری منت سماجت کے باوجود ڈاکٹروں کی اس ہدایت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور زبردستی آپ سے ملاقات کرنے بھی چلے آئے ہیں۔ بابا صاحب کا فرمان ہے کہ وہ اس نازک مرحلے پر اپنے عوام سے ایک لمحے کے لئے بھی جُدا نہیں ہو سکتے۔''

نصیر بھائی نے رُندھے ہوئے گلے سے پریشان اخبار نویسوں کے سامنے جھوٹ کا طومار باندھنا شروع کیا۔

''حضرات! مجھے افسوس ہے میں زیادہ دیر تک آپ سے باتیں نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے کارکنوں کو ایک ہی پیغام دینا ہے کہ وہ ملک و قوم کی سلامتی کے لئے ان شہادتوں کو بھی دلوں میں پتھر رکھ کر قبول کر لیں اور خدا کے لئے اُن لوگوں کو معاف کر دیں جنہوں نے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میری اپنے بھائی بہنوں سے التجا ہے کہ وہ مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں جس سے ملکی سلامتی پر حرف آتا ہو۔ پرسکون رہیں اور تنظیم کے تمام دفاتر میں شہیدوں کی روح کو ایصال ثواب کے لئے قرآن پاک ختم کروائے جائیں۔ اپنے شہید ساتھیوں کی موت پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مجھے ارباب حکومت سے صرف یہی پوچھنا ہے کہ کیا وہ ہمیں جرم وفا کی سزا دے رہے ہیں۔ ہم حکومت کے حلیف ہیں لیکن ہمارے ساتھ حریفوں سے بدتر سلوک کیا جا رہا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو قاتلوں کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ میں حکومت کو وارننگ دے رہا ہوں کہ قاتلوں کی گرفتاری میں تاخیر سے عوام کا اضطراب اور بڑھے گا۔ اُن میں بے چینی پیدا ہو گی اور وہ لا اینڈ آرڈر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔''

اتنا کہتے ہوئے اچانک بابا صاحب آگے کی سمت اس طرح جھکے جیسے بیہوش ہونے کی تیاریاں کر رہے ہوں پھر انہوں نے اس خباثت کا عملی مظاہرہ بھی کر ہی دیا

اور دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو گئے۔

اُن کے اداکار بھیڑیے۔ ''بابا صاحب..... بابا صاحب۔'' کے نعرے بلند کرتے اُن کی کُرسی گھسیٹ کر اُسی کمرے میں لے گئے۔

اخبار نویسوں کے لئے چائے اور لوازمات کا بندوبست موجود تھا۔

چائے نوشی کے دوران بابا صاحب کے چیلے اخبار نویسوں کے سامنے مسلسل بابا صاحب کی عظمت کے راگ الاپتے رہے۔

چائے اتنی بھرپور تھی کہ اخبار نویسوں کے لئے اُن کی باتوں کو سچ مانے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔

عارف کا دل آج پہلی مرتبہ اس کے قابو سے باہر ہوا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ابھی جائے اور تمام منافقوں اور مصلحتوں پر لعنت بھیج کر اس خونخوار درندے کا گلا گھونٹ کر مار ڈالے۔

لیکن.....!

وہ حالات کی کٹھ پتلی بنا سوائے اشاروں پر ناچنے کے کچھ کرنے سے معذور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ملک کے عاقبت نا اندیش حکمران جنہوں نے اپنی آنکھوں پر ہوس اقتدار کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ اس بھیڑیے کو جس کی زندگی کا واحد مقصد سوائے انسانیت کی رگوں سے قطرہ قطرہ خون پینے کے اور کچھ نہیں، اپنا ''سیاسی گورو'' بنا چکے ہیں۔

اس صوبے کی دس بارہ سیٹوں کے لئے اقتدار کے پجاریوں کی آپس میں دوڑ لگی ہوئی تھی اور اس کمزوری سے بابا صاحب جیسے موذی فائدہ اُٹھا رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر اقتدار پر قابض گروپ نے اُن کی کسی بھی غیر قانونی حرکت کا نوٹس لیا تو وہ اُسے دھتکار کر دوسرے کی گود میں بیٹھ سکتے ہیں کیونکہ پلڑہ وہی بھاری ہوتا ہے جس میں ''بابا صاحب'' اپنا وزن ڈالے۔

●●●

جاری ہے ...

قربتیں اور.....

عمرانہ نے چند دنوں میں ہی میناکشی کا قرب حاصل کر لیا تھا اور آج میناکشی اُسے اپنے ایک کزن سے ملانے جا رہی تھی جس کا نام میناکشی نے اُسے سلیم بتایا تھا۔

''بڑی مالدار آسامی ہے اگر تم نے قابو کر لیا تو ساری زندگی عیش کرو گی۔ جس طرح کے گیسٹ ہوم میں ہم رہتے ہیں ایسے دس گیسٹ ہوم تم اپنے لئے بنا سکتی ہو۔''

روانگی سے پہلے اُس نے آنکھ دباتے ہوئے عمرانہ کی طرف جھکتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ..... دیکھیں گے۔'' عمرانہ نے بھی خالص کاروباری انداز میں اپنے ماتھے پر پڑی لٹ جھٹک کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

پروین نے اُس کے انقلابی خیالات سے متاثر ہونے کے بعد اُسے بتایا تھا کہ وہ بھی یہی عزائم لے کر گھر سے نکلی ہے اور اُس نے بھی عمرانہ کی طرح اپنے گھر بار اور خاندان کے جھنجھٹوں سے نجات حاصل کر لی ہے۔ اُس نے عمرانہ کو راتوں رات کروڑ پتی بننے کے بھی نسخے بتا دیئے تھے اور آج اس سلسلے میں وہ اپنے ایک میٹھ کزن سے اُسے ملانے جا رہی تھی۔

دونوں شہر کے جس فائیو سٹار ہوٹل میں پہلے سے طے شدہ ملاقات کے لئے جا رہے تھے وہاں پہلے سے شیر گل اور اُس کے ساتھیوں کے لئے تین میزیں ریزرو تھیں۔

عمرانہ نے بظاہر بڑا ماڈرن اور جدید تراش خراش کا لباس زیب تن کیا تھا۔

لیکن.....!

پروین کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اُس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ایک چھوٹا سا نہایت حساس ریکارڈنگ سسٹم بھی موجود ہے جو دس گز دور سے بھی معمولی سی آواز ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انہیں لینے کے لئے ایک قیمتی کار گیسٹ ہوم آئی تھی۔ اس کار کی آمد اور اس میں موجود ڈرائیور کی فلم بندی انٹیلی جنس کے کیمرہ یونٹ نے آسانی سے اس طرح کر لی تھی کہ اُسے احساس ہی نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے کار سوار کی آمد سے بہت پہلے ہی اپنے لئے محفوظ ٹھکانہ تلاش کر لیا تھا اور کار کی آمد سے پروین اور عمرانہ کے اُس میں سوار ہونے تک کی مکمل تفصیلات سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل ہو چکی تھی۔

●

گیسٹ ہوم سے ہوٹل تک کسی نے اُن کا تعاقب نہیں کیا۔

ہوٹل میں اُن کے استقبال کے لئے شیر گل اور اُس کے ساتھی پہلے ہی سے چشم براہ تھے۔ کار واپس چلی گئی اور دونوں ڈائننگ ہال میں چلی آئیں جہاں پہلے ہی سے اُن کی ٹیبل ریزرو تھی۔ جس پر ایک درمیانی عمر کا شخص اُن کا منتظر تھا۔

''سلیم'' کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ عمرانہ کی طرف بڑھایا تھا جس نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اُسے اپنے نام سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

''پروین نے آپ کی اتنی تعریف کی کہ مجھے خواہ مخواہ ملاقات کا شوق چڑھ آیا۔'' اُس نے گفتگو کی تمہید باندھی۔

''جی شکریہ! میں بھی پروین کے کہنے پر ہی آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

عمرانہ نے بظاہر ایسا ہی تاثر دیا تھا جیسے اُس پر ملاقات کا احسان جتلا رہی ہو۔ اُس نے اپنی میز سے تیسری میز پر شیر گل اور اُس کے ساتھی کو بیٹھے دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا اور اب اُس کا اعتماد پہلے سے بھی دوچند ہو گیا تھا۔

سلیم نامی شخص جو اُس کے سامنے بیٹھا تھا شیر گل خان کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سلیم نہیں بلکہ نسیم بھائی ہے۔ تنظیم کے تخریب کار گروپ کا مقامی سرغنہ۔

تنظیم کے تخریب کار گروپ کے لوگ بہت کم ہی منظر عام پر آیا کرتے تھے۔ یہ تمام لوگ ''را'' کے تربیت یافتہ اور انتہائی خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ انہیں بھارتی انٹیلی جنس کی طرف سے باقاعدہ ہدایات دی جاتی تھیں اور تنظیم کی آڑ میں دراصل یہ لوگ ''را'' کے آلہ کار بن کر ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں کرتے تھے۔

سلیم کے کھانا منگوانے تک عمرانہ نے اُس پر اپنی ''ترقی پسندی'' کا جادو چلا لیا تھا۔

''سلیم صاحب مجھے دراصل دیر سے اس بات کی سمجھ آئی کہ اس دنیا میں ہر رشتے کی پہچان دولت سے ہے۔ باقی سب فراڈ ہے اور مجھے تو اب بہر صورت اسی کو حاصل کرنا ہے۔ میں نے پروین کو بتایا ہے کہ میں جلد ہی یورپ کا چکر لگانے والی ہوں۔ ایک رابطہ ہوا ہے اور ادھر کسٹم میں اپنی ٹھیک ٹھاک واقفیت بھی ہے۔ ایک چکر ہی میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر لوں گی۔ باقی پھر دیکھا جائے گا۔''

اُس نے آدھے گھنٹے کی گفتگو کے بعد بالآخر سلیم کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''مس عمرانہ! آپ کو اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اگر آپ کو یہ سب کچھ یہاں بیٹھے بٹھائے ہی مل جائے تو کیسا رہے گا۔''

سلیم نے بے حیائی سے آنکھ دبائی۔

''ویل ڈن..... شاندار..... کیا ایسا ممکن ہے۔''

عمرانہ نے اپنی دانست میں خاصی بے قراری دکھائی تھی۔

''یہ جگہ کچھ مناسب نہیں لگتی آیئے اوپر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یہاں ہمارے نام پر ایک دو کمرے ہمیشہ ریزرو رہتے ہیں۔''

سلیم نے کہا۔

''چلئے!''

عمرانہ اس طرح اُٹھ کر کھڑی ہوئی تھی جیسے اُس وقت اس کے لئے اس سے زیادہ ضروری کام اور کوئی نہ رہا ہو۔

اس کی اس حرکت پر مینا کشی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے آنکھ دبا کر خاص اشارہ کیا تھا جس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ یہ چڑیا تو خود بخود پنجرے میں پھنس رہی ہے۔

اُس کی اس حرکت کو تیسری میز پر بیٹھے شیر گل خان نے نوٹ کر لیا تھا۔

''چلئے مس عمرانہ..... آپ واقعی بہت سمارٹ ہیں..... بڑی زبردست شے ہیں آپ۔''

پروین نے اُسے بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اس ہوٹل کی تیسری منزل پر بنے کمرے میں موجود تھے..... اُن کے ہال سے باہر نکلنے پر شیر گل اپنی میز سے اس طرح اُٹھ کر باہر آیا تھا جیسے اُسے کسی مہمان کا انتظار ہو جو اب تک نہیں آیا اور وہ اُسی کو دیکھنے جا رہا ہے۔

عمرانہ نے اُسے دیکھ کر نامحسوس انداز میں گواس تک یہ پیغام منتقل کر دیا تھا کہ وہ ابھی اس ہوٹل میں مقیم ہیں۔

لیکن.....!

شیر گل نے احتیاطاً دوسری لفٹ کے ذریعے اُن کے کمرے تک اُن کا پیچھا کیا تھا پھر کمرے کا نمبر پڑھ کر مطمئن ہو کر واپس لوٹ آیا۔

سلیم نے عمرانہ کو بڑے احترام سے کُرسی پر بٹھایا تھا اور دونوں اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے کافی کمرے ہی میں منگوالی تھی۔

''مس عمرانہ! مجھے آپ کے خیالات سے صدفی صد اتفاق ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ انسان خواہ مخواہ اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالے آپ کو قدرت نے حُسن کی لازوال دولت بخشی ہے۔ آپ کے پاس اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار کوئی نہیں۔ اس ملک میں قدم قدم پر آپ کو بے شمار ایسے گدھے مل جائیں گے جو آپ کے ایک اشارہ ابرو پر اپنا دل بھی ہتھیلی پر نکال کر رکھنے کو تیار ہو جائیں گے۔ آپ کو بس ہمارے لئے اُن سے رابطہ رکھنا ہوگا۔ دیکھئے مس عمرانہ ہم بزنس مین ہیں اور سرکار دربار سے ہمارا کام لگا ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی ڈیل ہوگی، اُس میں سے آپ کو چوتھا حصہ مل جایا کرے گا..... فی الحال تو میرے پاس آپ کے لئے بہترین آفر یہی ہے۔''

اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد سلیم نے اُس سے کہا۔

''سلیم صاحب! میں ایک بات صاف صاف بتا دوں کہ اس بزنس میں ہماری حیثیت ایک پارٹنر کی ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں.....''

اُس نے سلیم کے دل میں اگر کوئی شبہات باقی تھے تو بھی یہ بات کہہ کر نکال دیئے اور اُنہیں اُمید ہوگئی کہ واقعی یہ لڑکی ہوس کی ماری ہوئی ہے اور ہوس کے اندھوں کی اُن سے زیادہ ضرورت اور کسے ہو سکتی تھی۔

''ویل ڈن۔ مس عمرانہ آپ کا اور ہمارا ساتھ خوب نبھے گا۔ ہمیں بھی ایسے ہی دوست چاہئیں جو بزنس کو بزنس سمجھیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا جیسا آپ چاہیں گی لیکن ہم اپنے دوستوں سے یہ اُمید ضرور رکھتے ہیں کہ وہ وقت آنے پر ہمارا ساتھ دیں اور ایک دوسرے کو اکیلا چھوڑ کر نہ بھاگیں۔

سلیم نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ بات قبل از وقت ہے سلیم صاحب اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا کہ کس نے کس کا ساتھ دیا اور کون میدان چھوڑ کر بھاگا۔''

عمرانہ نے دوبدو جواب دیا۔

ابھی تک اُنہیں عمرانہ کی کسی حرکت پر شک تک نہیں گزرا تھا۔ سلیم تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ اُس کی پہلی ڈیل نہیں بلکہ وہ اس میدان کی منجھی ہوئی کھلاڑی ہے۔ اُس کی گفتگو سے کم از کم یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

''مس عمرانہ آپ کی ملاقات پروین ہمارے ایک سرکاری دوست سے کروائے گی۔ اس سے آپ کو ہمارے طریق کار کا اندازہ ہو جائے گا۔ میں صرف ایک ہی بات کہوں گا کہ آپ کی اور ہماری بقا اسی میں ہے کہ ہم کام کی نوعیت جانے بغیر صرف اپنے کام سے غرض رکھیں۔ بہت سی باتوں کا علم بسا اوقات بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو ابتداء ہی میں بتا دوں کہ ہمیں عموماً تجارتی معاملات سے متعلق سرکاری دستاویزات کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ جس کے لئے ہم منہ مانگی قیمت دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ کو ہم جس سرکاری افسر کی نشاندہی کریں اُس سے تعلقات استوار کر کے اُسے اپنے دام میں پھانسنا ہی آپ کی اہلیت تصور ہوگا۔ بظاہر آپ ایسی سمجھدار اور خوبصورت خاتون کے لئے یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں لیکن دراصل وہ کام ہے جس کی قیمت ہم لاکھوں میں ادا کریں گے۔''

عمرانہ کو اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ یہ شخص جن ''تجارتی دستاویزات'' کا ذکر کر رہا ہے وہ دراصل کون سی دستاویزات ہیں؟

دراصل یہ لوگ اُسے اندھیرے میں رکھ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کا طریق واردات بھی تھا جس میں اکثر اُنہیں کامیابی نصیب ہوتی تھی۔

کتنے خطرناک لوگ تھے یہ۔

اس طرح تو وہ معمولی سی فلرٹ قسم کی لڑکی کو بھی اپنے جال میں پھانس سکتے تھے۔ اُس لڑکی بے چاری کو تو یہی بتایا جاتا ہوگا کہ وہ معمول کے مطابق جسم فروشی کر رہی ہے۔ لیکن.....!

دراصل اس کی آڑ میں کتنا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

عمرانہ کو اندازہ ہو گیا کہ اخبارات میں جو خبریں ''را'' کی طرف سے پاکستان میں آنے والی فاحشہ عورتوں کی ہوتی ہیں جن سے ''را'' والے جاسوسی کی خدمات لیتے ہیں۔ اصل میں یہ بھارتی لڑکیاں کم اور مقامی بدقسمت لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ وہی لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں سلیم جیسے ''را'' کے پالتو کتے اُن کے لئے پھانستے ہیں۔

''مسٹر سلیم میں آپ کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہوں گو مجھے یہ کہنا نہیں چاہئے میں بھی آم کھانے سے غرض رکھتی ہوں۔ اس زمانے میں گٹھلیاں گننے کی مہلت کسے میسر ہے۔ لیکن میری یہ خواہش ضرور رہے گی کہ اگر آپ لوگوں کے لئے یہ بات غیر ضروری نہ ہو تو میں جاننا چاہوں گی کہ میں دراصل کس کے لئے کام کر رہی ہوں۔ اس طرح کم از کم مجھے اپنی اہلیت اور کام کی بھی اہمیت کا احساس رہے گا۔''

اس نے ہوا میں تیر چلایا۔

''بہت سی باتیں مس عمرانہ وقت سے پہلے جان لینا اچھا نہیں لگتا۔ اس طرح بات کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے آپ ہمارا اعتماد حاصل کریں گی ویسے ویسے آپ کو مختلف نوعیت کی جانکاری بھی حاصل ہوتی جائے گی لیکن میں بغیر لگی لپٹی رکھے یہ بات ابھی سے بتا دوں کہ ہمارے معاہدے میں یہ بات شامل نہیں ہوئی کہ آپ کو کام کی نوعیت بھی سمجھائی جائے۔ یہ ہماری ''ڈس کریشن'' ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ ابتداء ہی میں ہم آپ کو وہ کچھ بتا دیں جو شاید کسی کو کبھی نہیں بتاتے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آپ کو کبھی کچھ نہ بتائیں۔''

سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں مسٹر سلیم۔''

عمرانہ نے مزید سوالات کر کے بنا بنایا کھیل بگاڑنے کی بجائے فی الوقت تیل اور تیل کی دھار کو دیکھنے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔

''یہ ہماری پہلی ملاقات کا نذرانہ اور دوستی کی ابتداء ہے۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنا بریف کیس کھولا اور بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں اُس کے سامنے رکھ دیں۔

''تھینک یو۔''

عمرانہ نے دونوں گڈیاں گنے بغیر اپنے بڑے سے پرس میں منتقل کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد پروین نے وہیں سے فون پر ایک نمبر ملایا اور دوسرے ہی لمحے ملک اختر لائن پر تھا جس نے انہیں ایک دوسرے ہوٹل میں پہنچنے کی تلقین کی تھی۔

''او کے سلیم صاحب نائس میٹنگ۔''

عمرانہ نے سلیم کی طرف بے تکلفی سے ہاتھ بڑھایا۔

''آف کورس۔''

سلیم نے اُس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دونوں کو لفٹ تک چھوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

دونوں لفٹ سے نیچے اُتریں تو لفٹ کے دروازے کے سامنے لابی میں رکھے آرام دہ صوفے میں دھنسا شیر گل خان اُس کا منتظر تھا۔

''اسی طرف چلتے ہیں۔''

عمرانہ نے بے تکلفی سے اپنی ساتھی کا ہاتھ تھام کر اُس کا رُخ ایگزٹ کے بجائے نزدیکی ہال کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ باہر جانے کا راستہ نہیں۔''

پروین نے حیرانگی سے کہا۔

''مجھے علم ہے محترمہ لیکن ہیرے میری کمزوری ہیں اور یہاں ڈائمنڈ کی نمائش چل رہی ہے۔ کیا خیال ہے۔''

عمرانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ونڈرفل..... سپلینڈڈ..... واقعی تم جیسی عورت کی کمزوری ہیرے ہی ہونی چاہئیں۔''

میناکشی نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

دونوں ہوٹل کے اُس ہال کی طرف جا رہے تھے جہاں مقامی کمپنیوں کی طرف سے ہیروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اُن کے یہاں پہنچنے کے بمشکل دو منٹ بعد ہی شیر گل خان بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے شوکیس میں سجے ہیروں کو بائیں ہاتھ سے دیکھنا شروع کیا تھا جبکہ عمرانہ اور میناکشی نے دائیں ہاتھ سے۔

میناکشی کے لئے اس نمائش میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا وہ ہیرے دیکھنے کے بجائے انہیں حاصل کرنے پر یقین رکھتی تھی۔

لیکن.....!

اُسے عمرانہ کی ہر ادا فی الحال برداشت کرنی تھی۔ اُس نے ہیروں سے اُکتا کر دیوار میں لگی پینٹنگز کو مرکز نگاہ بنا لیا تھا اور اُس وقت بھی ایک پینٹنگ ہی دیکھ رہی تھی جب عمرانہ نے موقعہ غنیمت جانا اور پھرتی سے نامحسوس انداز میں شیر گل کے قریب پہنچ گئی۔

دونوں بظاہر ایک شوکیس پر جھکے اُس میں سجائے قیمتی ہیروں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور اُن کی طرح یہاں موجود باقی تماشائی بھی اپنے اپنے خیال میں مگن تھے۔

''گرینڈ لے ہوٹل، ہم اس وقت جا رہے ہیں۔''

عمرانہ نے جھکتے جھکتے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور آگے بڑھ گئی۔

شیر گل خان نے اُس کی طرف دیکھے بغیر اُس کا پیغام نوٹ کر لیا تھا اور اب وہ خراماں خراماں ہال کے باہری دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

''سوری..... ویری سوری..... مجھے علم ہے کہ تم بور ہو رہی ہو لیکن کیا کروں ان ہیروں کے شوق نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔''

عمرانہ نے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی میناکشی کے نزدیک جا کر کہا۔

''اوہ نو..... اِٹس او۔کے۔''

میناکشی نے بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

دونوں ٹہلتی ہوئی باہر آ گئیں۔ انہوں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے ہی ''رینٹ اے کار'' سے پرائیویٹ کار حاصل کی تھی اور اب گرینڈ لے ہوٹل کی طرف جا رہی تھیں جہاں ملک اختر شام کی چائے پر اُن کا منتظر تھا۔

دونوں کے استقبال کے لئے یہاں شیر گل خان اور اُس کے ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے ملک اختر پہچان سکتا۔ جس کے لئے اس ہوٹل کے ایک محفوظ کونے میں ایک میز ہمیشہ ریزرو رہا کرتی تھی۔

●

عمرانہ کی شکل پر نظر پڑتے ہی ملک اختر کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اُس نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا تھا اور اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک عمرانہ سلیقے سے کُرسی پر بیٹھ نہ گئی۔

''ملک صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔''

اچانک ہی میناکشی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا شاید وہ اُسے صورتحال کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

''کچھ نہیں..... دراصل میں کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا آپ کی دوست کی شخصیت سے۔''

اختر ملک کہے بغیر نہ رہ سکا۔

تینوں نے خاص محفوظ کونہ تلاش کیا تھا۔ اس وقت یہاں زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ کیونکہ اس ہوٹل میں سینکس بھی لنچ کے بھاؤ پڑتے تھے اور کوئی ہمت والا ہی اِدھر کا رُخ کرتا تھا۔

میناکشی نے دونوں کا تعارف کروانے کے بعد ملک اختر کو بتایا کہ ''بھائی جان'' نے عمرانہ کو بھی اپنا بزنس پارٹنر بنا لیا ہے اور اب وہ بھی اس سے رابطہ قائم کیا کرے گی۔

''زہے نصیب۔''

ملک اختر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

عمرانہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی گھٹیا ذہنیت رکھنے والے اس گدھے کو کس نے اتنی اہم اور حساس پوسٹ پر تعینات کیا تھا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ اس

معاشرے میں ملک اختر اپنی نوعیت کی کوئی واحد مثال نہیں۔ سارا ملک ہی اقرباء پروری، کرپشن اور غنڈہ گردی کی سیاست میں اُلجھا ہوا ہے۔ جب کوئی قوم اپنی اخلاقی اقدار کا بیڑہ غرق کرنے پر خود ہی تل جائے تو پھر وہاں ملک اختر جیسی مثالیں ہی دیکھنے کو ملیں گی۔

اس کے دل میں اس شخص کی شکل پر نظر پڑتے ہی نفرت پیدا ہو گئی تھی لیکن اُس نے جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔

مینا کشی نے ملک اختر کے سامنے عمرانہ کو اُن احتیاطی تدابیر سے آگاہ کیا جو اُس سے ملاقات کے لئے ضروری تھیں۔ اُس نے عمرانہ سے کہا کہ اُسے ان تدابیر پر سختی سے عمل کرنا ہوگا۔

''آپ کے پورٹ والے کام سے بھائی جان بہت خوش ہیں۔''

مینا کشی نے ملک اختر کو بتایا۔

''ارے ہم تو غلام ہیں آپ کے۔ آپ کہیں تو خود سمندر میں چھلانگ لگا دیں۔''

ملک اختر کمینگی پر اُتر آیا تھا۔ اُسے بن پیئے ہی نشہ ہونے لگا تھا۔

''ملک صاحب کل جو لانچ یہاں سے جا رہی ہے اُس میں ہمارے دس بہت اہم ورکر ہیں جنہوں نے دوسری طرف جانا ہے۔ کل آپ نے بطور خاص خود موقعے پر موجود رہنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دوسرے محکمے والے افسرِ اعلیٰ نے ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔ بھائی جان اس بات پر بہت برہم ہیں کہ وہ آپ کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا کون ہے۔''

مینا کشی نے کام کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

''مجھ پر چھوڑ دو میری جان..... ایسے کئی افسرِ اعلیٰ آئے اور گئے۔ خدا جانے ان لوگوں کو کباب میں ہڈی بننے میں کیا مزہ ملتا ہے۔''

ملک اختر نے اس کی تشویش دُور کرتے ہوئے کہا۔

''مس عمرانہ کی ملاقات آپ نے اپنے دوست سے کروانی ہے۔''..... اُس نے عمرانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مس عمرانہ ہمیں جس شخص سے تجارتی دستاویزات حاصل کرنی ہیں اُس تک ملک صاحب آپ کو پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کام شروع ہوگا۔ میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ کبھی بغیر وجہ کے ملک سے رابطہ نہیں کرنا۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔''

اُس نے اپنی بات مکمل کی۔

دونوں عمرانہ کی موجودگی میں اگلے روز روانہ ہونے والی کسی لانچ سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ عمرانہ نے اُن کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ اس لانچ کے ذریعے کچھ لوگوں کو غیر قانونی طور پر بھارت پہنچایا جائے گا۔ جنہوں نے وہاں موجود ''را'' کے تربیتی کیمپوں میں تخریب کاری کی تربیت حاصل کرنی ہے۔

انہوں نے اپنی گفتگو میں زیادہ اصطلاحیں ایسی استعمال کی تھیں جن کی عام آدمی کو سمجھ نہیں آ سکتی تھی لیکن اُس کے لئے سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

''اب چلیں..... جلدی ملاقات ہوگی۔''

میناکشی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایکسکیوزمی..... میں ذرا باتھ روم تک.....''

عمرانہ نے اُن سے اجازت طلب کی اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

اُس کے باتھ روم کی طرف جانے کے بمشکل دو منٹ بعد ہی شیر گل خان بھی اُس طرف جا رہا تھا۔ مردانہ اور زنانہ باتھ روم ایک دوسرے کے سامنے بنے ہوئے تھے جن کے درمیان دیوار بنا کر پردہ کیا گیا تھا لیکن اس طرف جانے والا راستہ ایک ہی تھا۔

شیر گل خان راستے کے کنارے پر اس طرح کھڑا تھا کہ ہال میں موجود لوگ اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

اُسے یہاں کھڑے بمشکل ایک منٹ ہوا تھا جب اُس نے زنانہ باتھ روم کی طرف سے قدموں کی آہٹ سُنی دوسرے ہی لمحے عمرانہ کی شکل اُسے دکھائی دی۔ جس نے اپنے ایک ہاتھ میں وہ چھوٹی سی ٹیپ تار سمیت لپیٹ کر پکڑی ہوئی تھی جسے اُس نے اب تک اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔

ٹیپ اُس نے اتنی ہوشیاری سے شیر گل خان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھی تھی کہ اگر کوئی اُن کی طرف دیکھ بھی رہا ہوتا تو اندازہ نہ کر پاتا۔

عمرانہ ڈائننگ ہال کی طرف چل دی تھی اور شیر گل خان ٹیپ سنبھالتا ہوا باتھ روم کی طرف چلا گیا تھا۔

''چلئے جناب!''

اُس نے میناکشی سے کہا۔

بھئی ہمارے غریب خانے پر کب لا رہی ہو مس عمرانہ کو۔''

ملک اختر نے اٹھتے ہوئے میناکشی سے کہا۔

ملک صاحب آپ گھبرائیے نہیں، میں کسی سفارش کے بغیر خود ہی بہت جلد آپ سے ملنے آ رہی ہوں۔ مجھے تو نجانے کب سے آپ کی تلاش تھی۔

بظاہر یہ بات عمرانہ نے اس انداز سے کہی تھی کہ ملک اختر کی باچھیں کھل اٹھیں۔

●●●

عظمت کے مینارے

ٹیپ ریکارڈر اُن کے سامنے دھرا تھا اور اُس کی آواز ایک بڑے سپیکر کے ذریعے دونوں تک بڑی واضح ہو کر پہنچ رہی تھی۔ اس میں اُس لانچ کے متعلق گفتگو موجود تھی جس کو ملک اختر کی غداری کے ذریعے پاکستانی سمندروں کا تقدس پامال کرنا تھا۔

''سر! میرے خیال سے مزید انتظار کرنا یا ان لوگوں کو موقعہ دینا مناسب نہیں۔ اَب آپ کو جرأت ایمانی سے کام لے کر کچھ کر گزرنا چاہئے۔''

شیر گل خان جس کی رگوں میں انگارے دوڑنے لگے تھے، بولا۔

''ہاں شیر گل خان۔ مزید انتظار مناسب نہیں ہوگا۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اس لانچ میں بندو خان بھی جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی بھی طرح ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلے۔''

افسرِ اعلیٰ کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

وہ تمام مصلحتوں پر لعنت بھیج کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اُن کی وفاداری ملک سے تھی۔ سٹیٹ سے تھی۔ غدار کوئی بھی ہو، حاکم یا محکوم اُن کے نزدیک قابلِ معافی نہیں ہوتا۔

وہ بابا صاحب کو چوہے دان میں پھانسنے کے لئے اُسے بل سے نکالنا ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے نوجوان آفیسر شیر گل خان اور عارف کی مدد سے بڑی مہارت اور محنت سے بابا صاحب کے گرد ایسا جال بُن دیا تھا جس سے اس کا بچ نکلنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

شیر گل خان کل رات کو گیارہ بجے مجرم ہمارے شکنجے میں ہوں گے جس کے فوراً بعد تم ملک اختر کو قابو کرو گے۔ عمرانہ سے کہو اس انڈین لڑکی پر کڑی نظر رکھے اور ملک اختر کے ساتھ ہی اُسے بھی قابو کر لے۔ میں ملک اختر کے وارنٹ گرفتاری آج رات تک بہر صورت حاصل کر لوں گا۔ ناؤ گیٹ سٹارٹ۔''

انہوں نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ شیر گل خان کی طرف بڑھایا۔

''رائٹ سر!''

شیر گل خان نے محبت وطن افسرِ اعلیٰ کا ہاتھ فرطِ عقیدت سے جھک کر چوما اور اُن کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ جانتا تھا کہ بھیڑیوں کے اس بھٹ میں ہاتھ ڈالنے والا یہ مائی کا لال کسی کرموں والی کا جنا ہے جو اپنی عزت، جان اور مال کی پرواہ کئے بغیر ملک کی سلامتی کے لئے اپنی جان سے گزرنے پر تُل گیا تھا۔

اُس نے جس خطرناک کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس میں اُسے نوکری ہی سے نہیں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے لیکن اُس کے افسرِ اعلیٰ نے کسی مصلحت کو اپنے فرض پر غالب نہیں آنے دیا تھا۔

خداوندا!! اس عظیم انسان کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ اس کی حفاظت کرنا میرے مولا کریم۔ یہ لوگ ہماری آبرو ہیں۔ یہی وہ چند افسرِ اعلیٰ ہیں جن کی نیتوں کا صدقہ ابھی تک یہ ملک سلامت ہے ورنہ جس طرح چاروں طرف سے درندوں نے اس پر یلغار کر رکھی ہے اور ہماری آستینوں کے سانپ جو اپنی دھرتی کے لئے کوڑھ بنے ہوئے ہیں جس طرح ان وحشیوں سے بڑھ چڑھ کر تعاون کر رہے ہیں اُس کے بعد تو یہاں سے غیرت ملی کا جنازہ اُٹھ چکا تھا۔ خدائے ذوالجلال یہ ملک تیرے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ پینتالیس سال سے یہ وطن فروش تیرے اُن بندوں کو جو اپنے ہی خون کا سمندر عبور کر کے اس مملکتِ خداداد تک پہنچے تھے دوبارہ غلام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ الہٰ العالمین! اگر تیرے نام پر حاصل کردہ اس ملک کے بدقسمت عوام کی زندگیوں اور آبرو سے چند لٹیرے اسی طرح کھیلتے رہے تو ہم جیسے گناہ گار بندوں کا ایمان تیری رحمت اور منصفی سے اُٹھنے لگے گا۔ یا اللہ! انصاف کر..... انصاف کر..... اور ان وحشیوں کو اُسی ذلت آمیز موت سے دوچار کر جو اُن سے پہلے والوں کا مقدر بنی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بے اختیار اس کا سر میز سے جا لگا!

آنسو تھے کہ اُس کے آہنی وجود کو طوفانی ریلے کی طرح بہائے لئے جاتے تھے۔

اُس نے اپنے سینے میں گھٹی آہوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ اخراج کی راہ دکھائی تھی۔

اُس کے دل پر دھرا سارا بوجھ، جس نے اُس کے وجود کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا، آنسوؤں کی اس طغیانی میں اس طرح بہا کر اُسے اپنا وجود گلاب کے پھول کی طرح ہلکا پھلکا اور کھلا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے اُس نے آنکھوں کے راستے رخساروں تک بہہ آنے والے آنسوؤں کو سمیٹا اور باتھ روم کے شیشے میں آج ایک بدلے ہوئے شیر گل خان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

شیر گل خان نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور اُس کا آنسوؤں میں دُھلا چہرہ نکھر گیا۔ ایک مسکراہٹ سچائی کے ابدی حسن کی طرح اُس کے ہونٹ پر جم گئی۔

رات ایک پہر بیت چکی تھی جب وہ اپنے گھر پہنچا۔

●

صبح بیدار ہونے پر اُسے والدہ نے بتایا کہ عارفہ نے شام کے بعد دو تین مرتبہ فون کر کے اُس کی خیریت دریافت کی ہے۔

عارفہ کو اس کے فون نمبر کا علم تو تھا لیکن اُس نے شاید ہی کبھی شیر گل خان کو فون کیا تھا۔ اس طرح اچانک اُس کی طرف سے دو فون آنے کی اطلاع نے اُسے تشویش

میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس نے پہلی فرصت میں عارفہ سے رابطہ ضروری جانا۔ عارفہ نے اُسے ہنگامی صورت میں اپنے ایک ہمسایہ کا نمبر دیا ہوا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اُس نے وہی نمبر گھما دیا۔

دوسری طرف سے کسی ادھیڑ عمر خاتون نے فون اُٹھایا تھا۔ شیر گل خان نے مقامی لوگوں کے سے انداز میں بات کرتے ہوئے اُنہیں عارفہ کو بتلانے کے لئے کہا اور اپنا وہ نام بتایا جو اُس نے کبھی عارفہ کو بتا رکھا تھا۔ عارفہ اور شیر گل خان دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے محلے میں بھی کسی کو شیر گل کی اصلیت کا علم ہو کیونکہ اس علاقے کو تنظیم کا گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں اپنی مرضی سے زندگی جینے کی کم از کم سزا موت تھی۔

جتنی دیر فون ہولڈ رہا اُس کے دل کی دھڑکن بڑھتی رہی، خدا خدا کر کے فون پر اُسے ایک مہربان آواز سنائی دی۔ شیر گل خان نے اندازہ لگا لیا کہ یہ عارفہ کی ماں کی آواز ہی ہو سکتی تھی جس نے شاید ہمسایوں کو مطمئن کرنے کے لئے اُس کی خیر خیریت دریافت کرتے ہوئے فون اپنی بیٹی کو تھما دیا تھا۔

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔''

اس نے فون پر عارفہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔

''کیا بات ہے کیا پریشانی ہے۔ خیریت تو ہے ناں، میں گھر سے بول رہا ہوں۔''

شیر گل اس کی آواز سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

''امی کی طبیعت خراب ہے۔ میں امی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر آ رہی ہوں آپ بھی وہیں آ جائیں۔''

عارفہ نے کہا اور شیر گل خان نے فون پر ہی اندازہ کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ شاید اسے خوف تھا کہ کوئی اُن کی باتیں نہ سن رہا ہو اور اس خوف کے پیش نظر اس نے یہ بات کہہ دی تھی۔ اُس کے شک کی تصدیق بھی تب ہو گئی جب عارفہ نے اُس سے دو تین اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد فون پر ہی سرگوشی کے انداز میں اُس ہوٹل کا نام لے دیا جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔

''عارفہ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں شاید تم کسی مسئلے پر بہت پریشان ہو لیکن گھبرانا نہیں۔ تم جس طرح بھی ممکن ہو اس وقت اپنی امی کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانے کے بہانے ہوٹل پر پہنچو میں تمہارا منتظر ہوں اور اپنے اوسان بحال رکھو کسی کو شک نہ ہونے دینا۔ اچھا خدا حافظ!''

اُس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اپنے اُس عزیز کا نمبر گھما رہا تھا جس کے ہوٹل میں عارفہ نے آنا تھا۔

''حسن خان!'' اُس نے لائن ملنے پر دوسری طرف سے کسی آواز کو پہچانتے ہوئے کہا۔ ''میرے مہمان آ رہے ہیں۔ اُن کی ہر ممکن حفاظت کرنا۔ اپنے لوگوں کو چوکس کر دو معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

''شیر گل خان مطمئن رہو۔ کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

حسن خان کی پُر اعتماد آواز نے اُس کا حوصلہ بڑھا دیا۔

اگلا نمبر اُس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کا گھمایا تھا۔ جنہیں فون پر اُس نے عارفہ اور اپنے تعلقات کی نوعیت اور اپنے اندازے سے اُنہیں پیش آمدہ خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اُن کی مدد طلب کی تھی۔

''میں اس علاقے کی ''پیٹرول'' کو ہدایت دے رہا ہوں۔ حوصلہ رکھنا، ہم انہیں آسانی سے شکار نہیں کھیلنے دیں گے۔ مطمئن رہنا۔''

افسرِ اعلیٰ نے اُسے فون پر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ماں کے بضد ہونے پر اُس نے جیسے تیسے دودھ کا گلاس زہر مار کیا اور اپنی جیپ کو اُڑاتا ہوا ہوٹل تک پہنچا تھا جہاں حسن خان اور اُس کے ساتھی پوری طرح چوکس تھے۔

''ابھی تک تو نہیں آئے تم کہو تو ہم لوگ خود.....''

حسن خان نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

''نہیں لالہ! ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں کچھ دیر انتظار کر لینا چاہئے۔''

اُس نے جیپ ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کی تھی اور خود اُس سڑک پر آ گیا تھا جس سے عارفہ کی آمد ممکن تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی اُسے ایک آٹو رکشا کے تعاقب میں اپنے محکمے کی ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ افسرِ اعلیٰ نے اس کی بات کو سیریس لیا ہے اور وہ لوگ ماضی کی طرح اُسے کسی اور سانحے سے دوچار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جیپ اُس کے نزدیک رُکی تو شیر گل نے ہاتھ کے اشارے سے ''سب اچھا'' کا سگنل دے کر اُنہیں واپس بھیج دیا۔

آٹو رکشا، ماں بیٹی نے احتیاط ہوٹل سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا اور اُس وقت تک وہاں کھڑی رہیں جب تک کہ رکشا اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ جس کے بعد ہی وہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتیں ہوٹل میں داخل ہوئی تھیں۔

حسن خان نے خود اُن کا استقبال کیا تھا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اُس کمرے تک آیا تھا جو اُس کی دانست میں یہاں کا بہترین اور محفوظ ترین کمرہ تھا۔ اُس نے دونوں ماں بیٹی کو تسلی دے کر مطمئن رہنے کو کہا تھا اور ماں بیٹی دونوں نے اُس کے اعتماد اور احترام سے اندازہ کر لیا تھا کہ کم از کم یہاں وہ محفوظ ہیں۔

●

شیر گل خان کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ عارفہ کی آنکھوں میں جانے کب سے رُکے ہوئے آنسو بے اختیار چھلک پڑے۔ اُس نے جن آنکھوں سے شیر گل خان کی طرف دیکھا تھا اُس سے تو شیر گل خان کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کا سامنا عارفہ کی ماں سے ہو رہا تھا۔

''عارفہ حوصلہ کرو مجھے کچھ بتاؤ آخر بات کیا ہے؟''

شیر گل کو اُلجھن ہونے لگی تھی۔

''میں بتاتی ہوں بیٹا۔''

خوفزدہ بوڑھی عورت نے جس کے سر میں چاندی اُتر آئی تھی اور جو اپنی روایات کے بالکل برعکس آج نجانے کسی مجبوری کے عالم میں یہاں چلی آئی تھی۔ شاید عام حالات میں وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔

''بیٹا میں تمہیں صرف اس حد تک جانتی ہوں کہ تم نجمہ کے بھائی ہو، مجھے اس بات کا علم نہیں کہ عارفہ سے تمہارے تعلق کی کیا نوعیت ہے۔ نجمہ ہماری بچی کی طرح ہمارے گھر آیا کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں اس سے پہلے نہیں دیکھا صرف اتنا علم تھا کہ تم سیکورٹی کے افسر ہو، بیٹا تم ہماری مجبوری اور بے بسی کا اندازہ اس بات سے لگالو کہ آج مجھے تمام حجاب اور روایات ایک طرف رکھ کر عارفہ کے حوالے سے تمہارے پاس آنا پڑا ہے۔ بیٹا ہم تو لُٹ گئے۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔

''ماں جی حوصلہ کیجئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی کا حساب لیا جائے گا۔ کسی بھی زیادتی کا۔''

اُسے خود اپنا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تنظیم والوں نے کل ابو کو بلایا تھا انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں اگلے روز یعنی آج شام کو اُن کی ''عوامی عدالت'' میں پیش نہ ہوئی تو اُس کی سزا سارے خاندان کو بھگتنا پڑے گی۔''

عارفہ نے اپنا حوصلہ قائم کیا۔

''لیکن کیوں؟ وہ حرام خور کون ہوتے ہیں تمہیں اپنی عدالت میں طلب کرنے والے۔ اُنہیں کس نے اس کا اختیار دیا ہے؟''

شیر گل کے لئے اپنے غصے پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔

بیٹا! انہیں کس نے اختیار دیا ہے؟ حیرت ہے اس سوال کا جواب تو ہمیں تم سے مانگنا چاہئے تھا کیونکہ سرکار کی نمائندگی تو تم کرتے ہو۔ بلایا انہوں نے اس لئے ہے کہ انہیں خدا جانے کس طرح اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ عارفہ کے تمہارے ساتھ تعلقات ہیں اور تنظیم کے کسی دشمن کے ساتھ تعلق کا مطلب اپنی موت کے بلیک وارنٹ سائن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خیال سے تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔''

عارفہ کی ماں نے بھی اب خود پر قابو پا لیا تھا اور قدرے تلخی سے اُس کی اس بات کا جواب دیا تھا۔

''انہوں نے کل میر صاحب کو اپنے پاس بلا کر اُنہیں اپنی بیٹی کے اس ''جرم'' سے آگاہ کیا اور اُنہیں قوم کا غدار قرار دیتے ہوئے اس غداری کی سزا سے بھی آگاہ کر

دیا ہے۔اس کے ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ وہ آج رات تک اپنی بیٹی کو اُن کے حضور پیش کریں تا کہ ملزمہ براہِ راست اُن کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کرے اور وہ اُسے سزا دے سکیں۔"

بوڑھی اور بے کس عورت نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"ماں جی! میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں اب آپ کچھ اور نہ بتایئے۔ میں آپ کو صرف ایک بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں سرکاری ملازم یا پولیس آفیسر ہوں بلکہ اس تعلق کے حوالے سے کہہ رہا ہوں جو قدرت نے ہمارے درمیان قائم کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری یہ بات بہت عجیب لگی ہے کہ ایک معمولی سا آفیسر ہونے کے ناطے میری حیثیت ہی کیا ہے ارباب حکومت جس کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑتے ہوں اور جس سے اقتدار کے تسلسل کی بھیک مانگتے ہوں اس کے سامنے ایک معمولی سے سرکاری ملازم کی حیثیت ہی کیا ہوگی لیکن آپ سے صرف ایک بات کہتا ہوں کہ اب ہاتھی نے چیونٹی کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہا ہے۔ طاقت اور اقتدار کے نشے میں بدمست یہ ضمیر فروش درندے ہاتھی کی طرح مضبوط درخت کو تو جڑوں سے اُکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں لیکن چیونٹی سے نہیں ٹکرا سکتے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ ان وحشیوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ جب چاہیں انسانی قوانین کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں اس طرح شاید وہ قانونِ قدرت کا بھی مذاق اُڑانا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ میری بہن نجمہ میرے ارادوں میں ابھی زندہ ہے۔ میں اب کسی کو نجمہ کی طرح بے بسی کی موت نہیں مرنے دوں گا۔ میری صرف ایک درخواست ہے کہ اب چند روز کے لئے میرے کہنے پر عمل کر لیجئے۔ اس میں ہم سب کی بقا اور بھلائی ہے۔"

بوڑھی عورت کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُس کے زخموں پر بڑے آرام سے پھاہا رکھ کر اُسے پرسکون نیند سلا دیا ہو۔

نجانے کیوں کوئی نادیدہ قوت انہیں بار بار اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔

"بیٹا! اب خدا کے بعد تم ہی ہمارا سہارا ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم تمہارے دروازے پر کیوں دستک دیتے۔ بیٹے تمہیں دیکھنے سے پہلے میں نے تمہارے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی تھی۔ لیکن مجھے اس بات کی اُمید ضرور تھی کہ میری تربیت کبھی مجھے دھوکہ نہیں دے گی۔ ایک ماں ہونے کے ناطے مجھے آج اپنی بیٹی عارفہ پر فخر محسوس ہوا ہے۔"

معزز خاتون نے کہا اور خاموشی اختیار کر لی۔

حسن خان نے اس کے لئے کمرے میں چائے کا بندوبست کر دیا تھا اور بیرہ چائے لے کر آ رہا تھا۔ شاید دونوں نے کل سے پانی کو بھی منہ نہیں لگایا تھا کیونکہ اُن کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔

شیر گل خان کے بھنڈ ہونے پر انہوں نے چائے کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ کھایا۔ اس دوران اُس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''میں ابھی حاضر ہوا۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر حسن خان کے دفتر میں آ گیا جہاں سے اُس نے ٹیلی فون پر پھر اپنے افسرِ اعلیٰ کا نمبر براہِ راست ملا کر انہیں مختصر پیش آمدہ صورتحال سے باخبر کرتے ہوئے اُن کی رائے طلب کی تھی۔

''ان لوگوں کو فوراً ''سیف ہاؤس'' میں پہنچا دو۔ آج رات کے ایکشن کے بعد صبح باقی معاملات دیکھ لیں گے۔ یوں بھی فی الوقت اس سے زیادہ اُن کی کوئی مدد نہیں ہو سکتی کہ اُن کی جان بچالی جائے۔ ورنہ ''عوامی عدالت'' کے نام پر ان وحشیوں نے جو رومن اکھاڑے سجا رکھے ہیں وہاں سے کسی کا زندہ بچ نکلنا معجزے والی بات ہوگی۔ میں چھ نمبر پارٹی کا چارج تمہیں دے رہا ہوں۔ اُن کی مدد سے ''کوئیک ایکشن'' کرو۔ ''ایٹ وَنس۔''

افسرِ اعلیٰ کا رویہ اُس کے ساتھ سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہمدردانہ ہو رہا تھا۔

''تھینک یو سر، شکریہ سر!''

اُس کا شکریہ سننے سے پہلے افسرِ اعلیٰ نے فون بند کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ کمرے میں واپس پہنچ چکا تھا۔ اس درمیان ماں بیٹی نے ایک آدھ سکٹ اور زہر مار کر لیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ دونوں اب قدرے پرسکون ہیں۔

''آپ لوگوں کو چند دنوں کے لئے ہم اپنے ایک ''سیف ہاؤس'' میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی حفاظت کے لئے ناگزیر ہے۔ مجھے افسوس ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا کہ آپ کو چند دنوں کے لئے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ آپ دونوں یہاں سے میرے ساتھ جائیں گی اب آپ کا گھر جانا ہماری اطلاعات کے مطابق خطرے سے خالی نہیں۔ آپ کی دونوں بیٹیاں، بیٹا اور میر صاحب بھی آپ کے پاس آج شام تک پہنچ جائیں گے۔ کیا آپ کے لئے میر صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ ممکن ہے۔''

اُس نے دونوں ماں بیٹی سے کہا جن کے چہروں پر خوف نے ڈیرے جما لئے تھے لیکن محفوظ ہو جانے کے احساس کی پرچھائیں بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''بیٹا ان کے آفس میں فون تو ہے کر کے دیکھ لو۔''

عارفہ کی والدہ نے یہ کہتے ہوئے میز پر دھری سلپ پر پنسل سے اُن کا نمبر لکھ دیا۔

شیر گل نے عارفہ کو سمجھانے کے بعد اُس کمرے سے میر صاحب کا فون نمبر ملایا اور عارفہ کو فون تھما دیا۔

عارفہ نے فون پر اپنے باپ سے بڑے پرسکون لہجے میں ساری بات کی تھی اور انہیں یہ بتا کر کہ انہوں نے نجمہ کے بھائی کی مدد حاصل کر لی ہے فون شیر گل کو تھما دیا تھا۔

شیر گل نے میر صاحب کو دو تین منٹ میں سب کچھ سمجھا دیا اور ساتھ ہی انہیں تنبیہ کر دی کہ اُن کی گھبراہٹ سے سوائے اُن کے خاندان کی عزت اور جانیں داؤ پر لگنے کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ ہمت سے کام لیں اور جس طرح انہیں کہا جا رہا ہے اُس پر عمل کریں۔

میر صاحب بھی گرم سرد چشیدہ تھے اسے تائید غیبی جانا اور اُس کی بات ماننے پر تیار ہو گئے۔

''آپ کے پاس ہمارے دوست چند منٹ بعد پہنچ رہے ہیں۔'' اُس نے میر صاحب کو اپنے دوستوں کی پہچان کرواتے ہوئے اُن سے کہا کہ وہ اپنے دفتر میں فوراً دس دن کی چھٹی کی درخواست دے آئیں اُن کا میڈیکل سرٹیفکیٹ وہ لوگ اُن کے آفس پہنچا دیں گے۔

فون رکھ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے پا گیا۔

''آیئے آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔''

اُس نے ماں بیٹی سے کہا۔

تینوں تھوڑی دیر بعد شیر گل کی جیپ میں اُس کی ایجنسی کے ایک سیف ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

''سیف ہاؤس میں اسے محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر کے اُس نے اپنے دفتر کی راہ لی ابھی اُسے بہت کام کرنا تھا۔

میر صاحب تک ان لوگوں نے آدھ گھنٹے میں رسائی حاصل کر لی تھی اور چند منٹ بعد ہی چار مسلح کمانڈوز سفید پوشوں کے ساتھ میر صاحب ایک بڑی پجیرو جیپ میں اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں اُن کی خوفزدہ دونوں بچیاں بے چینی سے اُن کی منتظر تھیں۔

میر صاحب نے اپنی بیٹیوں کی مدد سے چند منٹ کے اندر اندر ضروری کپڑے اور دیگر سامان سمیٹا اور تین بڑے اٹیچی کیسوں کے ساتھ سارے گھر کو تالے لگا کر نیچے اُتر آئے جہاں ایک مجمع جمع ہونے لگا تھا۔

اُن کے ہمسایوں نے شاید تنظیم کے مقامی دفتر کو اطلاع کر دی تھی کہ اُن کے ''غدار'' جان بچا کر فرار ہونے کے چکر میں ہیں۔

جیسے ہی یہ اطلاع وہاں پہنچی فوراً پندرہ بیس مقامی غنڈوں کے ساتھ علاقے کا کونسلر جو شکل ہی سے دس نمبری غنڈہ دکھائی دے رہا تھا پہنچ گیا۔

''کون ہو تم لوگ..... کیا کرنے آئے ہو..... جانتے نہیں یہ یامین کونسلر کا علاقہ ہے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئے یہاں آنے کی؟''

اُس نے جیپ کے باہر کھڑے سفید پوشوں کو اپنی دانست میں ڈانٹ پلائی۔

یہ بات تھی بھی بڑی عجیب، واقعی اس علاقے میں کسی بھی سرکاری اہلکار کو داخل ہونے سے پہلے تنظیم کے مقامی دفتر پر حاضری دے کر اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ تنظیم کے سرکردہ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ اُسے اپنا کام کرنے کی اجازت دیں گے یا نہیں۔

اس طرح آج تک کسی نے براہ راست اُن کی ''حکومت'' کو للکارنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

لیکن.....!

ان بے چاروں کو اس بات کا تو احساس ہی نہیں تھا کہ کبھی اُن کا پالا کسی محب وطن افسر اعلیٰ سے بھی پڑ سکتا ہے جو تمام مصلحتیں خاطر میں لائے بغیر اپنے جذبہ ایمانی

کے بل بوتے پر اُن کی ''سٹریٹ پاور'' کو چیلنج بھی کر سکتا ہے۔

''کونسلر صاحب جایئے اپنا کام کیجئے ہم یہاں سرکاری کام سے آئے ہیں۔''

''اُن میں سے ایک نے اُس کی بات کا جواب اس طرح دیا جیسے ہاتھ سے ناک پر بیٹھی مکھی اُڑا رہا ہو۔''

''کیا ہم اُس کام کی نوعیت جان سکتے ہیں؟''

کونسلر یامین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہم سرکاری طور پر ایسا کرنے کے مجاز نہیں۔ نہ ہی ہم اپنے افسران کے علاوہ خود کو کسی کے سامنے جوابدہ خیال کرتے ہیں۔''

اُس سفید پوش نے لاپرواہی سے کہا۔

''دیکھئے جناب آپ معاملات کو خراب کر رہے ہیں۔ ہماری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے کسی کو نہیں لے جا سکتے۔''

کونسلر کچھ زیادہ ہی گرم جوشی دکھا رہا تھا۔

''دیکھو مسٹر تم جو کوئی بھی ہو، ہمارے کام میں مداخلت نہ کرو۔''

اُس سفید پوش نے جواب دیا۔

''ابے تیری تو.....''

کونسلر یامین نے اُسے گالی دیتے ہوئے اپنی دانست میں اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔

لیکن.....!

جیسے ہی اُس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا دوسرے ہی لمحے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بازو کی ہڈی درجنوں ٹکڑوں میں بٹ گئی ہو۔

آہنی گرفت نے اُس کا بازو فضا میں جکڑا اور اُسے جھٹکا دے کر اس طرح زمین پر پھینکا کہ وہ منہ کے بل زمین چاٹ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ اُس کی غنڈہ فورس حرکت میں آئے باقی تینوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی آٹومیٹک بندوقیں مجمع کی طرف تان لیں۔ اس کے ساتھ ہی سفید پوش نے زمین پر گرے کونسلر کی دھنائی شروع کر دی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو تکلیف دیے بغیر صرف پاؤں کی ٹھوکروں سے درجنوں بے گناہوں کے قاتل اور تنظیم کے مقامی ٹارچر سیل کے انچارج کا مار مار کر حلیہ بگاڑ دیا۔

تنظیم کے غنڈوں کا واسطہ آج تک اس قسم کے ''سرکاری لوگوں'' سے نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے یہی دیکھا تھا کہ مقامی پولیس کے بیشتر اہلکار سرکار کے کم اور تنظیم کے زیادہ وفادار ملازم تھے۔ تنظیم کے غنڈوں نے شہر نگاراں کے بہت سے علاقوں کی طرح یہاں بھی اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ یہاں ان کا حکم چلتا تھا اور یہاں

کے مکینوں کے لئے نہ صرف اس غیر قانونی حکومت کے احکامات پر عمل پیرا ہونا ضروری تھا بلکہ اس نام نہاد حکومت کے اخراجات بھی انہی کو ادا کرنے پڑتے تھے۔
یہ لوگ غلاموں کی زندگی جی رہے تھے۔
ان کی بہو بیٹیاں تنظیم کے وحشی درندوں کی ہوس رانیوں کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں اور اس بربریت کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔
اُن کے جگر گوشوں پر اُن کی آنکھوں کے سامنے اس چیلنج کے ساتھ جبر کے پہاڑ توڑے جاتے تھے کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو وہ حکومت سے انصاف طلب کر لیں۔
خود پر اُٹھائے جانے والے مظالم کے خلاف ان لوگوں کو زبان ہلانے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ اس شہر کے چوراہوں پر ایسی لاشیں عام ملا کرتی تھیں جن کی کھال اُن کے بدن سے نوچ کر الگ کر لی جاتی تھی۔
انسانی بربریت کی تاریخ ایسے گھناؤنے مظالم کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی جو ان لوگوں پر ٹوٹ رہے تھے۔
لیکن.....!
خوف زدہ ہرنوں کی طرح یہ بے بسی سے تمام ظلم برداشت کر رہے تھے۔
آج جب طویل مدت بعد اُنہوں نے اس محلے میں لاء اینڈ آرڈر کو اپنی اصل شکل میں عمل پیرا ہوتے دیکھا تو وہ دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئے۔
وہ حیرت زدہ یامین کونسلر کو پٹتے دیکھ رہے تھے۔
کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اُسے چھڑا لیتا۔
سفید پوش نوجوان نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور اب حالت یہ تھی کہ چند منٹ پہلے تک خود کو زمین پر فرعون سمجھنے والا تنظیم کا غنڈہ کونسلر ادھ موئے سانپ کی طرح، جس کا زہر نکل چکا ہو، زمین پر لوٹنیاں کھا رہا تھا۔
سفید پوش نوجوان اب پاؤں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے یامین کونسلر کا گریبان اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ کر اُسے کھڑا کیا اور دوسرے ہاتھ کو تکلیف دیئے بغیر اُسے سر سے اونچا کر کے زمین پر پٹخ دیا۔
''اُمید ہے اب تمہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا ہو گا۔''
اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جدھر سے میر صاحب اپنی پردہ دار بیٹیوں کے ہمراہ اٹیچی کیس سنبھالے اُس کی طرف آ رہے تھے۔
اُس نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ سے اٹیچی کیس تھامے اور ایک ایک کر کے اطمینان سے پجیرو میں رکھ دیئے۔ تینوں باپ بیٹیوں کے اندر بیٹھنے پر اُس نے دروازہ احترام سے بند کر دیا تھا۔
میر صاحب کو آج احساس ہوا تھا کہ یہ لوگ اندر سے کتنے بزدل ہیں۔ اُن میں سے کسی کو یہ ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ زمین پر گرے کونسلر یامین کو کھڑا کرنے

کے لئے اپنا سہارا پیش کر دیتا۔

''کاش کوئی ایک تو ہم میں سے ایسا ہوتا جو ان کی غنڈہ گردی کا اس طرح منہ توڑ جواب دینے کی ہمت کرتا۔ کاش کوئی ایک..... کوئی ایک اپنی ماں کا جنا تو ایسا ہوتا..... شاید انہیں پھر کبھی یہ ذلت کی زندگی جینے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔''

میر صاحب نے سرگوشی کے انداز میں اپنی بیٹیوں سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جان۔ افسوس یہاں کی ماؤں نے مرد کم اور زنخے زیادہ پیدا کئے افسوس..... ورنہ شاید ہمیں بھی اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر نہ بھاگنا پڑتا۔''

ان کی منجھلی بیٹی نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے زہریلے لہجے اور تیز الفاظ میں اُن سے بات کی تھی۔

''یہاں تماشہ لگا ہے کیا۔ کیا دیکھ رہے ہو تم لوگ بے غیرتو، کب تک اپنی بہو بیٹیوں کا چارہ ان وحشیوں کے سامنے پھینکتے رہو گے۔ کبھی سوچا ہے تم نے..... ہٹ جاؤ پرے ہٹ جاؤ۔''

بندوق بردار سفید پوش نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے ڈانٹا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا بس چلے تو انہیں کچا چبا جائے۔

میر صاحب اپنی بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹے بعد انٹیلی جنس کے ایک ''سیف ہاؤس'' میں پہنچ چکے تھے۔ اُن کی بیٹا لیاقت مقامی انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا اور آج کل گھر کے بجائے ہوسٹل میں رہتا تھا تاکہ یکسوئی سے اپنی پڑھائی جاری رکھ سکے۔

***

جاری ہے...

زمین کا کوڑھ

بندو خان کے ساتھ دس نئے ''مرغے'' جنہیں تنظیم کے مختلف دفاتر سے ''را'' نے منتخب کیا تھا ایک بڑی ویگن میں ساحل سمندر کی طرف جا رہے تھے۔
اس ویگن پر بظاہر سواریوں والی ویگن کا گمان گزرتا تھا اور وہ نمبر لگا تھا۔ جس نمبر کی ویگنیں اس روٹ پر سفر کیا کرتی تھیں۔ اس وقت رات کے قریباً گیارہ بج رہے تھے جب وہ لوگ پہلے سے مخصوص جگہ پر پہنچے اور وہاں اُتر گئے۔
ویگن ڈرائیور ویگن کو اطمینان سے آگے لے گیا۔
یہ چھوٹا سا ''بوٹ سٹیشن'' تھا جہاں سے جانے اور آنے والی لانچوں کو جو زیادہ تر ماہی گیروں کی ہوتی تھیں یا پھر نزدیکی جزیرے میں سامان برداری کا کام کرنے والی لانچیں۔ سرکاری طور پر چیکنگ کے بعد ہی کھلے سمندر میں جانے کی اجازت ملا کرتی تھی کیونکہ یہاں سے جانے والی بیشتر لانچیں ساحل سمندر پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود غیر ممالک تک ہی سفر کیا کرتی تھیں۔
یہاں لانچوں کو روانگی کی اجازت دینے کی ذمہ داری ملک اختر کے محکمے کو سونپی گئی تھی اور اس وقت بھی معمول کے مطابق کام جاری تھا۔ جب اچانک اُس کے ماتحتوں نے ملک اختر کو اپنے سر پر موجود پایا۔
ملک صاحب نے اس طرح اچانک چھاپہ مار کر شاید انہیں ''سرپرائز'' دیا تھا یا پھر اُن کی چیکنگ کی تھی۔
''کیا ہو رہا ہے چوہدری..... کیسا چل رہا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا!''
اپنے ماتحت عملے کے نگران افسر سے اُس نے افسروں کے لہجے میں پوچھا۔
''آل رائٹ سر! سب اوکے ہے سر۔''
انسپکٹر چوہدری نے دونوں پاؤں جوڑتے ہوئے ایڑیاں بجائیں۔
''ادھر لاؤ اوئے کاغذات۔ اِدھر لاؤ۔''
ملک اختر نے خود لانچوں کے اجازت نامے چیک کرنے شروع کر دیئے تھے۔
دو لانچوں کے اجازت نامے اُس نے چیک کر لئے تھے۔ جب بندو خان ہاتھ میں کاغذ پکڑے اُس کی طرف بڑھا۔
''یہ لیجئے سر!''

اُس نے کاغذات ملک اختر کی طرف بڑھائے۔

''سر کے بچے۔تمیز سے بولو،کون ہو تم ؟ کہاں جا رہے ہو؟''

اُس نے جان بوجھ کر کرخت لہجے میں اُس سے دریافت کیا.....!

''جناب ہم تو پسنی جا رہے ہیں۔غریب آدمی ہیں سرکار۔''

بندو خان ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔

''ٹھیک ہے خبردار کوئی ہیرا پھیری نہیں ہونی چاہئے۔''

ملک اختر نے کاغذات پر سرسری نظر ڈال کر اُسے واپس لوٹا دیئے اور دوسرے ہی لمحے بندو خان کی لانچ کھلے پانیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

ملک اختر نے اس طرح دو تین اور لانچوں کے کاغذات چیک کئے۔ایک لانچ کی اچانک تلاشی لی اور جس طرح آندھی اور طوفان کی طرح آیا تھا اُسی طرح واپس لوٹ گیا۔

''آج کل صاحب کچھ زیادہ ہی سختی دکھانے لگا ہے۔اللہ خیر کرے۔بندو تو ایسا نہیں لگتا۔میرا خیال ہے اوپر والوں کے آرڈر ہی بڑے سخت ہوں گے۔''

اُس کے جانے کے بعد ایک ماتحت نے تبصرہ کیا۔

بندو خان بڑے اطمینان سے کھلے پانیوں میں سفر کر رہا تھا۔جب اچانک سمندر پر پھیلے بے پایاں سکوت اور رات کے سحر کو سائرنوں کی تیز آواز نے توڑ ڈالا۔اس کے ساتھ ہی ان کے چاروں طرف پانیوں پر روشنیاں اُن کی طرف لپکنے لگیں۔اس سے پہلے کہ بندو خان کو کسی بات کی سمجھ آتی نیوی کی تیز رفتار بوٹس نے انہیں گھیر لیا۔اُس کے ساتھی تازہ قابو آئے ہوئے مرغے تھے انہیں اس صورتِ حال نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔لانچ میں اسلحہ بھی موجود نہیں تھا،اگر ہوتا بھی تو انہیں اس کی مہلت ہی کب ملتی کہ اس تک رسائی حاصل کرتے۔

برق رفتار بحری کمانڈو،بحری عقابوں کی طرح اُن پر جھپٹے اور انہیں بے بس گیدڑوں کی طرح جکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نیوی کے ایک مرکز پر زیرِ حراست تھے۔

●

عمرانہ نے آج پروین سے بڑی عجیب سی فرمائش کر دی تھی۔

''چلو تمہارے ملک صاحب کی طرف چلتے ہیں۔''

رات دیر گئے جب وہ دونوں ایک مقامی ہوٹل میں ''کیبرے'' دیکھ کر واپس لوٹ رہی تھیں تو عمرانہ نے اُسے کہا۔

''لیکن.....''

''چھوڑو لیکن کو، بھئی ملک صاحب کو سرپرائز دیں گے خوش ہو جائیں گے یوں بھی انہوں نے کل ہی تو کہا تھا کہ میں کب آ رہی ہوں۔''

عمرانہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''انہیں فون تو کر دیں کہ ہم آ رہے ہیں۔''

پروین نے کہنا چاہا۔

''پھر سرپرائز کہاں رہ جائے گا پروین چھوڑو یار تم کس چکر میں پڑ گئی ہو۔ بھئی کیوں کروں گی فون۔ اگر وہ گھر نہ ہوئے تو واپس آ جائیں گے۔''

اُس نے فوراً پروین کی بات کاٹ دی۔

مینا کشی نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ تو خود یہی چاہتی تھی کہ کس طرح وہ لوگ عمرانہ کو بلیک میل ہونے کی پوزیشن میں لے آئیں۔

لیکن.....!

ابھی تک انہیں اس مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ پروین نے اپنی چند روزہ دوستی میں عمرانہ کو ابھی تک شراب نوشی کی دعوت نہیں دی تھی حالانکہ اُسے زیر دام لانے کے لئے یہ بہت ضروری تھا۔

''بُرا مت ماننا پروین بیگم، تم تو مجھے اللہ میاں کی گائے دکھائی دے رہی ہو۔ بھئی اتنے دن ہماری دوستی کو ہو گئے اور ہم نے ابھی تک اس دوستی کو ''سیلی بریٹ'' ہی نہیں کیا مجھے تو یہ اُمید تھی کہ کم از کم تم آج ضرور مجھے دعوت دو گی، لیکن کمال ہے بھئی آج ویک اینڈ بھی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تمہارے ملک صاحب کے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ مے نوشی کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اصل میں پروین برا مت ماننا میں کبھی کبھی پیتی ہوں لیکن بے تحاشہ، اور میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ کوئی مجھے اُس وقت سنبھالنے والا نہ ہو تو میرے آؤٹ ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔''

اس نے اپنی بات کے خاتمے پر خود ہی قہقہہ بلند کیا تھا۔

مینا کشی کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اُس نے جو کام اگلے دس پندرہ روز میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کرنا تھا وہ عمرانہ نے آج دس پندرہ منٹ ہی میں کر دیا تھا۔ اُسے تو اندھے کی طرح اچانک دو آنکھیں نصیب ہو گئی تھیں۔

''ارے واہ عمرانہ..... کمال کر دیا بھئی۔ بڑی چھپی رُستم نکلی ہو۔ میں تو تمہیں کہتے ہوئے بھی ڈرتی تھی کہیں ناراض ہی نہ ہو جاؤ۔''

پروین اب کھل گئی تھی۔

''میرے خیال سے ہمیں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔''

عمرانہ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں، چلئے حضور۔ ابھی چلتے ہیں۔''

یہ کہہ کر پروین ہوٹل کے اس کاؤنٹر کی طرف بڑھی جہاں سے پرائیویٹ کاریں کرایہ پر ملتی تھیں۔ جب دونوں کاؤنٹر کی طرف جارہی تھیں تو عمرانہ نے اپنے کندھے سے لٹکتا پرس پروین کو بے تکلفی سے تھماتے ہوئے باتھ روم تک جانے کی اجازت مانگی تھی۔

کاؤنٹر سے دوسری طرف موجود باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اُس نے صرف ایک مرتبہ نظر اُٹھا کر اُس نوجوان کی طرف دیکھا تھا جو ہوٹل کے بکنگ کاؤنٹر کے نزدیک کھڑا شاید کسی کا منتظر تھا۔

عمرانہ کو اُس طرف جاتے دیکھ کر وہ بھی اس سمت جانے والے دوسرے راستے کی طرف گھوم گیا۔ دونوں کا ٹکراؤ راستے میں ہوا اور عمرانہ نے اپنی اگلی منزل کی نشاندہی کردی۔

''ویل ڈن۔''

نوجوان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ تیزی سے فون بکس کی طرف گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹیلی فون پر کسی کو عمرانہ کی اگلی منزل سے باخبر کررہا تھا۔

میناکشی کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہ ہوسکی کہ یہ نوجوان آج دوپہر ہی سے جب وہ ''گیسٹ ہاؤس'' سے باہر نکلی تھیں اُن سے چپک گیا تھا۔ وہی نہیں اس جیسے تین اور بھی اُن کے اردگرد کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار موجود تھے۔

یہ اُن کی بڑی کامیابی تھی کہ عمران، میناکشی کو ملک اختر کے گھر لے جارہی تھی۔ دونوں کا اکٹھے گرفتار ہونا جہاں لیڈی انٹیلی جنس انسپکٹر عمرانہ چوہدری کے لئے بڑا کارنامہ تھا وہاں ملزموں کے خلاف کیس بھی مضبوط ہوجاتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک کرائے کی کار میں ملک اختر کے ساحل سمندر والے اپارٹمنٹ کی طرف جارہے تھے۔

عمرانہ نے اپنی ملازمت کا یہ سب سے شاندار مشن کیا تھا گو اس سے پہلے بھی وہ کئی ''ایڈونچر'' کرچکی تھی۔

لیکن.....!

آج وہ جو کارنامہ انجام دینے جارہی تھی اُس پر نجانے اب تک دل ہی دل میں اُس نے خود کو کتنی مرتبہ شاباش دی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ جب افسرِ اعلیٰ صاحب کے سامنے وہ پیش ہوئی تھی تو انہوں نے اُسے صاف صاف بتایا تھا کہ یہ کھیل بہت خطرناک بھی ہوسکتا ہے اور وہ اپنے محکمے کی ایک ہونہار آفیسر کو اس طرح ضائع نہیں کرسکتے۔

جس پر اُس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ وہ ملک دشمنوں کے قلع قمع کے لئے اپنی جان دے دینا بھی سعادت سمجھتی ہے۔
وہ انٹیلی جنس میں جانے کتنے سخت مراحل عبور کرنے کے بعد داخل ہوئی تھی۔ ریٹائرڈ پولیس افسر کی بیٹی ہونے کے ناطے اُسے بچپن ہی سے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن بغیر وردی والی پولیس سے۔ اُس کے والد صاحب نے کبھی اپنی بیٹی کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی اور ہمیشہ اُس کے راہنما بنے رہے۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب عمرانہ کو پولیس میں ملازمت ملی اور یہاں سے بالآخر اُس کی شدید خواہش کے پیش نظر اُسے انٹیلی جنس میں بطور سپیشل کیس بھیج دیا گیا۔
یہاں خالصتاً مردانہ ماحول تھا اور وہ بالآخر ایک لڑکی تھی۔
لیکن.....!
جلد ہی اُس کے ساتھیوں کو معلوم ہو گیا کہ قدرت نے اُسے مردانگی کے اُس جوہر سے نوازا ہے جو کسی مرد کو بھی کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ اُس نے انٹیلی جنس کے کئی کورس کامیابی سے پاس کئے اور جلد ہی اُسے ''ڈیسک'' سے اُٹھا کر میدان عمل میں اتار دیا گیا۔
عمرانہ چوہدری نے اب تک کئی سوانگ رچائے تھے عموماً وہ ڈرگ کے سمگلروں سے دولت کی پجارن کی حیثیت سے اپنا تعارف کرواتی اور اُن کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیتی تھی۔ اس مہم کے لئے اُس کا انتخاب شیر گل کی تجویز پر افسر اعلیٰ صاحب نے کیا تھا۔ پہلے تو وہ اتنے حساس کیس میں کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔
لیکن.....!
شیر گل کو تین چار کیسوں میں عمرانہ چوہدری کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور وہ اس کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اُس نے بڑے اعتماد سے عمرانہ چوہدری کو مینا کشی سے چپکا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔
آج عمرانہ چوہدری بھارتی جاسوسہ مینا کشی اور پاکستانی غدار ملک اختر کو اکٹھے گرفتار کروانے جا رہی تھی
تو اس کا دل احساس تشکر کے جذبات سے لبریز تھا کہ وہ اپنے بہی خواہوں کی توقعات پر پوری اُتری ہے۔

●

ملک اختر نشہ کامیابی سے سرشار کار چلاتا ہوا اپنے ساحلی اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا۔
آج وہ جان بوجھ کر اپنے نئے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے کر گیا تھا۔ جب ڈرائیور نے اُسے اکیلے جاتے دیکھا تو گاڑی کا دروازہ اس اُمید پر کھولا تھا کہ اُس کا صاحب اُسے ہی کار چلانے کا حکم دے گا۔
لیکن.....!

اس کے برعکس ملک اختر نے اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

''تم آرام کرو..... میں بڑے اہم کام سے جا رہا ہوں۔ بلکہ تم آف کر لو کل صبح آفس میں آ جانا..... ٹھیک ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اُس نے سو روپے کا نوٹ اپنے بٹوے سے نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ بے چارہ ڈرائیور سوائے اپنے افسر کا شکریہ ادا کرنے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

اپنا کام اُس نے کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ اس میدان کا منجھا ہوا کھلاڑی شمار ہونے لگا تھا۔ پہلے پہل اس کو تنظیم کی طرف سے جو بھی عوضانہ موصول ہوتا وہ شکریہ کہہ کر رکھ لیتا لیکن اب اُس نے رقم گننا شروع کر دی تھی اور وہ کام کی نوعیت کو جاننے لگا تھا۔

آج بھی جب اُس نے دس تخریب کاروں کو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کروانے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا تو وہی اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس نے تنظیم کے لئے کتنا اہم کام کیا ہے اور اس غداری کی کم از کم قیمت کیا ہونی چاہئے۔

ملک اختر کو آج شدت سے پروین کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

لیکن.....!

پروین ہی کیوں..... عمرانہ کیوں نہیں؟ جس نے اگلے ہی روز اُس سے ملاقات کی تھی اور جس کے جسم کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے کے بعد اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں اس کی جنسی بے راہروی کے لئے عمرانہ سے بہترین ساتھی اُسے میسر نہیں آ سکتا۔

گھر پہنچنے پر اُس نے پروین کو دو تین مرتبہ فون کیا تھا لیکن دوسری طرف سے یہی اطلاع ملتی تھی کہ ابھی تک وہ گیسٹ ہوم نہیں پہنچی۔

اُس کے بعد اُس نے نام بدل کر عمرانہ کے لئے فون کیا تو اُسے علم ہوا کہ وہ اپنی دوست پروین کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔ ملک اختر تلملا کر رہ گیا۔ اب وہ تنظیم کے مالِ حرام پر سب سے پہلا حق اپنا سمجھنے لگا تھا۔ اُس کے گندے ذہن نے اُسے یہی راہ سجھائی کہ ضرور دونوں کسی نئے شکار پر نکلی ہیں۔

لیکن.....!

زندگی میں اُسے کبھی اتنا شاندار سرپرائز بھی ملے گا؟

یہ تو اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

جب اُس کے چوکیدار نے انٹر کام پر اُسے پروین اور ایک نامعلوم لڑکی کی آمد کی خبر دی تو اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اپنے سرہانے دھری شراب کے پیگ کا آخری گھونٹ اُس نے تیزی سے حلق میں انڈیلا اور اس کی جنسی زندگی دو چند ہو گئی۔

اُس نے ننگے پاؤں سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر دونوں کا استقبال کیا تھا اور عالم مدہوشی میں اُس کے منہ سے اُن کی تعریف میں کئی جملے بے ساختہ نکل گئے تھے۔

''مسٹر ملک..... میں نے کہا تھا ناں کہ بہت جلد آپ سے ملنے آؤں گی..... سو میں آ گئی، میں نے سوچا کہ آپ کو انتظار کی زحمت میں کیوں ڈالا جائے۔

عمرانہ نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''چشم ما روشن دل ما شاد..... بندہ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہے۔''

ملک اختر نے اُس کے سامنے نشے میں درباریوں کی طرح جھک کر کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ ایک ہی ملاقات میں ہمیں مکھن سے بال کی طرح نکال دیا۔''

پروین نے ملک صاحب کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''تم تو میری.....''

یہ کہتے ہوئے ملک نے ایک بیہودہ سی حرکت کر دی جس پر بادلِ نخواستہ عمرانہ کو مسکرانا پڑا۔

تینوں ملک اختر کے پر تکلف اور پر تعیش ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جہاں ملک اختر اُن کے لئے اپنے فریج سے بیئر کی بوتلیں نکال کر رکھ رہا تھا۔

''بڑا خوبصورت گھر ہے آپ کا..... ساحل سمندر کا نظارہ کتنا حسین لگتا ہوگا یہاں سے۔''

عمرانہ نے یہ کہتے ہوئے اُس کے کمرے کی سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ قریباً ایک منٹ وہاں کھڑے ہو کر سمندر کی طرف ہاتھ کے اشارے سے تعریف کرتی رہی۔

ڈیس ایس پی شیر گل خان کی کمان میں کمانڈو ملک اختر کے اپارٹمنٹ کے چاروں طرف مستعد تھے اور وہ آنکھوں سے رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین لگائے اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

''گو''..... اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ''واکی ٹاکی'' پر صرف ایک لفظ دہرایا۔

زمین پر چیتے کی طرح قدموں کی آواز نکالے بغیر برق رفتاری سے قلانچیں بھرتے شیر گل خان کی کمان میں خصوصی کمانڈوز نے چند منٹ میں ملک اختر کے چوکیدار اور بیرے کو قابو کر لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کو ٹھوکر سے کھولتا ہوا اندر گھس آیا۔ اُس کے تعاقب میں تین مسلح کمانڈوز نے ملک اختر کی طرف اپنی گنیں سیدھی کر لیں۔

''مسٹر ملک اختر اور مس مینا کشی ششادری میں تم دونوں کو تخریب کاری، غداری اور سرکاری راز چوری کرنے کے جُرم میں گرفتار کرتا ہوں۔''

ڈیس ایس پی شیر گل خان کی آواز میں رعد کڑک رہی تھی۔

''تمہیں کس نے اجازت دی۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ تم.....''

ملک اختر کے منہ سے مغلظات کا طوفان برآمد ہوا۔

لیکن.....!

عمرانہ چوہدری نے اُس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا تھا کہ اس کا نشہ اگلے ہی لمحے ہرن ہو گیا۔

''تم بھی.....''

ملک اختر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں میں بھی.....''

عمرانہ اس کی طرف قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔

●

گرفتاری کے فوراً بعد اُن دونوں کو الگ کر لیا گیا تھا۔

مینا کشی کو عمرانہ چوہدری کی نگرانی میں مستعد کمانڈوز کے ساتھ بھیجا گیا تھا جبکہ ملک اختر کو دوسری ٹیم اپنے ساتھ لے کر گئی تھی۔

ملک اختر کا نشہ تو اُسی وقت ہرن ہو گیا تھا جب اُس نے اپنے گھر میں کمانڈوز کو دیکھا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ اپنے جرائم کا حساب دینے جا رہا تھا تو آنے والے لمحات کے تصور نے اُسے ابھی سے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ''افسرِ اعلیٰ'' جس ایجنسی کی نمائندگی کرتے تھے اُن سے سستے میں جان نہیں چھوٹ سکتی تھی۔

ملک اختر نے آج تک یہی سمجھا تھا کہ جس طرح اُس نے حرام کی دولت جمع کی ہے اسی طرح وہ کسی اور کو بھی حرام کھلا کر راہِ راست پر لے آئے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے گرفتاری کے لئے آنے والوں کو اتنی بڑی رقم کی پیش کش کی تھی جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔

کسی طرح اگر ایک مرتبہ وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ساری زندگی عیش و آرام سے بسر کر سکتا تھا۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں وہ اپنی نئی شناخت کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

لیکن.....!

ملک اختر کو صدمے کے ساتھ ساتھ حیرت کا بھی دھچکا لگا کہ اس کی پیش کش کا جواب گالیوں کی صورت میں موصول ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے بیس لاکھ روپے کی آفر کی ہے.....اور تم نے کرنا بھی کیا ہے۔''

اس نے ڈی ایس پی شیر گل خان سے کہا۔

''تم بیس کروڑ کی آفر بھی کرو تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی دھرتی ماں کو بیچ کھانے والے بے غیرت انسان تیری دولت تیرے کسی کام نہیں آئے گی۔''

شیر گل خان نے اُسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بے وقوف ہو۔ میں یہ رقم وکیلوں اور عدلیہ پر خرچ کر کے انصاف بھی خرید سکتا ہوں۔''

ملک اختر نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''تم نے جو خرید و فروخت کرنی تھی کر لی۔ اب ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑتے رہو گے۔ تم جیسے غدار کے لئے تو موت بھی کم سزا ہو گی۔''

شیر گل خان کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اونہہ..... بے وقوف تمہاری حیثیت ہی کیا ہے..... ایک معمولی سے آفیسر۔ کتنی سزا دلوا دو گے مجھے۔ میں اپنے تمام جرائم کا اقبال کر بھی لوں تو بھی کیا ہو جائے گا..... پانچ سال، دس سال پھر اس کے بعد کیا مجھے مار ڈالو گے..... میں ساری زندگی عیش کروں گا اور تم..... تم اسی طرح، اسی طرح بے وقوفوں کی طرح اپنے افسروں کے احکامات کی تعمیل میں جوتیاں چٹخاتے رہو گے اور کسی روز کسی غنڈے بدمعاش کی گولی کا نشانہ بن جاؤ گے۔''

ملک اختر کی بات پر ان کا خون کھول اُٹھا۔

''شٹ اَپ۔''

اس نے اس زور سے چیخ کر کہا تھا کہ ملک اختر ہی نہیں گارد کے باقی جوان بھی سہم کر رہ گئے۔

''دیکھو مسٹر ملک..... اب اپنی زبان بند رکھنا ورنہ تم جانتے ہو کہ ہم زبان بند کروانے کے کتنے گُر جانتے ہیں۔''

شیر گل کے ساتھی نے کہا۔

ملک اختر نے اسی طرح ''اونہہ'' کہہ کر منہ دوسری طرف پھیرا تھا جیسے ناک سے مکھی اُڑا رہا ہو۔ اُسے گرفتاری کے وقت کوئی خوف تھا تو اب دور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جن کی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے وہ اس انجام تک پہنچا ہے وہ اسے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے اور حکومت کو ہر طرح پریشرائز کرنے کی کوشش کریں گے۔

رات آدھی ڈھل رہی تھی جب ملک اختر کو ایجنسی کے ایک سیف ہاؤس میں پہنچا دیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بارے میں کوئی باقاعدہ خبر جاری نہیں ہوئی تھی۔

لیکن.....!

اس کی گرفتاری سے اُس کے مالکان آگاہ ہو چکے تھے۔

بندو بھائی اور اس کے ساتھیوں کا اچانک سمندر سے غائب ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ تنظیم کو اس رات علم ہو گیا تھا کہ بندو خان کا گروپ جسے ''را'' کے تربیتی کیمپ تک پہنچنا تھا راستے ہی سے ''افسرِ اعلیٰ'' نے اغواء کروا کر اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔

وہ لوگ جانتے تھے کہ جس طرح انہوں نے ''را'' کی مدد سے ملک اختر کو جکڑا ہوا ہے اس کے بعد ملک اختر سے یہ اُمید کرنا کہ وہ ڈبل کراس کرے گا یا انہیں دھوکہ دے گا غلط ہوتا کیونکہ ملک اختر کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُن کے لئے افسرِ اعلیٰ کے خلاف اس بھرے پُرے شہر میں لے دے کے ایک یہ ملک اختر ہی تھا جس کے ذریعے تنظیم اپنا گھناؤنا کھیل جاری رکھے ہوئے تھی۔ اب ملک اختر کی گرفتاری کا مطلب یہ تھا کہ ان کے باقی غدار حمایتیوں کے حوصلے بھی پست ہو جاتے۔

اختر ملک کی گرفتاری تنظیم کے لئے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

بابا صاحب کو علی الصبح گہری نیند سے جگا کر اس حادثہ جانکاہ سے آگاہ کیا گیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو..... ارے وہ کوئی معمولی انسپکٹر ہے کہ جس کو باندھ کر لے گئے..... اتنا بڑا آفیسر ہے قانونا بھی اس کی گرفتاری بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے..... تم نے بھنگ تو نہیں پی رکھی۔''

بابا صاحب نے فون کرنے والے پر غصہ جھاڑنا چاہا۔

''بابا صاحب! بدقسمتی سے یہ حادثہ ہو گیا ہے اور ہماری توقعات کے برعکس افسرِ اعلیٰ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھا لیا ہے..... بندو بھائی کے ساتھیوں، ملک صاحب اور مینا کشی کسی کا پتہ نہیں چل رہا کہ یہ لوگ انہیں کہاں لے گئے ہیں لیکن ان کی گرفتاری کی خبر صد فیصد سچی ہے۔''

فون کرنے والے نے کہا۔

''ہونہہ..... تو اب کچھ کرنا ہی ہو گا۔ آج ہی ان سب کے دماغ ٹھیک کرتا ہوں۔ آج میں دیکھتا ہوں اُن کو..... ارے ان کی یہ مجال۔ میں شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا۔ سارے شہر کو جلا کر خاک کر دوں گا۔ کسی کی ہمت ہے کہ میری بات ماننے سے انکار کرے۔''

بابا صاحب عالمِ وحشت میں بکواس کرتے رہے بالآخر انہوں نے اپنا فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

اس کے منہ سے ابھی تک مغلظات کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔

اس کی دیوانہ وار گالیوں کی آواز پر ملحقہ کمرے میں خواب سرگوشی کے مزے لوٹتے اُس کے خصوصی دستے کے رضا کار بھاگتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔

''تیاری کرو..... تیاری کرو..... ان سالوں کا دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ دیکھ لوں گا، ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

وہ عالمِ وحشت میں گالیاں بک رہا تھا اور محافظوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بابا صاحب پر پاگل پن کا یہ دورہ کس طرح پڑا ہے۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو..... رخسانہ کو بلاؤ..... فوراً بلاؤ۔''

اس نے اچانک ہی اپنے سیکرٹری کو حکم دیا اور انہیں گالیاں دیتے ہوئے کمرے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

یوں تو بابا صاحب پر ایسی کیفیت اکثر طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن اس نوعیت کا حملہ آج پہلی بار ہوا تھا وہ بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا۔

اپنے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے اس کا شیطانی ذہن بار بار ایک ہی تکرار کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ حکومت کو اتنا مجبور کر دے کہ وہ بابا صاحب کی ناجائز خواہشات کے احترام میں اُسے من مانی کرتے ہوئے مادرِ وطن کی عزت سے کھیلنے کی چھٹی دے دے۔

اور.....!

اس کا ایک ہی جواب اُس کے ابلیسی دماغ نے دیا تھا۔

ہنگامہ آرائی، لوٹ مار، آگ، بلوہ، جلوس، توڑ پھوڑ۔

اُس نے یہ سب کچھ کرنا تھا..... یہ سب کچھ ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اب سے پہلے بھی ایسے ہی گھٹیا اور بھیانک حربوں سے اُس نے حکومت کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُس کے ہاتھ بڑا سستا نسخہ لگ گیا تھا۔

وہ جب دیکھتا کہ حکومت کے ایماندار اور وطن دوست سرکاری ملازمین اس کی تنظیم کی غیر قانونی مجرمانہ حرکات کا نوٹس لینے لگے ہیں تو فوراً ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔

اُس نے حکومت وقت کو مجبور کر دیا تھا کہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے کھل کھیلنے کی اجازت دیتی رہے اور کوئی اس پر گرفت نہ کرے۔

یہ وہ کم از کم قیمت تھی اور جو حکومت ادا کر رہی تھی۔

امن و امان کی بحالی کے نام پر ملکی سالمیت کو ان وحشیوں کے آگے گروی رکھ کر عاقبت نااندیش حکمران یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح وہ اپنے اقتدار کو دوام بخش رہے ہیں۔

رخسانہ کو بابا صاحب کی ناسازی طبع کا حوالہ دے کر یہاں فوراً پہنچنے کی تلقین کی گئی تھی۔ تب اس نے یہی سمجھا تھا کہ بابا صاحب نے ضرور آج رات ڈاکٹر کی ہدایات کی حسب معمول خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ زیادہ چڑھا لی ہوگی یا پھر اپنے گردوں کی..... تکلیف کی پرواہ کئے بغیر حرام کاری میں جُت گئے ہوں گے۔

ابھی اُسے صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک نہیں تھا۔

اس نے ٹیلی فون پر ہی فوراً بابا صاحب کے خصوصی معالج کو وہاں پہنچنے کا حکم دیا تھا اور اب مسلح گارڈ کی حفاظت میں بابا صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

ڈاکٹر اس کی آمد سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ جس کے ساتھ ہی بابا صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''اسے کیوں بلا لیا؟''

ڈاکٹر کی شکل پر نظر پڑتے ہی بابا صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''میں نے بلایا ہے بابا صاحب۔''

خدا جانے رخسانہ کے لہجے میں کیا چھپا تھا کہ بابا صاحب دوسرے ہی لمحے نارمل ہو گیا۔

ڈاکٹروں نے رخسانہ کی ہدایت پر اس کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا اور اسے مطمئن رکھنے کے لئے ایک ٹیکہ لگا کر چلا گیا۔ اس ٹیکے نے بابا صاحب کو قدرے پرسکون کر دیا تھا۔ بابا صاحب نے جب رخسانہ کو گزری رات ٹوٹنے والی قیامتوں کا احوال سنایا تو پہلی مرتبہ وہ بھی ضرورت سے زیادہ ہی پریشان ہو گئی۔

''بابا صاحب اب واقعی وقت آ گیا ہے کہ آپ سنجیدگی سے اس حرکت کا نوٹس لیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کم بخت افسرِ اعلیٰ کے پیچھے کوئی بڑا مضبوط ہاتھ ہے، ورنہ اس طرح وہ.....''

''ارے کون سا ہاتھ میرے ہاتھ سے زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے۔ سالے کا دماغ آج ہی درست کرتا ہوں۔ بلاؤ ذرا چیف منسٹر کو اُس سے کھل کر بات ہو جانی چاہئے۔''

بابا صاحب نے رخسانہ کی بات کو غصے اور نخوت سے کاٹتے ہوئے کہا۔

رخسانہ نے بابا صاحب کے سامنے ہی فون پر چیف منسٹر ہاؤس سے رابطہ کیا اور چیف منسٹر صاحب کو آج ہی بابا صاحب کی طرف سے فوراً ملاقات کا پیغام دے دیا۔

چیف منسٹر نے پیغام بڑے دھڑکتے دل کے ساتھ موصول کیا تھا اور بابا صاحب کی طرف روانگی سے پہلے اپنے ''بڑوں'' سے اچھی طرح بریفنگ بھی لے لی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے طور پر بابا صاحب سے کوئی وعدہ کر سکیں۔ کیونکہ اب اس کھیل میں تیسرا کھلاڑی بھی شامل ہو گیا تھا۔

یہ تیسرا کھلاڑی بادلِ نخواستہ اس وقت میدان میں اُترا تھا جب سیاسی بازی گروں نے ملکی نظم و نسق کو تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورتِ حال اتنی گھمبیر ہو گئی تھی کہ لوگوں کا اعتماد ملکی سلامتی سے متعلق متزلزل ہونے لگا تھا۔

اب سیاسی بندر کچھ چوکنے ہو گئے تھے۔

انہوں نے اپنی حرام کاریاں بند تو نہیں کی تھیں البتہ محتاط ضرور ہو گئے تھے اور کچھ کرنے سے پہلے دائیں بائیں نظر دوڑا لیا کرتے تھے۔

چیف منسٹر صاحب اگلے ایک گھنٹے کے بعد بابا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے جو بیماری کا بہانہ کر کے صاحب فراش تھے اور انہوں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی چیف منسٹر صاحب سے ہاتھ ملایا تھا۔

''خیریت بابا صاحب!''

چیف منسٹر صاحب کو انٹیلی جنس کی طرف سے رپورٹ مل چکی تھی کہ بابا صاحب کے کہیں کوئی گولی نہیں لگی اور اس نے گولی لگنے کا محض ڈرامہ رچایا ہوا ہے۔

''خیریت کیا خاک ہوگی۔ بہت مشکل ہوگیا ہے۔ میرے لئے کارکنوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہمارے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں محض ایک شخص کے اشارے پر..... اور یہ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ کس جرم کی سزا؟ کیا ہم اس لئے معتوب ہیں کہ حکومت کی حمایت کرتے ہیں۔ ذرا سوچئے چیف منسٹر صاحب سوچئے اگر میں نے کارکنوں کو قابو نہ کیا تو کیا بنے گا..... اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے وہ لوگ..... اور پھر یہ آپ کی چیف منسٹری کہاں جائے گی؟ آپ کو علم ہے کن کے سر پر حکومت چلا رہے ہیں..... کچھ علم ہے آپ کو۔''

بابا صاحب بکتے بکتے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''بابا صاحب آپ کچھ بتایئے بھی۔''

چیف منسٹر پر آخری بات نے گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔

''اچھا..... اب بتاؤں گا بھی میں ہی..... گویا آپ کو کسی بات کی خبر نہیں۔ آپ کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ اس افسرِ اعلیٰ کے بچے نے گھروں سے ہمارے دس کارکن اغواء کر لئے اب ان پر تشدد کر کے ان سے اپنی مرضی کے بیانات حاصل کریں گے۔ پھر مجھے غدار بنا دیں گے..... ارے میں کہتا ہوں بھئی اگر میں غدار ہوں تو کیا لینے آئے ہو میرے پاس۔ مجھے چوراہے میں پھانسی کیوں نہیں لگا دیتے۔ ہاں..... ارے کیا گناہ کیا تھا اس نے..... وہ کیا نام ہے اس کا ملک اختر نے۔ صرف یہی کہ افسرِ اعلیٰ کے برعکس ہمارے ساتھ انسانی برتاؤ کیا اور کسی کے پریشر کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ ہم پر غداری کے مقدمے بنا دیتا تو اُن کا محبوب بن جاتا..... اگر کوئی قانون کے مطابق ہمارے ساتھ کچھ نرم برتاؤ کرے تو غدار..... ارے اسے بھی پکڑ لیا..... اسے بھی پکڑ کر لے گئے۔ اب کوئی بڑی سازش بنے گی..... اب یہ لوگ اُس کے ڈانڈے ملائیں گے بھارت سے اور ہمیں غدار بنا دیں گے جن کے آباؤ اجداد کی قربانیوں کے صدقے یہ ملک بنا تھا اور سزا دو اُن کی اولادوں کو..... ان کے ساتھ اتنے ظلم کرو کہ یہ لوگ پاکستان کے غدار بننے پر مجبور ہو جائیں۔''

بابا صاحب کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

چیف منسٹر صاحب کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔

چیف منسٹر صاحب بھی کوئی معمولی شاطر نہیں تھے۔ انہوں نے بھی اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ سیاست کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ اب تک چار پارٹیاں تبدیل کر چکے تھے۔ یہ تو سیاسی کرائسس تھا جس کے صدقے وہ اس عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ ورنہ انہیں زندگی میں شاید ایم پی اے کی سیٹ سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوتا۔

یہاں اُن کا سارا سیاسی دھندہ بابا صاحب کی مہربانیوں کا مرہون منّت تھا۔

بابا صاحب کی ہر ناجائز خواہش پوری کرتے رہنا ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی مشن تھا۔ اُن کی سیاسی دکانداری اگر چل رہی تھی تو بابا صاحب کے طفیل۔

اُنہیں بابا صاحب کو بہر صورت خوش رکھنا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

لیکن.....!

ایک خطرناک بات یہ تھی کہ بابا صاحب کے ساتھیوں کے خلاف اس مرتبہ جو کارروائی ہوئی تھی وہ انہیں اندھیرے میں رکھ کر کی گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ کارروائی کرنے والوں کو ان پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

اور یہ بے اعتمادی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔

چیف منسٹر صاحب کو اپنا سنگھاسن بھی ڈانواں ڈول ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔

اب تو بابا صاحب کو خوش رکھنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

''بابا صاحب آپ بے فکر ہو جایئے۔ میں مرکز والوں کو کیا سمجھتا ہوں۔ ہم نے اپنی سیاست اسی صوبے اور شہر میں کرنی ہے۔ ہمیں مرکز سے کیا لینا دینا آپ جو حکم دیجئے اس کی تعمیل ہو گی۔''

اس نے کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اوقات جتلائی۔

''ٹھیک ہے..... میری طرف سے اپنے بڑوں کو صاف صاف کہہ دو اگر کل صبح تک ملک اختر اور بندو خان سمیت تمام لوگوں کو رہا نہ کیا تو نتائج کی ذمہ داری اُن پر ہو گی۔''

بابا صاحب نے پھنکارتے ہوئے زہر فشانی کی۔

''بابا صاحب وہ لوگ آج رات تک رہا ہو جائیں گے۔ مطمئن رہئے۔''

چیف منسٹر نے بے شرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس دیکھ لو..... تمہاری چیف منسٹری بھی اس وقت تک مضبوط رہے گی جب تک ہمارے ساتھی آزاد ہیں گے۔ ورنہ پھر وہی.....''

بابا صاحب نے بات نامکمل چھوڑ کر اس کی طرف مسکراہٹ اُچھال دی۔

تھوڑی دیر بعد چیف منسٹر صاحب منہ لٹکائے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آفس میں پہنچتے ہی اعلیٰ قیادت سے رابطہ کر کے پہلے تو اس بات کا گلہ کیا کہ انہیں اعتماد میں لئے بغیر اتنی بڑی کارروائی کیوں کی ہے؟ اس کے بعد بابا صاحب کی وارننگ بڑھا چڑھا کر انہیں پہنچا دی۔

دوسری طرف سے جو جواب انہیں ملا تھا اس کے بعد تو چیف منسٹر صاحب کی ٹیلی فون ہاتھ میں پکڑے رکھنے کی طاقت بھی جواب دے گئی تھی۔ انہوں نے بمشکل خدا حافظ کہہ کر کپکپاتے ہاتھوں سے فون کریڈل پر رکھ دیا اور آرام دہ صوفے پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

بات ہی ایسی تھی جس نے اُن کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

انہیں مرکز نے بتایا تھا کہ یہ معاملہ ملکی سلامتی کے لئے فوج کو سونپ دیا گیا ہے اور فوج نے اس شرط کے ساتھ اس معاملے میں ہاتھ ڈالا ہے کہ اُن کے کام میں غیر ضروری مداخلت نہ کی جائے۔

''بابا صاحب کو کس طرح مطمئن کیا جائے؟''

جب انہوں نے مرکز والوں سے پوچھا تو دوسری طرف سے بڑی سرد مہری سے کہا گیا تھا۔

''یہ آپ کا دردِ سر ہے۔''

چیف منسٹر صاحب جانتے تھے کہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں اُن کی چھٹی بھی ہو جائے گی، دوسری طرف مرکز نے بھی معذوری ظاہر کر دی۔

لیکن.....!

انہیں بابا صاحب کو کنٹرول میں رکھنا تھا بھلے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی چیف منسٹری بابا صاحب ہی کے دم قدم سے ہے۔

***

اغواء

ملزموں کو ٹھکانے تک پہنچانے کے بعد شیر گل خان قدرے مطمئن ہو کر گھر پہنچا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی فقرے کی تکرار ہو رہی تھی جو ملک اختر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال قید کی سزا دلا دیں گے لیکن اس سے اسے کیا فرق پڑے گا۔ اس کے پاس جتنی دولت ہے اُس کے لئے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔

کتنا زہریلا طنز کیا تھا اس نے۔

شیر گل خان نے سوچا واقعی اسے دس بارہ سال کی قید کی سزا ملے گی۔ جو قانون ہی چھ سات سال کی ہوتی ہے اور اس میں سے بھی دو تین سال کی رعایت ملک اختر حاصل کر لے گا۔ تین چار سال بعد وہ جیل سے باہر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوگا اور ڈی ایس پی شیر گل خان انہی سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا گھوم رہا ہوگا۔

ان لوگوں نے تو قانون کو کھلونا بنا کر رکھ دیا تھا۔

کتنا بے بس تھا وہ بھی۔

کاش اس نے گرفتار کرتے وقت ہی ملک اختر کو گولی مار دی ہوتی تو اُس کی کم از کم سزا یہی تھی۔ اگر ملک سے غداری کی قیمت یہی ادا کرنی پڑتی ہے تو ملک اختر جیسے لوگ روزانہ جنم لیتے رہیں گے۔

صبح ڈھلنے تک اس پر یاسیت طاری رہی۔

صبح ڈھل رہی تھی جب اُسے نیند نے آلیا اور دوپہر تک وہ گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اس کا تحت الشعور شیر گل خان کو اُن وادیوں میں لے گیا جہاں کے شگوفوں سے محبت پھوٹتی تھی اور جہاں درختوں اور پودوں پر خوشیاں اُگتی تھیں۔ اس سفر میں اُسے عارفہ کا ساتھ میسر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بادلوں کی سڑک پر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ آسمان نے اپنی بلندیوں کے سارے اسرار اُن پر منکشف کر دیئے تھے۔ زندگی کا سارا حسن قدرت نے اُن کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور دونوں کی رفاقت نے ان لمحات کو اَمر کر دیا تھا۔

اسی روز خواب میں اُس نے اپنی ساری خواہشات کو عارفہ کے ساتھ حقیقت کا روپ بدلتے دیکھ لیا۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو اس خواب کو کبھی نہ بکھرنے دیتا۔

لیکن.....!

خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔

بالآخر آنکھ کھل جاتی ہے۔

خوبصورت مناظر کو جیسے موت آ گئی تھی اور زندگی اپنی تمام تر تلخیوں سمیت اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے کل سے اُس نے عارفہ کے گھر والوں سے ملاقات نہیں کی تھی خدا جانے وہ لوگ کس حال میں ہیں۔ ابھی تک ان کا بیٹا بھی نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں وہ ہوسٹل سے آ گیا ہے یا نہیں۔

پہلے تو اُس نے چاہا کہ فون کر کے اُن کی خیریت دریافت کرے لیکن پھر اپنا فیصلہ بدل دیا اور چائے کے ساتھ ایک ٹوسٹ زہر مار کر کے اپنی ماں کے سوالات کے جواب ہوں، ہاں میں دیتا وہ ''سیف ہاؤس'' کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کی ایک دُور دراز لیکن جدید سہولیات سے آراستہ کالونی کے ایک کونے میں موجود اُس کوٹھی کے دروازے پر بظاہر عام چوکیدار پہرہ دیتا دکھائی دیتا تھا لیکن ان دروازوں کے اندر سیکورٹی کا جدید نظام موجود تھا اور یہاں کے مکینوں کو آہنی ہاتھوں کی حفاظت میسر تھی۔

ڈرائنگ روم میں میر صاحب کی ساری فیملی بے چینی سے شاید اسی کی منتظر تھی۔

''بیٹا ابھی تک لیاقت نہیں آیا۔''

''آپ مطمئن رہئے انکل..... وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ شاید ہوسٹل میں کہیں رہ گیا ہو۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

اس نے دوسرے کمرے میں موجود فون پر اپنے اُن ساتھیوں سے رابطہ کیا جنہیں لیاقت کو بحفاظت یہاں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

''سر! ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ اچھی خبر نہیں ہے۔ آپ آفس آ جائیں۔ وہیں بات کرتے ہیں۔ کہیں یہ لوگ پریشان نہ ہو جائیں۔'' انسپکٹر کمال نے جواب دیا جو اس آپریشن کا انچارج تھا۔

''ہونہہ..... ٹھیک ہے۔ تم لوگ وہاں پہنچو میں ایک گھنٹے تک آتا ہوں۔''

فی الوقت وہ اس سے زیادہ کوئی بات فون پر نہیں کر سکتا تھا عین ممکن تھا کہ میر صاحب یا اُن کی کوئی بیٹی اس کی گفتگو سن لے اور وہ لوگ مزید پریشان ہوں۔

فون رکھ کر وہ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مقدور بھر کوشش کی تھی کہ اُس کی پریشانی کی خبر ان لوگوں کو نہ ہو اور خود کو نارمل رکھا ہوا تھا حالانکہ انسپکٹر کمال نے اُسے جو بتانا چاہا تھا اس کا اندازہ اُس نے کمال کی بات سن کر ہی کر لیا تھا۔

''کیا ہوا..... کہاں ہے لیاقت؟'' بوڑھی ماں نے بیقراری سے اُس کی طرف لپکتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے ہے اور میں اُسے لینے جا رہا ہوں۔''

شیر گل خان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ انہیں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

عارفہ کا ستا ہوا چہرہ اور چہرے پر پھیلی ہوئی آنکھوں سے جھانکتی یاسیت نے ایک مرتبہ تو شیر گل کو کاٹ کر ہی رکھ دیا۔

اس نے سوگوار حسن سے متعلق جتنی مثالیں سنی تھیں آج اُن کا عملی نمونہ اس کے سامنے تھا۔

جامنی رنگ کی عارفہ کو دیکھ کر سارناتھ کے مندروں میں رہنے والی ان وش کنیاؤں کی تصویر سامنے آجاتی تھی جو آنکھوں میں وصال کے خواب سجائے اپنے لامبے بال شانوں پر بکھیرے ہجر کے گیت جانے والے شہزادوں کی یاد میں گایا کرتی تھیں۔

دونوں اس وقت کمرے میں اکیلے تھے اس کی بہنیں کچن میں تھیں اور والدین دوسرے کمرے میں ایک دوسرے کو دلاسہ دے رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں عارفہ تم پریشان ہو۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے لئے میں خود کو بھی.....''

''خدا کے لئے ایسی بات کر کے مجھے میری نظروں میں نہ گرایئے۔ یہ میرا فیصلہ تھا، میں اپنے کسی فیصلے پر شرمندہ نہیں ہوں۔ مجھے علم تھا کہ اس کا انجام موجودہ حالات سے مختلف نہیں ہوگا لیکن میں اپنے ضمیر کو مردہ رکھ کر جینے کا تصور نہیں کر سکتی تھی..... تنظیم سے وفاداری کا مطلب ہوتا ہے وطن سے دشمنی اور مجھے یہ سودا ہرگز قبول نہیں تھا۔''

عارفہ نے تڑپ کر اُس کی بات کاٹ دی۔

''میں سلام کرتا ہوں تمہارے جذبے کو عارفہ..... میں شیر گل خان تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی میرے جیتے جی تم میں سے کسی کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ اس ملک کی بنیادوں میں میرے اور تمہارے اجداد کا خون ہے۔ اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں عارفہ..... بہت مضبوط..... اگر بپھرے ہوئے کچھ بے غیرت سانڈ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے سران بنیادوں پر کھڑی عمارت سے ٹکرا کر اسے منہدم کر دیں گے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔

ایسا نہیں ہو سکتا..... ایسا ہرگز نہیں ہوگا..... کم سے کم میرے جیتے جی کسی غدار کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے لئے خواہ مجھے اپنے آپ سے، قانون سے یا کسی بھی طاقت سے ٹکرانا پڑے عارفہ تم بہادروں کی طرح میرا ساتھ دینا۔ میری بات ہمت حوصلے سے سننا۔ مجھے شک ہے کہ لیاقت کو ان لوگوں نے اغواء کیا ہے۔ وہ اسے یرغمال بنا کر کوئی سودے بازی کریں گے۔ ایسا میرا اندازہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ خود کہیں چھپ گیا ہو۔ بہر حال کوشش کرو کہ اپنے گھر والوں کو مطمئن کر سکو۔ گو یہ مشکل کام ہے لیکن تمہی کو کرنا ہے اور ذمہ داری کے ساتھ۔''

شیر گل خان نے کہا۔

''میں جانتی ہوں شیر گل۔ ہم حالت جنگ میں ہیں کچھ بھی ممکن ہے، لیکن میرا ایمان ہے کہ زندگی موت کا فیصلہ انسان نہیں کرتے کوئی اور ذات کرتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے لیاقت کو اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔''

اُس لمحے عارفہ اُسے بدلی ہوئی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے بے پناہ اعتماد نے شیر گل کو یقین دلا دیا تھا کہ جبر کے سامنے یہ کمزور لڑکی دیوار

بن چکی ہے۔

عارفہ کے والدین کمرے میں اس طرح سر جھکائے داخل ہوئے تھے جیسے اُن سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

شیر گل خان خود کو اُن کے سامنے شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں کو کس طرح دلاسہ دے اور کس طرح اس بات کا یقین دلائے کہ ان کی واحد اولاد نرینہ کی زندگی محفوظ ہے۔

اس کے بضد ہونے پر ان لوگوں نے شیر گل خان کے ساتھ چائے کا ایک ایک کپ زہر مار کیا تھا اور اب وہ اُن سے رخصت ہونے کی اجازت لے رہا تھا۔ جب اچانک ہی عارفہ کی بوڑھی ماں سوال بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''بیٹا ہمارے لئے قربانیاں دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے اجداد نے یہ روایت ہمیں نسل در نسل منتقل کی تھی جب 1947ء میں تقسیم پر ادھر آئے تھے۔ تو اتنا کچھ لٹا دیا تھا کہ پھر لٹانے کو بھی کچھ پاس نہیں رہا تب ایک اطمینان ضرور تھا کہ اب ہم ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ لیکن بیٹا یہاں تو.....''

بے چاری بڑھیا سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

شیر گل خان کے لئے اس منظر کی تاب لانا ممکن نہیں تھا۔

''عارفہ اپنی امی کو حوصلہ دو۔ میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ!''

اس نے عارفہ سے کہا اور اُن کی طرف دیکھے بغیر واپس لوٹ آیا۔

●

انسپکٹر کمال بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

''ہوں.....''

شیر گل نے اُس کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے اُسے اس بات کا علم ہو رہا ہو کہ انسپکٹر کمال اُسے کیا خبر سنانے جا رہا ہے۔

''بڑے حرامی لوگ ہیں سر! میر صاحب کے اپنے گھر سے رخصت ہونے کے چند منٹ بعد ہی انہوں نے لیاقت کو اغواء کر لیا..... افسوس ہم بروقت اس کی مدد نہیں کر سکے۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے ہوسٹل میں اسلحے کے انبار لگا رکھے ہیں..... یوں بھی کسی کا داخلہ ان لوگوں کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ نواب خان نے کوشش کی تھی سر! اُسے بہت چوٹیں آئی ہیں۔ اگر ہمیں بروقت رینجرز کی مدد نہ مل جاتی تو شاید سب انسپکٹر نواب خان کو جان سے ہی مار ڈالتے۔'' انسپکٹر کمال نے بغیر لگی لپٹی رکھے اُسے بتا دیا۔

''کون ہے وہاں کا سیکٹر انچارج؟'' اس نے پوچھا۔

''جیدالنگڑا..... یاسین کونسلر کا بھائی جناب..... انڈسٹریل ایریا والے ٹارچر سیل کا انچارج اور قتل کی کم از کم پندرہ وارداتوں کا براہ راست ذمہ دار۔'' انسپکٹر کمال نے اُسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''گویا یاسین کونسلر ہے اس حرام کاری کے پیچھے.....''

وہ آہستہ سے بڑبڑایا پھر کچھ سوچنے لگا۔ اچانک ہی ایک نتیجے پر پہنچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ اُس نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی تین بہنوں کے اکلوتے بھائی کی زندگی کو خطرے میں ڈالے۔ قانونی تقاضے پورے کرنے میں جتنی دیر ہوتی اتنی دیر میں تو وہ لوگ اس کے جسم سے بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دیتے اُسے فوراً کچھ کرنا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

اس خاندان پر عذاب اس کی وجہ سے آیا تھا۔ اگر اُن کا اکلوتا بیٹا ورندگی کی بھینٹ چڑھ جاتا تو شیر گل شاید زندگی بھر اُن کا سامنا نہ کر پاتا۔

''سارے یونٹ کو 'سٹینڈ بائی' رکھنا..... شام تک کچھ کرتے ہیں۔''

اُس نے اپنے ماتحت کو ہدایت دی اور تیزی سے باہر آ گیا..... اس نے جیپ وہیں چھوڑی اور اب بڑی موٹر سائیکل کے ذریعے حسن خان کے ہوٹل کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

●

جاری ہے...

حسن خان کے لئے اس کی اچانک آمد کوئی نئی بات نہیں تھی..... شیر گل کے کام ہمیشہ ہنگامی نوعیت کے ہی ہوا کرتے تھے۔ ہوٹل کے ایک کمرے سے اُس نے عارف سے رابطہ کر کے اُسے یہیں بلا لیا تھا۔ عارف بھی حالات کی سنگینی کا احساس ہونے پر تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

''خیریت ہے.....''

عارف نے آج پہلی مرتبہ اپنے دوست کو اتنا پریشان دیکھا تھا۔

شیر گل خان نے اُسے مختصر کہانی سنا کر ہدایت کی کہ لیاقت کا پتہ فوراً لگایا جائے۔

''مرکز میں تو وہ آیا نہیں..... شیر گل بھائی تم شاید نہیں جانتے یاسین کونسلر اور اس کی قماش کے کچھ لوگ من مانیاں کرنے میں آزاد ہیں۔ یہ لوگ اکثر معاملات میں بابا صاحب کی پرواہ نہیں کرتے۔ یاسین نے تو انتہا کر دی ہے۔ وہ تو اب اپنا الگ ''بھتہ'' حاصل کرنے لگا ہے۔ انڈسٹریل ایریا والے ٹارچر سیل پر ان لوگوں کا مکمل کنٹرول ہے اور جسے جی چاہے بابا صاحب کی اجازت کے بغیر بھی وہیں لے آتے ہیں..... میرے خیال سے اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہے کھیل کو بیلنس کیا جائے۔ جس کے بعد ہی ہم بات کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہم جتنی دیر کریں گے معاملہ اتنا ہی بگڑ جائے گا۔''

عارف نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم آغاز کرو، میں اپنا کام کرتا ہوں۔''

عارف کی بات سمجھتے ہوئے شیر گل نے کہا۔

''ابھی لو..... خدا کرے وہ مل جائے جس کو میں فون کرنے لگا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے عارف نے اپنی جیبی ڈائری نکالی اور اُس میں سے ایک نمبر تلاش کرنے کے بعد گھمایا۔

دوسری طرف نمبر ملنے پر اُس نے اپنے منہ کے سامنے رومال رکھ کر بات کی تھی۔ شیر گل خان دلچسپی سے اُس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ عارف نے ''آستانہ'' کے یونٹ انچارج قمر علی کی حیثیت سے بات کرتے ہوئے یاسین کونسلر کے تیسرے بھائی فیروز کو تنظیم کے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بابا صاحب خود وہاں موجود ہیں اب سے ایک گھنٹے بعد میٹنگ شروع ہو جائے گی۔

دوسری طرف سے ملنے والے جواب نے اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑا دی تھی اور شیر گل خان نے اندازہ کر لیا تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔

''ویل ڈن۔''

اس کے فون رکھنے پر شیر گل نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

''شیر گل بھائی وقت کم ہے..... میرے خیال میں وہ گدھا چل پڑا ہے۔ کیونکہ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ فون رکھتے ہی کپڑے بدل کر آ رہا ہے۔ اس کی گاڑی کا رنگ سفید ہے۔''

اس نے شیر گل کو جلدی جلدی تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

جس خفیہ ٹھکانے پر عارف نے اُسے ''آستانہ'' کے انچارج کی حیثیت سے پہنچنے کی ہدایت کی تھی اس کا سارا نقشہ اُس نے شیر گل کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا اور اس مقام کی بھی نشاندہی کر دی تھی جہاں سے وہ فیروز کو قابو کر سکتے تھے۔

اگلے ہی لمحے عارف اپنے ٹھکانے کی طرف اور شیر گل خان کی راہنمائی میں حسن خان کے ساتھی ایک بند ویگن میں تنظیم کے خفیہ ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

شہر کی معروف شاہراؤں سے ہٹ کر شیر گل خان انہیں اس راستے پر لے آیا تھا جہاں انہوں نے شکار کے لئے جال بچھانا تھا۔ ایک ایک تفصیل اُس کے ذہن میں نقش تھی۔ طویل سڑک کے ایک محفوظ موڑ پر اس نے اپنے ساتھیوں کو منصوبے کے مطابق چھپا دیا تھا جس جگہ انہوں نے ناکہ لگایا تھا۔ یہاں سے سڑک کا ایک حصہ ٹوٹا ہونے کے سبب صرف اتنی سی جگہ تھی جہاں سے بمشکل ایک بڑی گاڑی نکل سکتی تھی۔

اس سمت آنے والی شاہراہ پر شیر گل خان تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر دور کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بڑے مضبوط اور زیادہ ہارس پاور والی موٹر سائیکل سلف سٹارٹ تھی اور وہ اس طرح سڑک کنارے کھڑا تھا کہ ایک لمحے میں موٹر سائیکل کو ہوا کی رفتار سے اُڑا سکتا۔

پانچ چھ منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد اُسے بالآخر سفید شیراڈ گاڑی دُور سے آتی دکھائی دی۔ اس درمیان یہ تیسری سفید رنگ کی کار تھی جسے دیکھ کر وہ ہوشیار ہوا تھا۔

لیکن.....!

قریب آنے پر جب وہ نمبر پڑھتا تو مطلوبہ گاڑی نہیں ہوتی تھی۔

اس کی چھٹی حس نے اس مرتبہ شیر گل کو چوکس کر دیا تھا کہ یہ ہی اس کی مطلوبہ گاڑی ہے اور وہ موٹر سائیکل پر اس طرح سوار تھا جیسے ابھی ابھی کوئی خرابی ٹھیک کرنے سے فارغ ہوا ہو۔

اس مرتبہ اُس کا اندازہ واقعی صحیح تھا۔

فیروز اکیلا گاڑی چلاتا آ رہا تھا۔ اُس نے اپنی کار کا ٹیپ ریکارڈر پوری آواز سے کھولا ہوا تھا اور لفنگوں کی طرح لہک لہک کر گانے کی دھن پر گاڑی چلا رہا تھا.....

عام حالت میں شاید وہ کبھی اکیلا سفر نہ کرتا تھا۔

لیکن.....!

آج چونکہ اُسے ایک اہم مشن کی تیاری کرنا تھی اور بابا صاحب خود یہاں آئے تھے تو ضرور کوئی اہم بات ایسی ہوگی۔ اس لئے احتیاطً وہ اکیلا ہی اس طرف آ رہا تھا۔ وہ شاید میوزک کا کچھ زیادہ ہی شوقین تھا اور گاڑی کو اس لئے معمول کی رفتار سے چلا رہا تھا کہ میوزک کا مکمل لطف اٹھا سکے۔

شیر گل خان کی تیز رفتاری موٹر سائیکل نے اُسے چند سیکنڈ میں جالیا اور اب وہ اُسے اوورٹیک کر کے اُس کے آگے آگے پائلٹ کی طرح چل رہا تھا جلد ہی حسن خان اور اس کے ساتھیوں نے جو دوربین لگائے کھڑے تھے اُسے دیکھ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اُن لوگوں نے اپنی وین کو سڑک پر اس طرح ٹیڑھا کھڑا کر دیا کہ اُسے ہٹائے بغیر دوسری گاڑی کے نکلنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

حسن خان اور اُس کے دو ساتھی اس طرح وین کے پیچھے چھپے تھے کہ کار سوار کو دکھائی نہ دے سکیں۔ جبکہ تیسرے نے وین کا بونٹ اٹھایا ہوا تھا اور اس کی کوئی خراب دُور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان لوگوں کے کھڑے ہونے کا انداز اتنا نیچرل تھا کہ کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا۔

شیر گل خان نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار اب کم کر لی تھی کہ فیروز اس سے آگے نکل گیا۔ جیسے ہی اس نے اگلا موڑ مڑنا چاہا اچانک اس کا پاؤں بریک پر گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ اُبل پڑا۔ اگر وہ اچانک بریک نہ لگاتا تو سیدھا ویگن سے جا ٹکراتا۔ وہ غصے سے بے قابو ہوا جا رہا تھا اور اب اُس نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر وین کے ڈرائیور کو گالیاں دیتے ہوئے اُسے پرے ہٹانے کے احکامات بھی جاری کرنے شروع کر دیئے تھے۔

''کیا ہوا جناب۔ خیریت تو ہے۔''

اچانک شیر گل نے اُس کے نزدیک پہنچ کر دریافت کیا۔

اس درمیان میں بونٹ کے نزدیک کھڑا نوجوان بھی نزدیک آ چکا تھا۔

''صاحب گالیاں کیوں دیتا ہے۔''

اس نے غصے سے کہا۔

فیروز اس کی بات کا جواب مزید گالیوں کی صورت میں دیتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اپنی دانست میں اُس نے شاید اس گستاخ کا منہ بند کرنا چاہا تھا۔

لیکن.....!

اچانک اُسے یوں لگا جیسے آسمان پر تارے نکل آئے ہوں حالانکہ دن کی روشنی میں اس کا امکان نہیں تھا۔ اس کی پشت پر گدی کے نزدیک شیر گل نے جانے کس انداز کا ہاتھ مارا تھا کہ فیروز کے اوسان خطا ہو گئے۔

بے ہوش ہوتے فیروز نے آخری منظر یہی دیکھا تھا کہ تین چار ہیولے بیک وقت اُسے پکڑنے کو لپکے تھے۔ انہوں نے فیروز کے بے ہوش جسم کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی تھام لیا اور بجلی کی پھرتی سے وین میں ڈال کر لے گئے۔

اُن کا ایک ساتھی وہیں رُک گیا تھا جس نے فیروز کی گاڑی سڑک سے نیچے اُتار کر جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح کھڑی کر دی تھی کہ ڈھونڈنے پر ہی دکھائی دے سکے۔ بعد میں وہ شیر گل خان کی موٹر سائیکل پر اُس کے ساتھ ہی بیٹھ کر آ گیا تھا۔

●

فون یاسین کونسلر نے معمول کے مطابق ہی اُٹھایا تھا لیکن دوسری طرف سے ''ہیلو'' کی آواز نے اُسے چونکا کر رکھ دیا۔

''کون ہو تم.....؟''

اُس نے اپنی دانست میں فون پر ہی اتنی زور سے ہیلو کہنے والے کو ڈانٹا تھا کہ اس کا دم نکل گیا ہو گا لیکن یاسین کونسلر کے اندازے کے برعکس دوسری طرف کوئی مضبوط اعصاب کا مالک بات کر رہا تھا۔

''میرے خیال میں اس وقت تمہارا دماغ صحیح نہیں شاید ابھی شراب کا نشہ نہیں اُترا..... خیر! تمہاری مرضی میں نے تو تمہارے چہیتے بھائی فیروز سے متعلق کچھ خبر دینی تھی۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کک کک کیا مطلب۔ کیا ہوا فیروز کو، دیکھو، دیکھو تم.....''

فیروز کا نام سنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اس کے منہ سے عجیب عجیب سے فقرے برآمد ہو رہے تھے۔

''میرا اندازہ صحیح نکلا۔ تمہارے حواس ابھی بحال نہیں ہوئے خیر..... تم پہلے اس بات کی تصدیق کر لو کہ تمہارا بھائی فیروز ہے کہاں..... پھر بات کریں گے..... میں آدھ گھنٹے بعد فون کروں گا۔ اس درمیان تم شریف پور کی جھاڑیاں دیکھ لو۔''

یاسین کونسلر ہیلو ہیلو چیختا رہ گیا اور فون کٹ گیا۔

اس نے دیوانہ وار اپنے کارندوں کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔

''فیروز کہاں ہے.....؟ کہاں گیا.....؟''

اپنے سامنے کھڑے کارندوں سے جن کی شکلوں پر لعنت برس رہی تھی اس نے اس طرح چیخ چیخ کر پوچھنا شروع کیا جیسے اُنہوں نے فیروز کو کہیں چھپا رکھا ہو۔

''ہمیں علم نہیں بھیا۔''

اُن میں سے ایک نے ہمت کر کے جواب دیا۔

یاسین کونسلر اپنی دانست میں اُسے مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پالیا اس طرح دیوانگی میں تو بنا بنایا کھیل ہی بگڑ جاتا۔

''شریف پور کے سارے موڑ چیک کرو فوراً..... ابھی۔ جہاں منے کی گاڑی نظر آئے وہیں رُک جانا۔ موبائل فون لے جاؤ اور فوراً مجھ سے رابطہ کرنا۔''

اُس نے اپنے پالتوں غنڈوں کو اشارہ کیا اور وہ ایک دوسرے کے تعاقب میں نکل گئے۔

یہاں سے مطلوبہ جگہ کا فاصلہ بمشکل پندرہ بیس منٹ تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی یاسین کونسلر کو اطلاع مل گئی کہ اس کے منا کی گاڑی کہاں کھڑی ہے۔

اب اس کی عقل واقعی ٹھکانے آ گئی تھی اسے سمجھ لگ گئی تھی کہ کسی نے اس شہر میں اس کی غنڈہ گردی کو نہ صرف چیلنج کر دیا ہے بلکہ عمل بھی کر کے دکھا دیا۔ اب اُسے بے چینی سے فون کا انتظار تھا۔ وہ بڑا منجھا ہوا اور گھاگ شکاری تھا۔ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں دماغ گرم رکھنے کا فائدے کے بجائے نقصان ہو جاتا ہے۔

اس مرتبہ گھنٹی بجی تو اس نے فون تو بے چینی سے اُٹھایا تھا لیکن خود پر اُسے مکمل کنٹرول تھا۔

''کیوں یاسین بھیا۔ پتہ لگ گیا کہ منا ہمارے پاس ہے۔''

دوسری طرف سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا تھا۔

''تم جو کوئی بھی ہو یا تو پاگل ہو یا پھر اس شہر میں تم نے آج ہی جنم لیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کیا کر گزرے ہو..... بہت تباہی پھیلے گی۔ میں تمہیں.....''

اس نے خود ہی دانت پیستے ہوئے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا وہ فون پر تو غصہ نہیں نکال سکتا تھا۔

''ہاں ہاں کہو کہو..... چپ کیوں ہو گئے۔ یاسین میرے خیال سے ابھی تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہوا بہر حال فی الوقت تمہارے لئے یہی حکم ہے کہ اگر منے کی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو اپنے قبضے میں موجود انجینئرنگ یونیورسٹی کے نوجوان لیاقت کے جسم پر خراش نہ آنے دینا اور نہ یاد رکھنا اِدھر وہی حال تمہارے منا کا ہو گا.....''

دوسری طرف سے بات کرنے والے کا لہجہ بڑا خونخوار تھا۔

یاسین کونسلر کو فوراً ہی ساری بات کی سمجھ آ گئی۔ تب اُس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ جس ایجنسی نے میر صاحب کی بیٹیوں کو اس کی درندگی سے محفوظ رکھا ہے یقیناً انہی لوگوں نے اس کے بھائی کو اغواء کیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب یہ لوگ اپنی بات منوائے بغیر اسے رہا نہیں کریں گے۔

''یاسین بھیا میر صاحب کی لونڈیاں بھاگی نہیں جا رہیں فی الوقت اپنے منا کو بچاؤ۔''

کسی نادیدہ قوت نے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''تم کیا چاہتے ہو۔''

اس نے بڑے جبر سے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔

''تبادلہ..... تمہارے بھائی منا کے ساتھ لیاقت کا تبادلہ..... لیکن اپنی شرائط پر۔''

”دیکھو مجھے اتنا مجبور نہ سمجھو..... اگر تم اتنے بہادر ہو تو کھل کر سامنے کیوں نہیں آتے۔“

یاسین نے اپنی دانست میں اس کی غیرت کو للکارا تھا۔

لیکن.....!

خدا جانے فون کرنے والا کس مٹی کا بنا ہوا تھا وہ جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”یاسین بھیا تمہاری طرح ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔“

اس نے کہا۔

یہ کم بخت کسی طرح قابو آنے والا نہیں۔ یاسین کے شیطانی ذہن نے راہ سجھائی۔ اس نے انتقام کا بہت بھیانک طریقہ سوچا تھا بس منا کی واپسی کی دیر تھی۔

”کب چاہتے ہو.....“

اس نے فون پر پوچھا۔

”آج..... بلکہ ابھی۔“

جواب ملا۔

”کہاں..... کیسے؟“

یاسین نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ہاں یہ ہے سوچنے کی بات..... تم ایسا کرو، اپنی گاڑی میں باہر نکلو اپنا موبائل فون ساتھ رکھنا۔ لیاقت کو گاڑی میں بٹھاؤ اور بڑی شاہراہ پر نواحی آبادی کی طرف سفر کا آغاز کر دو۔ جہاں تمہیں پیغام ملے وہاں رُک جانا..... وہیں تمہارا منا موجود ہوگا۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔

بہت مکار لوگ تھے۔ انہوں نے یاسین کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی۔

لیکن.....!

”لیکن ویکن کے چکر میں نہ پڑو۔ ہم کوئی فارغ لوگ نہیں ہیں نہ ہی ہماری لیاقت سے وہ رشتہ داری ہے جو تمہاری اپنے منا یعنی فیروز سے۔ فون رکھنے کے پندرہ منٹ بعد اپنے گھر سے روانہ ہو جانا ورنہ رات کے پہلے پہر شہر کے کسی چوراہے سے اپنے منا کو اُس حالت میں وصول کر لینا جس حالت میں تم اپنے شکار کو پھینکا کرتے ہو..... سمجھے..... ٹھیک پندرہ منٹ بعد۔ گھڑی سے وقت ملا لو۔“

دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ کر بڑی دُرشتی سے کہا گیا۔

یاسین کونسلر ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا اور دوسری طرف کھٹاک سے سلسلہ کٹ گیا۔

اُس کا بس چلتا تو اس شخص کی بوٹیاں نوچ لیتا جس نے اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی شدت سے بے بسی کا احساس دلایا تھا۔

لیکن.....!

اب ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔

اس دنیا میں اس کی واحد کمزوری منا تھا اور منا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو اس کا ازالہ لیاقت جیسے ایک ہزار نوجوانوں کو قتل کرنے سے بھی نہ ہوتا۔ یوں بھی اس نے سوچا اس شہر پر اُن کی بادشاہت کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ وقتی طور پر تو لیاقت بچ نکلے گا لیکن پھر.....!

اور پھر میر صاحب بھی کب تک اپنی لڑکیوں کے ساتھ چھپتا پھرے گا۔ اُن کا مال اسے بہر حال واپس لوٹانا پڑے گا۔ اُس کی یہ جرأت کہ اُس نے تنظیم کے آقاؤں کے حکم کے بغیر اپنی لڑکیوں کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا ناقابل معافی جرم کیا..... اُس نے میر صاحب کے لڑکے کو اسی لئے اُٹھایا تھا کہ اس کے ذریعے میر صاحب سے سودے بازی کر کے انہیں واپس آ کر معافی مانگنے پر مجبور کر سکے۔

یہ وحشی درندے حکمرانی میں بھی نمرود کی خدائی کے قائل تھے۔ اس کی حسِ درندگی کو تب ہی تسکین پہنچتی جب وہ میر صاحب کی بچیوں کی عصمت دری کر کے اپنی ہوس اور انتقام کی آگ بجھاتا..... اس طرح وہ اس کیس کو اس علاقے میں ''ٹیسٹ کیس'' بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا تا کہ آئندہ اگر کسی کے دماغ میں بغاوت کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں تو ابھی سے مر جائیں۔

لیکن.....!

فی الوقت تو اس کے ارادوں پر پانی پھر گیا تھا۔

''کوئی بات نہیں میر صاحب میں اتنی جلد مرنے والا نہیں..... یاد رکھنا جس روز قابو آ گئے گن گن کر سارے حساب چکا دوں گا۔''

اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنا موبائل فون اُٹھا کر غصے سے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

●

یاسین کونسلر کے ساتھی اپنے آقا کا موڈ دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اپنی جانثاری ثابت کرنے کے لئے اظہارِ ہمدردی کریں لیکن دوسری طرف سے سوائے مغلظات کے اور کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹارچر ہاؤس تک آیا تھا جہاں سے اُس نے لیاقت کو وصول کر کے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ خدا کا شکر ہوا کہ اس پر زیادہ تشدد نہیں کیا گیا

تھا۔شاید ابھی وہ تازہ تازہ ہی اُن کے قابو میں آیا تھا۔

بادل نخواستہ اسے لیاقت سے کہنا پڑا کہ اُسے رہا کرنے کے لئے لے جا رہا ہے اور وہ مطمئن ہو کر بیٹھا رہے۔

خوف سے لیاقت کے منہ سے لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا۔اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ یاسین بھیا کو شکریہ ہی کہہ دیتا۔یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کے جسم سے رُوح نکال لی ہے اور ڈھانچہ چلنے پھرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

یاسین کونسلر اپنی حفاظت سے غافل نہیں تھا اور اس نے اپنی دانست میں بڑی چالاکی دکھائی تھی۔

لیکن.....!

اس کا مقابلہ نجانے دُنیا کی کس مخلوق سے تھا جیسے ہی وہ انڈسٹریل ایریا سے باہر نکلا فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہاں!''

اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

اپنی گاڑی کو سیکیم نمبر ایک کی مین سڑک سے چلاتے سیکیم نمبر پانچ تک لے جاؤ۔''

دوسری طرف سے حکم ملا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا۔

یاسین کونسلر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے غصے سے اُس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ان لوگوں نے اسے پاگل کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

وہ دیوانہ وار گالیاں بک رہا تھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر سہما ہوا لیاقت مزید سہم کر رہ گیا تھا۔ابھی وہ سیکیم نمبر 3 تک ہی پہنچا تھا جب دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔

''اب کیا مصیبت آ گئی۔''

اس نے فون اٹھاتے ہی پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''دیکھو یاسین بھیا اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔بعد میں جب تم جی بھر کے پچھتاؤ گے تب غصہ بھی کھا لینا۔فی الوقت اپنے ہوش و حواس قائم رکھو یہ منا کی جان کی سلامتی کے لئے بہت ضروری ہے۔''

دوسری طرف سے اس طرح کہا گیا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے کسی مریض کو مشورہ دے رہا ہو۔

''اچھا!اچھا!زیادہ نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔

''تو سنو.....ہمارے اور تمہارے معاہدے میں یہ بات کہیں شامل نہیں تھی کہ تم اپنے ساتھ حفاظتی فوج لے کر آؤ گے۔تمہیں اکیلے آنے کا حکم دیا گیا تھا.....تم نے

نورنگ آباد میں اپنی کم از کم چھ کاریں پہلے سے الرٹ کر دی ہیں..... اور اب بھی تمہارے تعاقب میں گرے رنگ کی جو گاڑی آ رہی ہے اس میں تمہارے لوگ سوار ہیں..... یاسین بھیا اگر میں چاہوں تو ابھی یہ معاہدہ منسوخ ہو سکتا ہے لیکن ایک پہلی اور آخری معافی تمہیں دی جا رہی ہے..... اپنی گاڑی اور ان گدھوں کو گھر واپس بھیج کر پہلی چورنگی پر آ جاؤ..... ہم نے پلان بدل دیا ہے۔"

اس مرتبہ بھی اس نے یاسین کی بات سُنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

یاسین بھیا نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو کسی حد تک خوفزدہ محسوس کیا تھا۔ خدا جانے اس کا پالا کس بلا سے پڑ گیا تھا جس سے اس کی کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں تھی۔

اُس نے اپنی دانست میں بہت چالاکی سے سارا جال بُنا تھا۔

لیکن.....!

یہاں تو سب تدبیریں اُلٹی ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنی کار کو بریک لگا کر روکا اور اپنے تعاقب میں آنے والی کار کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"اُلو کے پٹھو..... تمہیں میں نے اپنی نگرانی کے لئے کہا تھا..... اپنے ساتھ چپکے رہنے کے لئے نہیں۔ دفع ہو جاؤ..... چلے جاؤ....."

اس نے دیوانوں کی طرح چلاتے ہوئے کہا۔

یاسین اپنی گاڑی میں ابھی بیٹھا ہی تھا جب اچانک ایک وین نے اس کا راستہ روک لیا۔

یہ وین اتنی تیزی سے اچانک اُس کے سامنے آئی تھی کہ اگر وہ بریک لگانے میں معمولی سی کوتاہی کا مظاہرہ کرتا تو اُس سے ٹکرا جاتا۔

وین کا دروازہ کھلا تو اس کی نظر منا پر پڑی جس کے سرہانے ایک نقاب پوش پستول تانے کھڑا تھا۔

دو نقاب پوش اُتر کر نیچے آ گئے۔

"لڑکے کو باہر نکالو....."

اُن میں سے ایک نے اس کی طرف پستول تان کر کہا۔

یاسین اس اچانک صورت حال سے گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوسرے ہی لمحے بلا ارادہ ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ لیاقت شاید اس لمحے کا منتظر تھا۔ وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"ہم اگر چاہیں تو اسے یوں بھی لے جا سکتے ہیں لیکن ہم تمہاری طرح بزدل اور بے غیرت نہیں ہیں..... یہ لو اپنا منا سنبھالو..... اور یاد رکھنا اب مظلوموں نے ہتھیار اُٹھا لئے ہیں۔"

نقاب پوش اس سے باتیں کرتا رہا جب کہ اس کے دوسرے ساتھیوں نے سہمے ہوئے منا کو نیچے اُتار کر اُس کے بھائی کی گاڑی میں سوار کروا دیا۔

یاسین کا جی چاہتا تھا کہ ان کی بوٹیاں نوچ لے۔

لیکن.....!

وہ بے بس تھا۔

یہ لوگ مسلح اور انتہائی چالاک دکھائی دے رہے تھے۔اس کی ذرا سی بے وقوفی دونوں بھائیوں کی جان لے سکتی تھی۔

اُسے چند سیکنڈ کی مہلت درکار تھی جس کے بعد اس کے ایک اشارے پر اس وین کے سواروں سمیت پرخچے اُڑ جاتے۔

لیاقت کو ان لوگوں نے بازو سے پکڑ کر وین کے اندر بند کیا تھا جو شاید وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔

اچانک ہی وہ سب بجلی کی سی پھرتی سے وین میں سوار ہو گئے تھے جس کے ڈرائیور نے ابھی تک انجن بند نہیں کیا تھا۔وین جھٹکے سے آگے نکل گئی۔یاسین نے اس کی نمبر پلیٹ پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ کر لیا تھا کہ نمبر پلیٹ نقلی ہے۔

اس نے اپنے بھائی کو گالیاں دیتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی بمشکل چند گز چلنے پر ہی اُسے احساس ہوا کہ اس کا ٹائر پنکچر ہے۔

وہ لوگ جاتے جاتے اُس کے ٹائر میں سوراخ کر گئے تھے۔یاسین کونسلر نے غصے میں اپنا سر سٹیرنگ سے دے مارا۔پھر اس کے منہ سے 'سی' کی آواز نکلی اور وہ گالیاں بکتا گاڑی بند کر کے نیچے اُتر آیا۔

اپنے موبائل فون پر وہ دیوانہ وار انگلیاں مار رہا تھا۔

لیکن.....!

اس کے اپنے بدمعاشوں سے رابطہ کرنے تک وین اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اس کی دسترس سے باہر.....

●

وین دو تین گلیوں کا چکر لگا کر ایک جگہ رُک گئی۔اس میں موجود لیاقت کو ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کو دوست سمجھے یا دُشمن۔

یہ اس کے ہم زبان نہیں تھے۔اس کا اندازہ اُسے فوراً ہی ہو گیا تھا۔

''کون ہیں آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

اس نے ہمت کر کے بالآخر نقاب پوش سے پوچھ ہی لیا۔

''ہم تمہارے دوست ہیں۔تمہیں اس بدمعاش کے چنگل سے نکال کر تمہارے والدین تک پہنچا رہے ہیں۔اب کوئی سوال نہ کرنا۔''

اُسے بڑی سرد مہری سے جواب دیا گیا اور واقعی اُس نے کوئی سوال دوبارہ نہیں کیا۔ فی الوقت اس کے پاس خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

وین رُکنے پر ایک گاڑی اُسے دکھائی دی اور وین سواروں نے اُسے اس میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ لیاقت کے لئے سوائے اُن کے احکامات پر عمل کرنے کے کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ وہ بلا چوں چراں کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

وین برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

''گھبراؤ نہیں تم میر صاحب اور اپنی بہنوں کے پاس جا رہے ہو..... مجھے افسوس ہے تمہیں کچھ دیر ان لوگوں کی قید میں رہنا پڑا۔''

بات کرنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

''میں آپ کو جانتا نہیں لیکن آپ جو کوئی بھی ہیں میرے لئے تو خدا کی رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپ نے مجھے ان موذیوں سے بچا لیا ورنہ یہ.....''

اس کی بات نامکمل تھی جب اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔

حوصلہ کرو یار تم تو جوان آدمی ہو..... تمہاری یہ حالت دیکھ کر تمہارے گھر والوں پر کیا گزرے گی..... وہ بے چارے پہلے ہی پریشان ہیں۔''

شیر گل خان نے اُسے حوصلہ دیا جو ڈرائیور کے رُوپ میں اُس کے ساتھ موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد واقعی وہ اپنے والدین کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جن کی زبانیں شیر گل کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتیں تھیں۔

''ابھی اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے سر سے اپنا ہاتھ نہیں اُٹھایا ماں جی..... بابا صاحب یا اس کے غنڈے اتنے طاقتور نہیں کہ زمین پر خدا بن بیٹھیں..... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی موت بہت نزدیک ہے..... انشاءاللہ بہت جلد اس شہر پر بہار آئے گی..... یہ شہر نگاراں زندگی کی رعنائیوں سے منور ہوگا۔ بہت جلد انشاءاللہ.....''

''انشاءاللہ''

اُس کی بات کا جواب غمزدہ انسانوں نے بے ساختہ دیا۔

تھوڑی دیر تک اُن کے ساتھ رہنے کے بعد شیر گل خان وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ اُس نے میر صاحب اور لیاقت کو کچھ ہدایات دی تھیں اور انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ ابھی اس گھر سے باہر نہ نکلیں۔

میر صاحب نے اس سے جاتے جاتے درخواست کی تھی کہ اگر ممکن ہو تو اُن کا گھر فروخت کروا دے۔ اب وہ لوگ اس محلے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں اُن پر زندگی اجیرن ہو جاتی۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھے۔ ایک زمانہ دیکھا ہوا تھا انہوں نے..... اور جانتے تھے کہ ان وحشیوں کی دسترس سے جتنا محفوظ رہا جائے غنیمت ہے۔

●●●

انجام

عین اُن لمحات میں جب شیر گل انہیں تسلی دے کر رخصت کر رہا تھا کہ کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتا اور وہ اپنے ہی گھر میں واپس لوٹیں گے۔

میر صاحب کا گھر نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔

یاسین کونسلر کے بھائی سرفراز منّا کی کمان میں تنظیم کے وحشیوں کا گروہ اُن کی زندگی بھر کی کمائی کے حاصل اس واحد گھر میں موجود مال اسباب لوٹنے کے بعد اُس پر پٹرول چھڑک کر اُسے آگ دکھا رہے تھے۔

اس شہرِ بے مثال میں ''غداروں'' کی کم از کم سزا یہی تھی۔

سارا محلّہ سہم کر اپنے گھروں میں دبک گیا تھا۔

شعلے بلند ہو رہے تھے۔

لپٹیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

درندوں کے قہقہے بھی اسی رفتار سے فضاؤں کا کلیجہ چھلنی کر رہے تھے۔

فائر بریگیڈ محلے کے باہر غنڈوں کے احکامات کا منتظر تھا۔ انہیں اس وقت مکان تک پہنچنے کی اجازت ملی جب اس میں موجود ہر شے جل کر راکھ ہو چکی تھی اور اب یہ آگ دوسرے مکانات کو بھی اپنے دامن میں لپیٹنے کو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہاں اب راکھ کے ڈھیر، چٹختی لکڑیاں اور اُن میں سے اُٹھتے دھوئیں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

صبح ڈھل رہی تھی۔

یہاں کے مکین سبھی سہمی نظروں سے جلے ہوئے مکان کے کھنڈرات پر دل ہی دل میں کف افسوس مل رہے تھے۔

لیکن.....!

بے چاروں کو بادلِ نخواستہ تنظیم کے غنڈوں کی ہاں میں ہاں ملا کر میر صاحب جیسے تنظیم کے غداروں کو ملنے والی اس سزا پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرنا پڑ رہا تھا۔

کتنے بے بس تھے یہ بے چارے لوگ۔

●

اختر ملک کے یہ سارے اندازے پہلے ہی روز غلط ثابت ہو گئے تھے۔

پہلے ہی روز دورانِ تفتیش اس کا واسطہ جن لوگوں سے پڑا وہ شاید گونگے بہرے تھے۔ کیونکہ ملک اختر کی کوئی بات سُننے یا سمجھنے کے بجائے وہ اپنی بات اُسے سنانے یا سمجھانے پر لگے رہے۔

یہاں اس کی حیثیت ایک غدار اور گھٹیا درجے کے مجرم کی سی تھی۔

کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور کس کا بیٹا ہے۔ وہ لوگ اُس سے بار بار ایک ہی سوال کر رہے تھے کہ اس نے اب تک ملک کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔

کس کس کے اشارے پر کون کون سے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا ہے؟

انہوں نے پہلے ہی روز اس کے سامنے میناکشی کے بھائیوں ''اور'' رشتہ داروں'' کے ساتھ اس کی ملاقات کی فلمیں چلا کر دکھا دیں۔

اس کی ریکارڈ شدہ گفتگو اُسے سُنا دی۔

اس بات پر کوئی شک نہیں تھا کہ اختر ملک پر آج پہلی مرتبہ انکشاف ہو رہا تھا کہ پروین کا اصلی نام میناکشی ہے اور وہ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' کی تربیت یافتہ ایجنٹ ہے جسے اس ملک میں داخل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ ملک اختر جیسے گدھوں کو اپنی جنسیت کے جال میں پھنسا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتی رہے۔

اس کے لئے تو یہ بھی انکشاف ہی تھا کہ میناکشی کے بھائی اور رشتہ دار دراصل بھارتی ہائی کمیشن کے وہ ملازمین تھے جو یہاں سفارت کاروں کے روپ میں جاسوسی کا جال پھیلائے بیٹھے ہیں۔

اس بات سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا کہ تنظیم ایک دہشت گرد، ملک دشمن اور غیر ملکی طاقتوں کی آلہ کار جماعت ہے۔ جس کا مقصد ہی ملک کی تباہی اور ایک الگ ملک کا قیام ہے۔ ملک اختر نے مان لیا تھا کہ ان لوگوں کے پاس جتنے ثبوت اس کے خلاف جمع ہو چکے ہیں اس کے بعد ملک اختر کا بچ نکلنا تو ناممکن تھا۔

اس کی دولت، رشتہ داریاں، اثر و رسوخ کچھ بھی یہاں کام نہیں آ سکتا تھا۔

یہ لوگ تو نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

ان کا افسرِ اعلیٰ خود تفتیش کی نگرانی کر رہا تھا اور کیا مجال جو ایک لمحے کے لئے بھی اُس نے کسی مرحلے پر غفلت کا مظاہرہ کیا ہو۔

ملک اختر نے اپنے جسم کو اذیتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کے سامنے تمام حقائق کا اعتراف کر لیا۔

اس کی زبان جب کھلی تو انکشافات کے دریا بہاتی چلی گئی۔

ایسے ایسے بھیانک انکشافات جنہوں نے اُس کا بیان قلمبند کرنے والی خصوصی کمیٹی کو بھی لرزا کر رکھ دیا۔

اس کمیٹی میں ملک کی قریباً سب ہی اہم ایجنسیوں کے نمائندے موجود تھے۔ یہ ''افسرِ اعلیٰ'' کا کمال فن تھا کہ انہوں نے ابھی تک ملک اختر پر تھرڈ ڈگری طریقے استعمال نہیں کیے تھے اور اس کی زبان کھول لی تھی۔

اُن کی درخواست پر ہی جی ایچ کیو نے ایک خصوصی ٹیم ملک اختر کا بیان قلمبند کرنے کے لئے تشکیل دی تھی۔

اس ٹیم کے اراکین جب ملک اختر کا بیان ریکارڈ کر رہے تھے تو ان میں سے ہر کسی کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اُٹھے اور اس موذی کا گلا گھونٹ دے۔ جس نے محض اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مادرِ وطن کو درندوں کے سامنے گروی رکھ دیا تھا۔

یہ شخص اُن کے نزدیک واجب القتل تھا جس نے ملک دشمن دہشت گردوں کو ایسی محفوظ آڑ بہم پہنچائی تھی جس کے پس پردہ وہ آسانی سے اپنے شیطانی عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے تھے۔

ملک اختر کا طویل بیان جو سلائیڈ کے فیتوں پر محفوظ ہوا تھا اب کاغذات پر منتقل کیا جا رہا تھا تاکہ اس کے سیاہ کارناموں کی فائل ارباب بست و کشاد کی خدمت میں پہنچا کر اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ ان وحشیوں کے خلاف کارروائی کی اجازت دے دیں۔

●

میناکشی کے سامنے وہ ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا جس پر ملک اختر کی آواز میں ریکارڈ ٹیپ چل رہی تھی اور اُس نے میناکشی کے ساتھ اپنا سیاہ کاریوں کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا۔

''بکواس کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے یہ۔''

اُس نے چلاتے ہوئے کہا اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

''دیکھو میناکشی..... اچھے یا برے بہرحال ہم نے کچھ دن اکٹھے گزارے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم اپنے وطن سے وفادار تھیں اور میں اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ اب تک اگر تم پر تھرڈ ڈگری طریقے استعمال نہیں کیے گئے تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ میں نے ان لوگوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ تم میری بات مان لو گی..... لیکن کب تک؟ آخر تمہیں زبان کھولنا ہوگی..... میرے سامنے نہیں تو اُن کے سامنے۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ تمہارا واسطہ اس ملک میں ابھی تک ملک اختر اور تنظیم کے غداروں سے رہا ہے۔ ابھی اس زمین کی کوکھ ایسی بانجھ بھی نہیں ہوئی کہ یہاں کی مائیں وطن کی آن پر مرمٹنے والوں کو جنم دینا ہی چھوڑ گئی ہوں..... یہ لوگ عورت کا بہت احترام کرتے ہیں، لیکن عورت کا۔ تم ان کے نزدیک ہرگز عورت نہیں ہو۔ تم جانتی ہو تم کیا ہو؟ میں جا رہی ہوں۔ اب یہ لوگ تم سے خود سچ اگلوا لیں گے..... تمہیں بتانا تو ہوگا ہی..... سب کچھ بتانا ہوگا۔ ایک ایک تفصیل بیان کرنی ہوگی۔ تمہارے منہ میں تو زبان لگی ہے یہاں تو گونگے بول پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کو تو دیواروں سے کہلوا لینے کا فن آتا ہے۔ اگر تمہارے دماغ میں ابھی تک یہ فتور سمایا ہوا ہے کہ تم انہیں بیوقوف بنا لوگی تو میں سمجھوں گی کہ ''را'' کے لوگ بہت

احمق ہیں جنہوں نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔ انہیں سب کچھ بتا دو۔ یہی صورت ہے تمہارے وجود کی سلامتی کی۔ تمہیں سزائے موت نہیں ہوگی۔ ممکن ہے کسی سطح پر کوئی سودے بازی دونوں ملکوں کے درمیان ہو جائے اور تم کسی کے تبادلے میں رہا ہو کر اپنے ملک چلی جاؤ..... لیکن اپاہج زندگی جینے کا کیا فائدہ۔"

انسپکٹر آصفہ نے میناکشی سے کہا۔

آصفہ کو پہلے ہی روز سے اس کی تفتیش پر مامور کر دیا گیا تھا۔

لیکن.....!

ان لوگوں کے اندازوں کے برعکس میناکشی نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی شناخت تک بتانے سے انکار کر دیا۔

یہ افسر اعلیٰ کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بھارتی انٹیلی جنس کی جو فاحشائیں یہاں بھیجی جاتی تھیں انہیں ذہنی ہی نہیں جسمانی مشقت کے بھی صبر آزما لمحات سے گزارنے اور مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد ہی اپنے مشن پر روانہ کیا جاتا تھا۔

میناکشی نے پانچویں ہی روز ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ اس کا واسطہ بھی اپنے سے بہت زیادہ مضبوط لوگوں سے تھا۔

جب اُس کی زبان کھلی تو حیرت انگیز اور لرزا دینے والے ایسے ایسے انکشافات کے دریا اس نے بہائے کہ سننے والوں کو ششدر کر کے رکھ دیا۔

اس نے بہت سے ایسے رازوں کا انکشاف بھی کیا جن کے متعلق عارف کو گمان ہی نہیں گزر سکتا تھا۔ آج اعلیٰ قیادت کے علم میں بالآخر یہ بات آ گئی تھی کہ جس بابا کی چوکھٹ پر سر جھکا کر وہ اقتدار کی بھیک مانگا کرتے تھے وہ ملک دشمن، غدار اور درندہ تھا۔

اس نے مادرِ وطن کا سودا بہت سستے داموں اغیار کے ساتھ کیا تھا اور خود ایک الگ مملکت بنا کر اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

●

کورٹ ہیڈ کوارٹرز میں یہ ہنگامی اجلاس جو صبح شروع ہوا تھا رات گئے تک جاری رہا۔ "افسرِ اعلیٰ" نے مجرموں کے ایک ایک گناہ کو بے نقاب کیا۔ ایسے ایسے ثبوت فراہم کئے کہ جن کے بعد اُن کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"جنابِ والا! آج ہم لوگ جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں تو اسے معمولی کارروائی نہ سمجھا جائے۔ مجھے آخر میں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ مجرم آپ کے سامنے ہے۔ اس کے گناہ ایسے نہیں کہ اُس پر ایک لمحے کے لئے بھی رحم کیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں کچھ چہروں پر شکنیں نمودار ہوئی ہیں۔ افسوس میرا تعلق اربابِ سیاست سے نہیں میں صرف اس ملک کا ادنیٰ سا غلام ہوں جسے حکومت ملکی سالمیت کو برقرار رکھنے کی تنخواہ دیتی ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آج بھی اگر ہم نے مصلحتوں سے دامن نہ چھڑایا اور منافقت کا شکار رہے تو خدا کا ایسا عذاب ہم پر نازل ہوگا کہ پھر نہ کوئی بستی بچے گی اور نہ اس کا مکین۔ نہ ایوانِ اقتدار رہیں گے نہ ہی اس کے مسند نشین۔ اس سے پہلے کہ قدرت کا اپنا نظام روبہ عمل ہو میری درخواست ہے کہ تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر فوراً مجرموں کی گرفتاری کا حکم دیا جائے

اور انہیں قرار واقعی سزا بھی دی جائے۔"

وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"لونڈا ہے..... سالا..... ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے۔ کل کے بچے اب ہمیں حکومت کرنے کے طریقے سکھائیں گے۔"

وزیر اعلیٰ نے اپنے پہلو سے چمٹے پولیس کے اعلیٰ افسر سے کہا جس نے طنزیہ مسکراہٹ بہت پہلے سے چہرے پر سجا رکھی تھی۔

یہاں موجود بہت سے لوگ اس درمیان پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔ انہیں شاید ایک سرکاری افسر کا یہ انداز گفتگو بہت پسند نہیں آیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ غداروں کے لئے بھی سرکاری القابات استعمال کیے جائیں اور انہیں دورانِ گفتگو بھی وہی عزت دی جائے جو انہیں سرکار دربار میں بعض مصلحتوں کے تحت حاصل تھی۔

ایک کور کمانڈر کی ہستی ایسی ضرور تھی جس نے اس درد کو اپنا درد جانا تھا اس کے بھی بعینہٖ جذبات تھے جو "افسر اعلیٰ" کے تھے۔

"کوئی غدار بچ نہیں پائے گا میرے نوجوان دوست۔"

انہوں نے اپنی گھنی مونچھوں والے بارعب چہرے کے ساتھ باری باری اہل محفل پر نظر ڈالی۔

"میرے خیال سے اب کوئی گنجائش باقی نہیں بچی۔ مجھے اُمید ہے وزیر اعلیٰ صاحب ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔"

کور کمانڈر کی آواز کیا تھی گویا پگھلتا ہوا سیسہ تھا جو وزیر اعلیٰ کے کانوں میں کسی نے انڈیل دیا تھا۔

"ٹھیک ہے جنرل صاحب..... ٹھیک ہے لیکن میں یہی کہوں گا کہ عجلت سے کام نہ لیجئے۔ میں مرکز میں بات کرتا ہوں کوئی فیصلہ اگر ہوگا تو اعلیٰ قیادت کے مشورے سے ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ اکیلا میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی فیصلہ کر سکوں۔"

اُس نے منافقت بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بچھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں کل تک حکومت کی مرضی سے آگاہ کر دیجئے۔ میں اس سلسلے میں 48 گھنٹے سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔"

کور کمانڈر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

یہ اجلاس برخاست کرنے کا اشارہ بھی تھا۔

●

بابا صاحب کو وزیر اعلیٰ کا ہنگامی پیغام اس میٹنگ کے خاتمے کے بمشکل چند منٹ بعد ہی مل گیا تھا۔

"بابا صاحب فی الوقت آپ نکل جائیے۔ معاملات ہمارے قابو میں نہیں رہے۔ میں نے بمشکل 48 گھنٹے کی مہلت لی ہے اس درمیان بندوبست مکمل ہے۔ آپ

کوفی الوقت منظر سے ہٹنا ہوگا۔ ورنہ کچھ بھی ممکن ہے۔"

باباصاحب کو اس بات کا علم تو تھا کہ کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔

لیکن.....!

اس طرح اچانک پانسہ ہی پلٹ جائے گا اس کا اندازہ وہ نہ کر سکے۔ اُن کی ہٹ دھرمی اور انا اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اس طرح دُم دبا کر بھاگ جائیں۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ اچانک مختلف دفاتر سے گرفتاریوں کے فون آنے لگے۔

فوج نے اُن کے خلاف آپریشن شروع کر دیا تھا۔

"باباصاحب آپ تیاری کیجئے۔ انتظامات مکمل ہیں۔ ایک گھنٹہ بعد کی فلائٹ سے آپ عمرہ کرنے جدہ جا رہے ہیں جہاں سے پھر یورپ کی طرف نکل جایئے گا۔"

رخسانہ نے اچانک ہی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔"

باباصاحب کی زبان نے بمشکل دو لفظ ادا کئے۔

چند منٹ بعد ہی باباصاحب اپنی خصوصی محافظ دستے کے ساتھ ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ "مرکز" والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے اور فوراً ان کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ دو ڈاکٹر بھی اُن کے ساتھ جا رہے تھے۔ باباصاحب کی شدید خواہش پر انہیں پہلے عمرہ ادا کرنے کے لئے جدہ لے جایا جا رہا تھا۔

عارف اُس محافظ دستے کی کمان کر رہا تھا۔ جس نے باباصاحب کو جدہ پہنچانا تھا جس کے بعد رخسانہ اور ڈاکٹروں کے روپ میں دو دہشت گردوں نے اُن کے ساتھ یہاں سے فرار ہونا تھا۔

شیر گل خان کو عارف نے جان پر کھیل کر فون کیا تھا۔

"خان بھائی..... بھاگ رہا ہے۔ جانے نہ دینا۔ فوراً ایئرپورٹ پہنچو۔ فوراً۔"

شیر گل خان کا خون کھول رہا تھا۔

"بھاگ رہا ہے۔" وطن فروش، بے گناہوں کا قاتل، خونی درندہ، مادرِ وطن کو دشمن کے ہاتھ گروی رکھ کر بھاگ رہا تھا اور یہ سیاست دان، حکمران، آج بھی اُسے اِس اُمید پر بھگا رہے تھے کہ کبھی یہ ترپ کا پتہ پھر چل جائے گا۔ "نہیں باباصاحب..... نہیں۔"

اس نے دیوانہ وار اپنی جیپ کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں زندہ بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ وحشی، درندے، دہشت گرد۔''

شیر گل خان پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

ایئرپورٹ پہنچنے تک وہ دو معمولی ایکسیڈنٹ بھی کر چکا تھا اور جس انداز سے ڈرائیونگ کرتا یہاں تک آیا تھا اس کے بعد اس کا زندہ بچ جانا ہی معجزے سے کم نہیں تھا۔

جزا و سزا کا اختیار اُسے نہیں تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھا۔ اس کا کام گناہگار کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا تھا۔

لیکن.....!

اُس نے نوکری کے آغاز پر ریاست سے وفاداری کا جو حلف اُٹھایا تھا اس میں یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ وہ کسی وطن فروش کو محض اس لئے بھاگ جانے کا موقعہ دے دے کہ اس میں کچھ سیاسی مصلحتیں کارفرما تھیں۔

اس نے ریاست سے وفاداری کا عہد کیا تھا حکمرانوں سے نہیں۔

اور آج وہ یہی عہد نبھانے جا رہا تھا۔

اس نے جیپ پارکنگ میں کھڑی کی اور اس طرف دوڑتا چلا گیا۔ جدھر سے بابا صاحب نے لاؤنج میں جانا تھا۔

اچانک ہی جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

سامنے کی سیڑھیوں سے بابا صاحب کا خون آلود جسم لڑھکنیاں کھاتا نیچے آ رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں عارف چوہدری سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

عارف کے ہاتھوں میں پکڑی آٹومیٹک گن سے گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ اس نے شاید زندگی کے مضبوط ترین لمحات میں یہ عظیم ترین فیصلہ کیا تھا۔ ابھی تک اُسے یہاں قانون کا ایسا کوئی محافظ دکھائی نہیں دیا تھا جو بابا صاحب کو روکنے کی ہمت کرتا۔

وہ وی آئی پی لاؤنج سے سیدھے جہاز میں سوار ہو جاتے اور عارف نہیں چاہتا تھا کہ یہ بھیڑیا بچ کر جانے پائے۔

''بابا صاحب..... ابھی اس زمین کی کوکھ بانجھ نہیں ہوئی۔ ماؤں نے ابھی وطن دوستوں کو جنم دینا بند نہیں کیا۔ تم اس زمین کے غدار تھے۔ تمہارا حساب یہیں ہونا تھا..... ہو گیا..... ہو گیا۔''

اُس نے مُردہ بابا صاحب کے جسم کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی عارف کو اپنے پہلو میں انگارے اُترنے کا جان لیوا احساس ہوا۔ حفاظتی دستے میں بابا صاحب کے کسی جانثار نے حساب برابر کر دیا تھا۔

اس نے بمشکل گردن گھمائی۔

سامنے شیر گل بھاگتا آ رہا تھا۔

مینارِ پاکستان کی طرح عارف چوہدری اپنے قدموں پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دوست کے استقبال میں دونوں بازو پھیلا دیے۔

''خان بھائی..... میں نے مار دیا۔ میں نے اس کتے کو جہنم رسید کر دیا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ خدا میرے وطن کی حفاظت کرے۔''

اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''تو بازی لے گیا..... مجھ سے بازی لے گیا..... عارف..... عارف۔''

شیر گل خان نے اس کے مردہ جسم کو اپنے سینے پر تھام رکھا تھا۔ مینارِ پاکستان اپنی پوری عظمت اور جاہ و جلال کے ساتھ اس کے کلیجے سے چمٹ گیا تھا۔

''ہٹ جاؤ..... پرے ہٹ جاؤ..... بُزدلو..... بے غیرتو..... دفع ہو جاؤ۔ خبردار تم اس قابل نہیں ہو کہ مادرِ وطن کے اس شیر کے چہرے کی زیارت کر سکو۔''

اس نے عارف کا لاشہ ابھی تک کلیجے سے لگا رکھا تھا۔

اِک عالمِ وحشت تھا..... جس نے اس کے بدن میں بجلیاں بھر دی تھیں وہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہا تھا۔

اس طرح عارف میاں کا لاشہ اپنے کلیجے سے لگائے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑے کھڑے اپنا پستول ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

مختلف ایجنسیوں کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کرنے والے کو قابو کر لیا تھا۔ بابا صاحب کے ساتھ جانے والوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ بابا صاحب کے چہرے پر لعنت برسنے لگی تھی۔

کوئی اس کی طرف ایک نظر سے زیادہ نہیں دیکھ رہا تھا۔

یہ مقامِ عبرت تھا۔

کل تک اس شہر کے بلاشرکتِ غیرے حاکم کی لاش بے یار و مددگار پڑی تھی۔

''بیٹا یہ مر چکا ہے..... بس اس کا کام ختم ہوا۔ اسے آرام کرنے دو۔ دیر نہ کرو۔ آسمانوں پر اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ عارف اب یہاں نہیں ہے۔ اللہ نے اُن سے جو کام لینا تھا لے لیا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کے کاموں میں مداخلت کرنے والے۔ یہ بدن اب زمین کی امانت ہے۔ آؤ اسے زمین کو واپس لوٹا دیں۔''

شیر گل کو اپنے کندھے پر مہربان ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

یہ اس کے انچارج آفیسر تھے جن کے نورانی چہرے کو وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے شیر گل کے ہاتھ سے پستول پکڑ کر اس کے ہولسٹر میں واپس ڈال دیا اور

اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے عارف چوہدری کا لاشہ بڑے احترام سے اس سٹریچر پر بچھا دیا جو یہاں تک لایا گیا تھا۔

شیر گل کا سارا بدن لرز رہا تھا۔

اس کے کپڑے عارف کے خون سے رنگین ہو رہے تھے۔

وہ دونوں پاؤں پر عارف کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ہلالِ احمر والوں نے ایک چادر اس کے جسم پر ڈال دی تھی۔

اچانک جیسے شیر گل کا کلیجہ پھٹ گیا۔

اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا تھا۔ پھر اس نے اپنی حالت پر بہادروں کی طرح قابو پا لیا۔

ہلالِ احمر والے اب لاش ایمبولینس میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے عارف کے چہرے پر پڑی چادر سرکا دی۔ نور کا ایک ہالہ اس کے چہرے کے گرد تن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں ایسا پرسکون چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

جھک کر شیر گل خان نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کھڑے ہو کر اس کو سلیوٹ کیا۔

اس کے تعاقب میں کھٹاک کھٹاک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہاں موجود ہر شخص اس کی تقلید میں عارف کی عظمت کو سلیوٹ مار رہا تھا۔

ہلالِ احمر کے رضا کار عارف کا جوان لاشہ اُٹھائے ٹرمینل سے باہر جا رہے تھے۔

یہاں موجود لوگ دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہو کر جیسے اُسے گارڈ آف آنر پیش کر رہے تھے۔

لاش ایمبولینس میں رکھ دی گئی..... سائرن بجے اور عارف اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف چل دیا۔ اس کی ایمبولینس کے تعاقب میں سرکاری ایجنسیوں کی گاڑیاں جلوس کی صورت میں جا رہی تھیں۔ بالکل یوں جیسے حاکم شہر کو تکریم دی جاتی ہے۔

وہی تو تھا۔

حاکم شہر.....!!

شہر نگاراں کی آن، پہچان۔

وہی تو تھا.....!!

●●●